آبابیل کی ہجرت

(افسانوں کا مجموعہ)

ڈاکٹر شاہد جمیل

● ''عورت کا اپنا گھر نہیں ہوتا، میکہ اور سسرال ہوتا ہے یا پھر بیٹے اور داماد کا گھر۔ اُس کی ذاتی زندگی بھی نہیں ہوتی ۔ وہ فقط شریکِ خاندان، شریکِ حیات اور شریکِ کار ہوتی ہے۔ روزی کما کر اور نام پیدا کر کے بھی وہ اپنی شناخت نہیں بنا پاتی ۔ وہ حوالوں سے پہچانی جاتی ہے۔ اُس کی حیثیت اضافی اور الحاقی ہے، پتنگ میں لگی پونچھ کی طرح ۔ سیتا جی نے بن باس میں شری رام کا ساتھ دیا اور کشٹ سہا تھا۔ پھر بھی اُنھیں ہی اَگنی پریکچھا دینی پڑی۔ لوک لاج سے مردوں کا واسطہ نہیں۔ مریاداؤں کا پالن عورتوں کو کرنا ہے۔ یہ کیسا سماجی انصاف ہے؟ خدایا! میعاد پوری نہیں ہوئی گندم خوری کی سزا کی؟''

جالے میں پھنسی مکڑی

● ''سفید حویلی دور سے نظر آتی ہے۔ دن میں لگتا کہ حسین دوشیزہ پائینچا پکڑے باغ میں کھڑی ہے۔ چاندنی رات میں گمان گزرتا کہ وہ شانے پر زلفیں بکھرائے دلکش مناظر سے لطف اندوز ہو رہی ہے۔ موسلا دھار بارش میں وہ باغ میں نہاتی نوخیز دوشیزہ لگتی اور ہلکے کُہرے میں وہ پرستان کا نظارہ پیش کرتی۔''

محبت کا صلہ

● ''جو عورت مرد کی کمزوری بن جاتی ہے، اُس کا خصم، اُس کے بغیر جل بن مچھلی کی طرح تڑپتا ہے۔ تڑپ اور کشش بنائے رکھنا، اُڑتی پتنگ کو قابو میں رکھ کر اُڑانے جیسا کٹھن ہے...... میٹھے بول، سُمر پن، وفاداری اور من پسند پکوان، مکڑی کے جالے جیسے کارگر ہتھیار ہیں۔ سدھایا خصم اَسیر جن سا حکم مانتا ہے اور جاب لگے بیل کی طرح ادھر اُدھر منہ نہیں مارتا۔''

داغ

اَبابیل کی ہجرت

(افسانوں کا مجموعہ)

ڈاکٹر شاہد جمیل

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

اس کتاب کی اشاعت میں بہار اُردو اکادمی، پٹنہ کا جزوی مالی تعاون شامل ہے۔
کسی بھی قابلِ اعتراض مواد کی اشاعت کے لئے افسانہ نگار خود ذمہ دار ہے۔

ABABEEL KI HIJRAT

(COLLECTION OF SHORT STORIES)

by: DR. SHAHID JAMIL

Mob. No. 9430559161 WhatsApp / 8825296137 JIO

Email. drshahidjamilpatna@gmail.com

Publisher : Dr. Shahid Jamil

Year of First Edition 2018

ISBN 978-93-88356-62-6

₹ 250/-

- کتاب کا نام : ابابیل کی ہجرت (افسانوں کا مجموعہ)
- افسانہ نگار اور ناشر : ڈاکٹر شاہد جمیل

Mob.No. 9430559161 WhatsApp

- سنہ اشاعت : ۲۰۱۸ء (پہلی اشاعت)
- صفحات : ۲۰۸
- قیمت : ۲۵۰ روپے
- پیشکش : ڈاکٹر زاہد انور
- مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶
- کور ڈیزائنر : جناب شرف عالم، دہلی، 9968552068 Whats App
- ملنے کا پتہ اور رابطہ : بک ایمپوریم، سبزی باغ۔ پٹنہ۔۴

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3191, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)

Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540

E-mail: info@ephbooks.com, ephindia@gmail.com

website: www.ephbooks.com

انتساب

اللہ، رب العالمین کے نام

جس نے **محمد**ﷺ کو رحمت العالمین بنا کر ہماری راہنمائی کے لئے بھیجا۔

امّی، اختری خانم کے نام

جن کی تربیت کا ثمرہ، صالح اولاد ہیں۔

ابّا، محمد سلیم (مرحوم) کے نام

جن کی عملی زندگی مثالی تھی۔

پھوپھی، سائرہ خانم (مرحومہ) کے نام

جن کی محبت اور دعائیں تاحیات ملتی رہیں۔

اہلیہ، نازنین شاہد کے نام

جس نے زندگی کو ہر رنگ میں جینے کے لئے اُکسایا۔

بیٹی، صدف جمیل، فلک خان اور الماس جمیل کے نام

جو مسلسل قابلِ فخر تعلیمی نتیجے کی سوغات دیتی رہی ہیں۔

حقیقی کرداروں، کے نام

جن کے سبب افسانے حقیقت سے قریب تر ہو گئے۔

اور

قارئین کرام کے نام

جو تخلیق پڑھتے اور معائب ومحاسن سے آگاہ بھی کرتے ہیں۔

مختصر تعارف

- پورانام : محمد شاہد جمیل خاں
- ادبی نام : ڈاکٹر شاہد جمیل
- والد کا نام : محمد سلیم (مرحوم)
- والدہ کا نام : اختری خانم
- تاریخ پیدائش : اٹھائس فروری ۱۹۵۸ء
- تعلیم : ایم اے، اُردو (پی یو)، پی ایچ ڈی (اُردو ناول ۱۹۶۰ء کے بعد)
- ملازمت : سبکدوش آفیسر (محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ)
- مستقل پتہ : 'خان وِلا'، محمد پور بزرگ (مرچا)، نزد پرائمری اسکول، پوسٹ وتھانہ۔ سرائے، ضلع۔ ویشالی (حاجی پور) پن۔ ۸۴۴۱۲۵

Mob. No. 9430559161 WhatsApp/ 8825296137 JIO
Email. drshahidjamilpatna@gmail.com

- عارضی پتہ : رحمٰن ہاؤس، گراؤنڈ فلور، ہاؤس نمبر۔ ۲۷۸، روڈ نمبر ۱۱ ارڈی، پاٹلی پتر کالونی، پٹنہ، (بہار) پن نمبر۔ ۸۰۰۰۱۳
- مطبوعہ کتب : • اُمراؤ جان ادا : ایک خصوصی مطالعہ • 'گناہ گاروں کے درمیان'، مِردُلا بہاری کے افسانوں کے مجموعے کا اُردو ترجمہ • 'بنکر کی بیٹی'، ممتا مہروترا کے افسانوں کے مجموعے کا اُردو ترجمہ • 'شگرف نامہ ولایت'، منشی اعتصام الدین کے سفرنامے کا ہندی ترجمہ • 'پیر علی'، شاؔد عظیم آبادی کے ناول کا ہندی ترجمہ • صابر آروی اور • خالد رحیم کے منتخب شعری کلام کا ہندی رسم الخط میں ترتیب و پیشکش • مِردلا بہاری کے ناول 'اَن کہی' کا اُردو ترجمہ (زیرِ اشاعت) اِن کے علاوہ کوئی اور قابلِ ذکر نہیں ہے۔
- اعزاز وانعام : بہار اُردو اکادمی، پٹنہ کے انعام واعزاز کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر نہیں۔
- اصناف تحریر : تنقید، تبصرہ، افسانہ، ترجمہ اور صحافت (سابق مدیر، سہ ماہی رسالہ 'بھاشا سنگم'، حکومت بہار اور نائب مدیر، سہ ماہی ہندی رسالہ 'وِچار درشٹی'، دہلی کے علاوہ کئی ہندی رسائل کی ادارت سے منسلک)
- شوق : انسانی خدمات کے ساتھ ساتھ اُردو اور ہندی ادب کی خدمت۔

فہرست

اقتباسات

● ''اُس نے دوستانہ لہجے میں کہا تھا،''یقیناً تم نے کوئی حسین خواب دیکھا ہوگا۔ کسی کو چاہا یا پھر کسی نے تمھیں اپنے دل کی ملکہ بنایا ہوگا۔ کسی کو چاہنا یا کسی کا منظورِ نظر ہونا اپنے بس میں نہیں۔ تم بھی بے کھٹک اپنے دل کی بات سا جھا کر سکتی ہو۔''

اُس کی نگاہیں چاند پر مرکوز تھیں۔ اُس نے قدرے توقف کے بعد کہا تھا،''بیشتر دوشیزاؤں کے دل میں خوابوں کا شہزادہ ہوتا ہے، لیکن......''

''لیکن کیا؟''اُس کی آواز جاں بلب مریض کی کراہ جیسی تھی۔

''لیکن سب خوش نصیب نہیں ہوتیں۔''اُس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

پھر وہ قدرے توقف کے بعد بے باک لہجے میں بولی تھی،''آپ مجھے بالکل بھی پسند نہیں تھے......لیکن......''

''جانِ من! لیکن کیا؟''اُس کا تجسس بجھتے چراغ کی طرح بھبھک اُٹھا تھا۔

''لیکن اب آپ اچھے لگنے لگے ہیں۔''اُس نے مُسکرا کر کہا تھا۔

اعتماد کی جلتی چتا کی بو اُس کے نتھنوں میں سما گئی تھی۔

اُس نے بیٹھ کر جوڑا بنایا۔ پھر اُس کے اُداس چہرے پر وہ ایک نظر ڈالتے ہوئے بولی تھی،''ایسا ہوتا ہے۔ شادی کے بعد میاں بیوی کی ضرورتیں قُربت پیدا کر دیتی ہیں۔ لیکن قُربت اور محبت میں بڑا فرق ہوتا ہے، اُبلے انڈے کے چھلکے اور جھلّی سی۔'' مُہاجر

● ایک دن دوپہر میں کھا پی کر دونوں بہنیں لیٹی تھیں۔ صوفیہ بیگم کروٹ لے کر بولیں،''رضو! اللہ نے سوگ منانے کی مدّت تین دن اور بیوی کے لئے چار ماہ دس دن مقرر کی ہے۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ عورت تا عمر تنہا کبوتری سی ملول رہتی ہوگی۔''

''ہاں باجی! یہ سچ ہے۔ اللہ بڑھاپے میں ایک سے دوسرے کو جدا نہ کرے۔ مجھے تو ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی ہے کہ اگر میں مرگئی، تب اِن کی تابعداری کون کرے گا؟ میں ہوں کہ پکے کھانے سے کاڑھ کر اِنھیں وقت پر کھلا پلا دیتی ہوں۔ اُترن پُترن دھوتی اور بی پی، شوگر کی دوا کھانے کے لئے سر پر سوار رہتی ہوں۔ چائے پانی کی فرمائش پوری کرتی اور کبھی کبھار کوئی اِن سے ملنے جلنے چلا آتا ہے، تب کسی طرح گھر کی عزّت بھی بچا لیتی ہوں۔''

پھر وہ قدرے توقف کے بعد اَفسردہ لہجے میں بولیں،''بیٹے۔ بہو اور پوتی پوتے کا زیادہ تر وقت موبائل پر چونچ مارتے کٹتا ہے...... باجی! اس موبائل نے تو رشتے کو کمرے کی دیوار و در سا بنا دیا ہے۔ رہیں ساتھ ساتھ اور الگ الگ بھی......''

صوفیہ بیگم قطع کلام کرتے ہوئے بولیں،''رضو! مرد سوئی سا اور عورت دھاگے سی ہوتی ہے، جو کنبے کو جوڑتی رہتی ہے۔ لیکن ایک کے بغیر دوسرا از خود ناکارہ ہو جاتا ہے۔ ایک بات اور ہے، بڑھاپے میں میاں بیوی کی محبت، تپ تپا کر کندن سا ہو جاتی ہے۔'' تھو،تھو

پیشکش : ڈاکٹر زاہد انور

من آنم کہ من دانم

میری پہلی تنقیدی و تحقیقی کتاب 'اُمراؤ جان ادا : ایک خصوصی مطالعہ' ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اِس کتاب میں پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر لطف الرحمن اور پروفیسر ظفر اوگانوی کے آرا شامل ہیں۔ ادبی حلقوں میں اِس کی خوب پذیرائی ہوئی، اہم و معتبر ادبی رسائل میں مثبت و حوصلہ افزا تبصرے شائع ہوئے، لیکن آج تک میں اپنے حصّے کی تعریف و توصیف نہیں لے سکا ہوں کہ مجھے یہ معلوم نہیں، اُن میں میرا حصّہ کتنا ہے؟

مبتدی تھا، احباب کے مشورے کو نافع سمجھ لیا تھا۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ سیّد ظفر ہاشمی، تنویر اختر رومانی، محمد سلیمان، مشتاق احمد نوری، شموئل احمد، عبدالصمد، رؤف خیر، بانو سرتاج، محمد بشیر مالیر کوٹلوی اور عابد نقوی وغیرہ جیسے مخلص ہم عصروں کے علاوہ سنجیدہ اور صاحب نظر قارئین بھی بہترین دوست، مشیر اور ناقد ہوتے ہیں۔ مشاہدوں اور تجربوں سے میری آنکھیں کھل گئیں کہ مشاہیرِ ادب کے آرا اور اُن کی عنایاتِ خصوصی سے شہرت کے ساتھ انعام و اعزاز بھی مل سکتا ہے، لیکن وقت، تھرڈ امپائر کی طرح مطمئن ہوکر ہی فیصلے لیتا اور تاریخ رقم کرتا ہے۔ اُس کی فہرست میں صرف جنوین فن کاروں کے ہی نام ہوتے ہیں۔

جب جاگا، تب سویرا۔ درمیانی وقفے میں شائع کتب میں مشاہیرِ ادب کے آرا شامل نہیں ہیں اور اِس مجموعے کی پشت اور فلیپ کو افسانوں کے اقتباسات سے پُر کیا گیا ہے۔

مشاہدات و تجربات نے جب ذہن و دل کو اُکسایا، تب میں نے اپنے خیالات، جذبات و احساسات اور انسانی نفسیات، معاشرے کی عکاسی اور متغیر وقت و انحطاط پذیر اقدار کے اظہار کے وسیلے کے لئے فکشن کا انتخاب کیا۔

مقیمِ دل مینا اکثر مجھ سے باتیں کرتی، اُونچ نیچ اور اہم نکات سمجھاتی رہتی ہے۔ ایک دن میں اپنے پہلے افسانے 'جالے میں پھنسی مکڑی' کو شائع کرانے کے منصوبے بنا رہا تھا،

تب وہ بولی تھی، ''مرغی کو بھی انڈے دینے میں وقت لگتا اور اُسے مشقت اُٹھانی پڑتی ہے۔ ریچھنی اپنے نوزائیدہ بچے کو چاٹ چاٹ کر ستھرا کرتی ہے۔ سنگ تراش کو پتھر سے صنم نکالنے میں لوہے کا چنا چبانا پڑتا ہے۔ لیکن تم اپنی ناپختہ تخلیق کو بھی شائع کرانے کے لئے اتاولے ہو گئے۔ تحریر اور تخلیق میں کاغذی بادام کے چھلکے اور اُس کے مغز سا فرق ہوتا ہے۔ فنی ریاضت سے تحریر، تخلیق بنتی ہے اور اعلیٰ ترین فنی نمونہ، لازوال تخلیق......''

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ میں نے چپّی سادھ لی تھی، تب وہ ہنس کر بولی تھی، ''پہلی تخلیق ہو یا کتاب، اُس کی اشاعت، پہلی اولاد کی ولادت سی ہوتی ہے۔ بہترین تخلیق ہو، تب بدخواہ بھی پیٹھ پیچھے تعریف کرتے ہیں۔ اشاعت میں عجلت اچھی بات نہیں۔ سنو! افسانہ مکمل کرنے کے بعد تم اُسے ایک سنجیدہ قاری اور ایماندار ناقد کی طرح وقفے دے کر کئی بار پڑھا کرو اور قاری کی چاہتوں کو پوری اور ناقد کے اعتراضات کو رفع کرتے جاؤ۔ جب قاری کو افسانہ پڑھتے وقت سب کچھ ہوتا ہوا سا دِکھائی دینے لگے، کردار شناسا، اُن کی گفتگو فطری لگے، زبان و بیان جھیل سی رواں لگے، اُسلوب کی دلکشی اور منتہا تک پہنچنے کی للک قائم رہے اور ناقد فرطِ انبساط میں شاباشی کے لئے مجبور ہو جائے، تب ہی تم اُس افسانے کو کسی اہم و معتبر ادبی رسالے کو برائے اشاعت بھیجنا۔ میری باتوں کو گرہ باندھ لو۔''

مجھے متاثر اور نادم دیکھ کر وہ استاد کی طرح خوش ہو کر بولی تھی، ''صرف مطالعہ کافی نہیں، مشاہدات و تجربات افسانے کو حقیقت سے قریب تر کر دیتے اور ذخیرۂ الفاظ جذبات و احساسات کے اظہار میں مُمِدّ و معاون ہوتے ہیں۔ فکشن نگار معاشرے کا نبّاض ہوتا ہے اور اُس کی تخلیق زندگی کا آئینہ دار۔ وہ ایماندار مورّخ بھی ہوتا ہے۔ بڑا فکشن نگار فنی تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے رسم و رواج، اقدار، رہن سہن اور بول چال وغیرہ کو بھی قصے کا جز بنا لیتا ہے۔ اُس کا اُسلوب منفرد و دلکش اور زبان و بیان شُستہ و رواں ہوتا ہے۔ اُس کا مخصوص قاری اور مخصوص رسالہ ہوتا ہے۔ وہ وضع کردہ معیار و اعتبار کو قائم رکھتا ہے۔''

مجھے مشورہ معقول لگا۔ میں نے 'جالے میں پھنسی مکڑی' پر یہ تجربہ کیا۔ مطمئن ہو کر اِسے ۱۹/جولائی ۲۰۰۶ء کو برائے اشاعت منتخب رسالے (ماہنامہ 'آجکل'، 'ایوانِ اُردو'، سہ ماہی 'ذہن جدید'، دہلی اور شش ماہی 'شعر و حکمت' حیدر آباد) کو میل کر دیا۔ پہلی خبر محمد سلیمان صاحب نے مجھے دی کہ 'ایوانِ اُردو' کے اگست ۲۰۰۶ء کے شمارے میں افسانہ

شائع ہوگیا ہے۔ مدیر 'آجکل' نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا تھا، ''شاہد بھائی! میں نے اِسے اگلے شمارے کے لئے منتخب کرلیا تھا، لیکن 'ایوانِ اُردو' والوں نے اِسے شائع کردیا۔ آپ دوسرا افسانہ بھیجئے۔'' پھر عبدالصمد صاحب نے خدا بخش لائبریری کے ایک پروگرام میں کہا تھا، ''دسمبر ۲۰۰۶ء کے 'شعروحکمت' میں بھی تمہارا افسانہ شائع ہوا ہے۔ کل آؤ، میں وہ رسالہ تحفتاً دوں گا۔'' میں نے سب سے پہلے اللہ کا، پھر دل کی مینا کا شکریہ ادا کیا تھا۔ امّی نے مجھے خوب دعائیں دی تھیں۔ مدیر 'گلبن'، لکھنؤ، سیّد ظفر ہاشمی صاحب نے دورانِ گفتگو مجھ سے رسالے کے لئے افسانہ طلب کیا، تب میں نے کہا تھا، ''غیر مطبوعہ افسانہ نہیں ہے۔ میں پہلا افسانہ برائے مطالعہ ارسال کردوں گا۔'' افسانے کی تعریفیں کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا تھا، ''میں اِسے شائع کررہا ہوں۔'' 'گلبن' کے نومبر۔ دسمبر ۲۰۱۶ء کے شمارے میں یہ تیسری بار شائع ہوا۔ اِس افسانے کی ترجیحی اشاعت اور پذیرائی نے مجھے اور محتاط کردیا۔ اِس کا بڑا فائدہ ہوا۔ مدیرانِ رسالہ میرے افسانے کو ترجیحی بنیاد پر شائع کرنے لگے۔ 'ابابیل کی ہجرت' ۲۰۱۵ء میں ماہنامہ 'شاعر'، بمبئی کے 'افسانہ نمبر' میں شائع ہوا۔ ناظر نعمان صدیقی صاحب نے موبائل پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا تھا، ''یہ بہترین افسانہ ہے۔ اِسی لئے اِسے 'افسانہ نمبر' میں شامل کیا ہے۔ آپ اِسی طرح افسانے لکھتے اور 'شاعر' کو اپنا قلمی تعاون دیتے رہیں۔ آپ کے اختراعی جملے بہت دلکش ہیں......'' مدیر 'گلبن' نے اِس افسانے کو بھی جولائی۔ اگست ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شائع کیا۔ میں نے ۱۸ر اپریل ۲۰۱۷ء کو مدیر رسالہ 'چہارسُو'، پاکستان، جناب گلزار جاوید کو افسانہ 'مُہاجر' میل کیا، جسے موصوف نے مئی، جون ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شاہد جمیل، گوجرانوالہ کے نام اور پتہ سے شائع کردیا تھا۔ متواتر گزارش کے باوجود مدیر رسالہ نے معذرت/وضاحت اور نہ جناب رؤف خیر کے وضاحتی خط کو شائع کیا۔ سیّد ظفر ہاشمی نے ادارتی نوٹ کے ساتھ 'مُہاجر' کو 'گلبن' کے نومبر۔ دسمبر ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شائع کردیا، تب 'مُہاجر' کی گھر واپسی ہوئی۔ چیف ایڈیٹر، 'نگینہ انٹرنیشنل'، سری نگر، وحشی سعید صاحب میرے افسانوں کے بڑے مدّاح ہیں۔ وہ میرے افسانے کو لگاتار جگہ دینا چاہتے ہیں۔ ایک بار دورانِ گفتگو میں نے کہا تھا، ''میرے پاس غیر مطبوعہ افسانہ نہیں ہے۔'' اُنھوں نے برجستہ کہا تھا، ''بہترین مطبوعہ تخلیق کی دوبارہ اشاعت ہونی چاہئے کہ ہر رسالے کا اپنا حلقہ ہوتا ہے اور اُس کے مخصوص قاری ہوتے ہیں۔ آپ مجھے

مطبوعہ افسانے ہی ارسال کیجئے۔'' محترم نور شاہ نے 'نگینہ' میں شائع 'مردم گزیدہ' کو کشمیری زبان میں ترجمہ کا وعدہ کیا۔ موصوف اور اشرف آثاری صاحب انتہائی خلوص سے مجھ سے 'نگینہ' کیلئے افسانے طلب کرتے ہیں۔ مدیر رسالہ، ماہنامہ 'اُردو آنگن' ممبئی جناب مشیر احمد انصاری نے مجھ سے موبائل پر رابطہ قائم کرکے کہا تھا،'' آپ ایک گھنٹے کے اندر مجھے 'گردشِ ایام' میل کر دیجئے تا کہ اِسے میں اِسی شمارے میں ہی شامل کر سکوں۔ مسودے کو آج شام پریس کے حوالے کرنا ہے۔ میں نے مطبوعہ افسانے کو غیر مطبوعہ لکھ کر کبھی کسی رسالے کو نہیں بھیجا۔ 'ایوانِ اُردو' میں افسانہ 'تحفہ' منتخب ہو چکا تھا۔ حیدر آباد سے رؤف خیر صاحب نے موبائل پر کہا،'' تحفے کی واپسی' 'سب رس'، حیدر آباد کے اگست ۲۰۱۶ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے، جسے پڑھ کر میں مبارکباد پیش کرنے کے لئے مجبور ہو گیا ہوں۔'' اشاعت میں ہوئی تاخیر کے سبب میں نے اِسے ناپختہ افسانہ تسلیم کرتے ہوئے ترمیم واضافے کے بعد اِسے 'تحفہ' کے عنوان سے 'ایوان اُردو'، دہلی کو ارسال کر دیا تھا، جو اگلے ہی ماہ شائع ہو رہا ہے۔ میں نے فی الفور مدیر 'ایوانِ اُردو' کو اشاعت کی تحریری جانکاری دیتے ہوئے غیر مطبوعہ افسانہ 'داغ' ارسال کر دیا۔ موصوف بے حد خوش ہوئے تھے۔ اُنھوں نے 'داغ' کو نومبر ۲۰۱۶ء کے شمارے میں شائع کر دیا......

چند باتیں اِس لئے رقم کر دی ہیں کہ احباب اور قارئین بھی باخبر ہو جائیں کہ میں نے دل کی مینا کی بات مان کر ہی تعریف وتوقیر حاصل کی ہے۔ اِس مجموعے کی ترتیب و اشاعت میں تاخیر کا سبب یہ ہے کہ دل کی مینا سر پر سوار رہی اور شائع شدہ افسانوں کو ہی مجموعے میں شامل کرنے کی شرطیہ اجازت دی کہ مجھے اِن میں بھی ترمیم وتنسیخ کر کے رہ گئی خامیوں سے اِنھیں پاک کرنا ہوگا۔ قارئین کو بخوبی احساس ہوگا کہ اب یہ افسانے پہلے سے بہتر ہیں۔

انشاء اللہ قارئین کو ٹھگے جانے کا احساس نہیں ہوگا کہ اِس میں بھرتی کے افسانے شامل نہیں ہیں یعنی کوئی نمبر وَن اور کوئی نمبر دو نہیں۔ آخری افسانہ بھی کوَرا سٹوری بن سکتا ہے۔ یہ التماسِ عام ہے کہ نظروں سے چوک گئیں خامیوں کی نشاندہی ضرور کریں گے۔ بے عیب ذات اللہ کی۔ احباب وقارئین اور ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی کا میں ممنون ومشکور ہوں۔

ڈاکٹر شاہد جمیل

جالے میں پھنسی مکڑی

رفعت کھلی چھت پر ہاتھ پھیلائے اُس وقت تک دعائیں مانگتی رہی جب تک عید کا چاند نظر آیا۔ تنہا اُداس کھڑی رفعت کے دوپٹے کا سرا کلس کی جھنڈی سا لہرا رہا تھا اور زلفیں دھیرے دھیرے آزاد ہو کر مچلنے لگی تھیں۔ سر کے ہلکے جھٹکے کھا کر بھی دائیں آنکھ کے سامنے آدھمکنے والی گستاخ لٹ کو اُس نے کان کے پیچھے دبا کر دوپٹے دُرست کرتے ہوئے غور سے اُس مقام کو دیکھا، جہاں کچھ دیر پہلے دلکش ہلال تھا۔ اُس نے سوچا کہ بے اولاد انسان کی زندگی بھی بے چاند آسمان کی طرح سونی اور اُداس ہوتی ہے۔

رفعت کا دایاں ہاتھ بے خیالی میں پیٹ پر چلا گیا اور اُس کی ممتا جاگ اُٹھی۔ نین کٹورے آنسو سے لب ریز ہو گئے، تب اُسے ایک منظر نظر آیا کہ اُس کا لختِ جگر آغوش میں آنے کے لئے ہمک رہا ہے اور وہ اُسے صبر دلا رہی ہے۔ جذباتی ہیجان پر قابو پانے کے لئے اُس نے نگاہیں آسمان پر جما دیں، جہاں موہوم اور ٹمٹماتے ستاروں میں نور بڑھنے لگا تھا۔

وقت کے قدم موجِ دریا کی طرح رواں رہتے اور دن، کچھوا چال چل کر ماہ و سال کی دوریاں طے کرتا رہتا ہے۔ آنگن میں اُتری دھوپ کب دیوار پر چڑھتی اور کب اُتر جاتی ہے، احساس نہیں ہوتا۔ رفعت نے آہیں بھر کر سوچا کہ شادی شدہ زندگی کے کئی سال بھی لامحسوس گزر گئے......

شادی سے قبل کی ایک رات رفعت کے ذہن میں مجسّم و متحرک ہو گئی۔ اُس رات عشاء کی نماز اُس نے تاخیر سے پڑھی تھی۔ مچھر دانی لگانے سے پہلے ابا اُس کی اِسٹڈی کُرسی پر

آ بیٹھے تھے۔ اُس نے مشکوک نگاہوں سے اُنھیں دیکھتے ہوئے پوچھا تھا، ''آج پھر بھیا سے جھگڑا ہوا کیا؟''

اُنھوں نے جواب نہیں دیا۔ پھر وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بولے تھے، ''عید کے چاند کی گیارہ تاریخ میں نے طے کر دی ہے۔ وہ لوگ سیوان ضلع کے حسن پورا گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ ماسٹر برکت اللہ مرحوم دو بیٹیوں کی شادی کر چکے تھے۔ اُن کی موت کے بعد عظیم اللہ کی شادی خالہ زاد بہن سے ہوئی۔ حلیم اللہ آئی اے پاس ہے۔ وہ آرا مشین لگانے والا ہے۔ قدرت اللہ نے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔ جڑواں بیٹیاں نیم بالغ ہیں۔ بڑی بیٹی کے دو بیٹے نانیہال میں رہ کر انگریزی اسکول میں پڑھ رہے ہیں......''

اتنا کہہ کر وہ کُرسی سے اُٹھے اور دو قدم چل کر کھڑے ہو گئے، جیسے اُنھیں کوئی خاص بات یاد آ گئی ہو۔ پھر وہ اَفسردہ لہجے میں بولے تھے، ''عاصم میاں پر مجھے اب بھروسا نہیں رہا۔ اِسی لئے اپنی زندگی میں اِس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں......''

پھر وہ اُس کی مرضی جانے بغیر کمرے سے نکل گئے تھے۔

اُنھیں جاتے ہوئے دیکھ کر اُس نے سوچا تھا کہ ابا اُس کے کمرے میں نہیں، چرچ میں آئے تھے اور کنفیشن (Confession) کے بعد دَبے پاؤں لوٹ رہے ہیں۔ عمر کی تیسری دہائی میں قدم رکھ چکی قبول صورت لڑکی کے لئے بغیر جہیز شادی کے پیغام کو ایک باپ ٹھکرا نہیں سکتا۔ وہ بھی ایسی حالت میں جب کہ سر سے ماں کا سایہ اُٹھ چکا ہو اور چھوٹی بہن بھی شادی شدہ ہو۔

رفعت نے خیالوں کا تار توڑ دیا۔ بچپن میں بھی جب کبھی اُسے اپنے ہی تار میں جھولتی مکڑی نظر آ جاتی، تب وہ فوراً اُنگلی سے اُس کا تار توڑ دیتی تھی۔ پھر وہ جد و جہد میں مصروف مکڑی کو بڑے غور سے دیکھی تھی۔ مکڑی کا منزل پا لینا اُسے اچھا لگتا تھا۔

اُس نے ذہن بھٹکانے کے لئے اختر شماری شروع کر دی۔ لیکن ہر بار اُس کی گنتی گڑبڑا جاتی۔ اُس کی آنکھوں میں نیا ستارہ روشن ہو جاتا۔ اختر شماری کا شوق اُسے بچپن سے ہے۔ وہ اکثر پڑوسن سُشما کے ساتھ اختر شماری کیا کرتی تھی۔

اچانک دل کی چڑیا اُڑان بھر کر گزشتہ ایک شام کے کلس پر جا بیٹھی۔ حدِ نگاہ کو وسعت ملی۔ پھر وہ دھڑ دھڑ ماضی کی سیڑھیاں اُترنے لگی۔

اُس دن ماموں جان ڈھیر سارے آم لے کر آئے تھے۔ اُس نے پہلے پسندیدہ آموں کو چُن چُن کر بالٹی میں رکھا تھا۔ پھر نظریں بچا کر اُس نے صراحی کا ٹھنڈا پانی بالٹی میں اُنڈیل کر تازہ پانی بھر دیا تھا۔ تین بار چھڑکاؤ کے بعد ہی چھت پاؤں رکھنے لائق ہوئی تھی۔

فطرتاً چلبلی اور شرارتی سُشما کی آمد کا انداز ہمیشہ نرالا ہوتا۔ کبھی وہ بلّی کی طرح دَبے پاؤں آتی اور اُس کے جوڑے کو کھول دیتی اور کبھی چپکے سے پیٹھ کے پیچھے کھڑی ہو کر گردن پر پھونک مار کے جسم میں سہرن پیدا کرا دیتی۔

اُس نے ایک بار اچانک دوپٹا کھینچ لیا تھا اور وہ ہتھیلیوں سے سینے کو چھپا کر بیٹھ گئی تھی۔ سُشما نے قہقہے لگا کر دوپٹے کا گھونگھٹ بنا کے کہا تھا، ”رفو! زندگی کا احساس تو محسوس کرنے سے ہوتا ہے۔“

پھر اُس نے اُس کی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے بند کر کے اُنگلیوں کا دباؤ بڑھاتے ہوئے پوچھا تھا، ”رنگ برنگے قمقموں کا سنسار نظر آیا؟“

”آیا۔“ اُس نے میٹھے درد کو سہتے ہوئے کہا تھا۔

”رفو! اب تو جیسا محسوس کرے گی ویسا ہی نظر آئے گا۔ محسوس کیے بنا نہ دکھ ہوتا ہے اور نہ سکھ ملتا ہے۔ آنکھوں میں سپنے اور دل میں ارمان ہوں تو جینے کی چاہت بڑھ جاتی ہے۔ تو بھی کھل کر جینا شروع کر دے......“ اُس نے پُشت پر ناک رگڑ کے کہا تھا۔

اُس شام سُشما نے آنکھ بچا کر بیلے کا ایک گجرا اچانک اُس کی گردن میں ڈال کر اُسے ڈرا دیا تھا۔ اُس کی بدحواسی پر اُس نے خوب قہقہے لگا کر کہا تھا، ”عورت اور چڑیاں دونوں ایک سمان ہوتی ہیں۔ چھوؤ، چھیڑو تو بدحواس ہو جاتی......“

پھر اُس نے ایک آم اُٹھا کر اعلان کیا تھا، ”آج تو میں صرف آم کھاؤں گی۔ پردیسی ستاروں سے میرا کوئی رشتہ ناطہ نہیں......“

”نہیں سُمّی! ہم آم بھی کھائیں گے اور ستارہ شماری بھی کریں گے......“ اُس نے

التجا کی تھی۔

آم کھاتے ہوئے اختر شماری شروع ہوئی تھی۔ لیکن بہت جلد سُشما کی شرارتوں سے وہ عاجز ہوگئی۔ پھر وہ ناک بھوں چڑھا کر مُنڈیر سے لگ کے کھڑی ہوگئی تھی، تب اُس نے اپنی چوٹی کی نوک سے اُس کے کان میں گدگدی لگا کر پوچھا تھا، ''مائی ڈیر رفو! تاروں کو کیوں گننا چاہتی ہو؟ اچھا بتاؤ! تمھاری قسمت کا ستارہ کون سا ہے؟ پھر اُس نے اُنگلی سے دِکھاتے ہوئے کہا تھا، ''دیکھ وہ بڑا سا چمچماتا ستارہ ہوسکتا ہے، وہ مریل سا ٹمٹماتا ہوا بھی یا پھر وہ، جو ہمیں نظر ہی نہیں آرہا ہے۔ بھگوان جانے اِس سمے وہ کون سی چال چل رہا ہوگا؟ سچ کہوں رفو! اگر ہم اُسے پہچان بھی لیں تو کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اپنے من مرضی کی چال چلتا رہے گا۔ پھر چنتا کیوں؟......''

اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا تھا، ''سُمی! چالوں کے بھید میں نہیں جانتی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے کہ انسان سے ستاروں کا بھی ایک رشتہ ہے اور اُن کی چالیں اثر ڈالتی ہیں۔ ورنہ......'' اُس نے بات نامکمل چھوڑ کر چوسے ہوئے آم میں ہوا بھر کر اُسے خلا میں اُچھال دیا تھا۔

''بہورانی! اب نیچے اُتر آؤ۔ دیکھو تو ذرا! کون کون ملنے آئی ہیں......''

رفعت خیالوں کی دنیا اور ستاروں کی انجمن سے لوٹ آئی۔ وہ خاموشی سے سیڑھیاں اُترنے لگی۔ پیشکار صاحب کی بیوی سے شاکرہ بیگم کہہ رہی تھیں، ''تیس روزے کا انعام عید۔ چاندرات کو خدا جھوٹ نہ بلوائے لڈّن کی اماں! بڑی بہو تو سگی بہن کی بیٹی ہے۔ اُس کے گنوں کا بکھان، اپنے منہ میاں مٹھو بننا ہے۔ لیکن چھوٹی بہو کی میں جتنی بھی تعریف کروں سمجھو، کم ہے۔ میں کہنے کو بہو کہتی ہوں لیکن اُسے بیٹی سے......''

پیشکار صاحب کی بیوی قطع کلام کرتے ہوئے بولیں، ''بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟ دونوں بہوؤں کی قسمت سے تمھارے دن پھیرے ہیں۔ بے چارے ماسٹر صاحب کی قسمت میں یہ عیش و آرام نہیں لکھا تھا......''

قدموں کی آہٹ پا کر شاکرہ بیگم موضوع بدلنے کی نیت سے بہو سے بولیں،

''دیکھوتو! للڈن کی اماں بھی تم سے ملنے آئی ہیں۔''

آنگن میں مستقل بچھی چوکی پر بیٹھی پڑوسنوں کو رفعت نے سلام کیا، اُن سے دعائیں لیں اور بچوں کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ بولی،''بس، ابھی آئی۔''

شاکرہ بیگم نے دَبی زبان سے منقطع گفتگو کا سلسلہ جوڑا،''پورا گھر سنبھال رکھا ہے۔ ہر ماہ موٹی رقم شوہر کو اور چائے پانی کے لئے مجھے الگ سے دیتی ہے۔ اُوپری آمدنی سے وہ کچھ نہ کچھ لے کر آتی ہے۔ محبت پا کر بچے بھی اُس کی راہ دیکھتے رہتے ہیں......''

رفعت ٹرے سجا کر آئی، تب شاکرہ بیگم اُٹھ کے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

پیشکار صاحب کی بیوی نے چائے میں بسکٹ ڈبو کر بڑی مہارت سے اُسے منہ میں ڈالا۔ بسکٹ میں موجود کاجو کے ٹکڑوں کو چبا کر وہ گھونٹ گھونٹ چائے پینے لگیں۔ عمدہ لیف کے ذائقے نے اُنھیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ خدا کی شان نرالی ہے۔ وہ چاہے تو دن پھرتے دیر نہیں لگتی۔ ماسٹرائین کی حیثیت پلک جھپکتے بدل گئی۔ اِس پکّے دو تلے مکان کی جگہ دو چھوٹے چھوٹے کمروں کا ایک بوسیدہ مخدوش کھپڑیل گھر تھا۔ بے چاری دن رات آمدنی کے نئے نئے جُگاڑ تلاش کرتی رہتی تھی۔ سب سے پہلے مرغیاں پالی گئیں۔ گھر آنگن مرغے مرغیوں اور چوزوں سے بھر گیا۔ مرغا، مرغی اور انڈے بکنے لگے۔ لوگوں کو بھی چوبیس گھنٹے کی سہولت ہاتھ لگ گئی۔ دیر رات آیا مہمان بھی مرغا پلاؤ یا پھر انڈا پراٹھا کھا کر سوتا۔ پھر بکریاں پالی گئیں۔ اُن کے بول و براز سے گھر میں ہر وقت بدبو پھیلی رہتی اور گھر میں قدم رکھنے سے گِھن آتی تھی۔ بچے مجبوراً ناک پر ہاتھ رکھ کر گھر میں داخل ہوتے۔ واپسی میں کوئی گھاس پر چپل رگڑ رگڑ کے صاف کرتا اور کوئی سرکاری نل پر پاؤں دھو کر گھر لوٹتا تھا۔ ماسٹرائن کا زیادہ وقت گھر آنگن کی صفائی کی نذر ہو جاتا۔ پڑوسی کے گھروں سے لائے ماڑ، دھون، جوٹھن، سبزی، پھل کے چھلکے اور باہر گھوم پھیر کے گھاس پات کھا پی کر پلے بڑھے خصّی بقرعید میں اچھی قیمت ادا کر جاتے۔ اِسی رقم سے قرض کی ادائیگی ہوتی، بچوں کے بدن پر نیا کپڑا چڑھتا اور بقرعید میں عید سا لطف و خوشی ملتی۔ مڈل اسکول کے اُردو ٹیچر کی اوقات ہی کیا؟ بے چارے ماسٹر صاحب نے بہت کوشش کی لیکن مرتے دم تک

اُنھیں ٹیوشن پڑھانے کا موقع نہیں ملا۔ مولوی صاحب ہی بچوں کو عربی کے ساتھ مفت میں اُردو پڑھا دیا کرتے......

پان کی گلوری پیش کرتے ہوئے شاکرہ بیگم نے کہا، ''کہاں کھو گئیں؟''

وہ جھینپتی ہوئی گلوری پکڑ کے اُٹھیں اور اعلان کیا، ''جسے اور بیٹھنا ہو، وہ شوق سے بیٹھے۔ میرا تو سارا کام پڑا ہوگا۔ اب میں چلی۔ آج رات شاید ہی سونا نصیب ہو۔''

اُنھوں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑا کر پکارا، ''شبّو! کہاں مر گئی......''

پھر وہ بڑبڑانے لگیں، ''ضرور ٹی وی دیکھتی ہوگی۔''

شبّو جلدی سے بسکٹ کو نیفے میں اڑنس کر لپکتی ہوئی رفعت کے کمرے سے نکلی اور بچے کو گود میں لے کر کھڑی ہوگئی۔ پیشکار صاحب کی بیوی کے اُٹھتے ساتھ آئیں عورتیں بھی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ سوئے بچوں کو گود لیا گیا اور پاؤں چلنے والے کو کھڑا کر کے دو چار قدم چلا پھرا کر اُن کی نیند اُڑائی گئی۔ ایک بچے کا مشین گن اُٹھا کر رفعت نے لپک کر اُس کی ماں کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ وہ بچہ دونوں ہاتھوں میں بسکٹ پکڑے سو گیا تھا۔

بھابھی کے کمرے میں عید کی تیاری چل رہی تھی۔ قمرالنساء صوفے پر آلتی پالتی مارے گود میں سینی رکھے میوے کتر رہی تھی۔ مہرالنساء پلنگ پر بیٹھی بھابھی کے گوٹے لگے دوپٹے میں سلمٰی ستارہ ٹانک رہی تھی۔ بھابھی پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ فرش پر بچھی چٹائی پر بیٹھا حلیم اللہ بھابھی کو مہندی لگا رہا تھا۔ وہ ہاتھ تھما کر کچھ زیادہ ہی جھک گئی تھی۔ اُن کا جوبن دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ قمرالنساء تھوڑی دیر پر اُٹھ کے بھابھی کے منہ میں کترے ہوئے میوے ڈال رہی تھی۔ قدرت اللہ بھانجے کے ساتھ عید ملن کمیٹی کی بیٹھک میں گیا ہوا تھا۔

بھابھی کے پاؤں میں منہدی لگا کر حلیم اللہ نے پاؤں کو کُرسی کے ہتھوں پر رکھا۔ پھر ایک مسند اُس کی گود میں اور دوسرا پیٹھ کے پیچھے لگا دیا، تب وہ ایک خاص ادا سے بولی، ''اللہ! اب مجھے کوئی گدگدی نہ لگائے......''

''میں گدگدی لگا سکتا ہوں لیکن لگاؤں گا نہیں۔ مجھے تو مزدوری چاہیے، وہ بھی

پسینہ خشک ہونے سے پہلے......" اُس کا لہجہ معنی خیز اور آنکھیں پیغام رساں تھیں۔
ہاتھ دھوتے وقت حلیم اللہ کو ایک شرارت سوجھی۔ وہ کچن سے ایک تلچٹے کو مار کر اُس کی مونچھ پکڑے کمرے میں داخل ہوا۔ بھابھی چیخ پڑی۔ اُن کا دوپٹّا سرک گیا۔ وہ بازوؤں سے سینے کو چھپاتے ہوئے مخصوص ادا سے بولی، "یا اللہ! اب میں کیا کروں؟"
حلیم اللہ تلچٹے کو پھینک کر ہنستے ہوئے ڈھلکے دوپٹے کو درست کر رہا تھا۔ اُسی وقت سیڑھیاں چڑھتی رفعت نے ٹھِٹھک کر سب کچھ دیکھ لیا۔ اُس نے فوراً آنکھیں بند کر لی۔ ناسور رسنے لگا۔ ماضی، نم آنکھوں میں آبی پرندوں کی طرح اُترنے لگا، تب اُس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اب وہ کمر کے پیچھے دوسرا مسند لگا رہا تھا۔ اُس نے ٹھنڈی آہیں بھر کے خود سے سوال کیا کہ یہ وہی انسان ہے؟ جس نے سہاگ رات میں اُس کے مہندی لگے ہاتھوں کو پرے کرتے ہوئے کہا تھا، "مہندی کی بو سے میرا سر چکراتا ہے......"
اُس نے مہندی سے عاری ہتھیلیوں کو دیکھ کر آسمان کو دیکھا، جہاں ستارے جگمگا رہے تھے۔ اچانک اُسے سُشما یاد آ گئی۔ اُس نے کہا تھا، "رفو! گھل مل جانا عورت کی فطرت ہے۔ وہ پانی کی طرح اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ پانی، دودھ میں مل کر دودھ اور شراب میں مل کر شراب کہلاتا ہے۔"
رفعت کے پاؤں کانپنے لگے، تب وہ بھاگتی ہوئی کمرے میں گئی اور پلنگ پر اوندھے منہ جا گری۔ اُس کے ذہن میں گزرے ایام گردش کرنے لگے۔ وہ وقت، جس نے اُسے دکھ دیا تھا، ذلیل و رسوا کیا تھا، آنکھوں کو آنسوؤں کی سوغات بخشا تھا اور جگر جلایا تھا، قاتل کی طرح مسکرا رہا تھا۔ تکیے کو سینے سے بھینچ کر اُس نے سوچا کہ اماں زندہ ہوتیں تو وہ اُن کے سینے سے لگ کر خوب روتی۔ سچ ہے، ماں سے میکہ ہوتا ہے۔ اماں تسبیح کا دھاگہ تھیں۔ دھاگہ ٹوٹتے دانے بکھر گئے۔ الماری کے کارخانے پر دھیرے دھیرے عاصم بھیّا قابض ہو گئے۔ ابا کی حیثیت ناکارہ چھنگی اُنگلی سی رہ گئی۔ بھابھی کی نازیبا حرکتوں اور بھیّا کی چپّی سے نالاں ابا تبلیغی جماعت میں وقت گزارنے لگے۔ سنا ہے، اب وہ زیادہ تر سفر میں ہی رہنے لگے ہیں۔ سُشما، لو جہاد کے چکّر میں پھنس کر نہ جانے

کس حال میں ہے؟ کہیں وہ تارے کی طرح ٹوٹ کر گم تو نہیں ہوگئی؟ اگر کبھی ملاقات ہوئی تو وہ پوچھے گی، اُس نے کیسے آگ کا دریا عبور کیا؟ سلمان کو پاکر وہ خوش ہے یا پچھتا رہی ہے؟ وہ تمھارے رخسار اور گردن پر مور پنکھ سے گدگدی لگاتا ہے؟ تمھاری فلسفیانہ باتوں کی داد دیتا ہے؟ تمھاری شرارتوں کا اب کون کون شکار ہے؟ تین سال چھوٹی عفو (عفت) دو بچے کو جنم دے کر اُس سے بڑی لگنے لگی ہے۔ غربت نے اُس کے حسن و شباب کو......

بھابھی کے ٹھہاکوں سے اُس کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اُس نے دَم سادھ کر گمان کا گھوڑا دوڑایا، کمرے سے بہنیں جا چکی ہوں گی۔ امّی صندوق سے چینی مٹّی کے برتن، تانبے کی دیگچی، پیتل کی سینی، اسٹیل کے چمچے، مرادآبادی عطردان و گلدان، شیشے کا گلاس، فائبر کے ٹرے اور المونیم کا اُگلدان نکال رہی ہوں گی۔ تلچٹے بے پناہ ہوکر اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہوں گے۔ دونوں بہنیں اب اپنی اپنی تیاریوں میں مگن ہوں گی۔ کمرے میں وہی دونوں ہوں گے۔ اُنھوں نے ضرور کوئی گندا لطیفہ سنایا ہوگا۔ یا پھر......

وہ اِس سے آگے سوچنے سے گھبرانے لگی۔ مضطرب ذہن نے دل کو اُکسایا۔ سیڑھی پر کھڑی ہو کر جائزہ لینے کی نیّت سے وہ اُٹھ بیٹھی۔ پھر اِس خیال سے وہ لیٹ گئی کہ بھرم توڑ کر، کرچیوں پر ننگے پاؤں چلنے سے اپنا ہی تلوا لہولہان ہوگا......

اب میوزک سسٹم سے تیز انگریزی دھن نکلنے لگی تھی۔ اُس نے کروٹ بدل کے سوچا کہ اِس میں بھی راز ہے......

درگاہی فقیر کی طرح خیال پیچھے پڑ گیا۔ اُس نے سوچا کہ عورت کا اپنا گھر نہیں ہوتا، میکہ اور سسرال ہوتا ہے یا پھر بیٹے اور داماد کا گھر۔ اُس کی ذاتی زندگی بھی نہیں ہوتی۔ وہ فقط شریکِ خاندان، شریکِ حیات اور شریکِ کار ہوتی ہے۔ روزی کما کر اور نام پیدا کر کے بھی وہ اپنی شناخت نہیں بنا پاتی۔ وہ حوالوں سے پہچانی جاتی ہے۔ اُس کی حیثیت اضافی اور الحاقی ہے، پتنگ میں لگی پونچھ کی طرح۔ سیتا جی نے بن باس میں شری رام کا ساتھ دیا اور کشٹ سہا تھا۔ پھر بھی اُنھیں ہی اَگنی پریکھا دینی پڑی۔ لوک لاج سے مردوں کا واسطہ نہیں۔

مریاداؤں کا پالن عورتوں کو کرنا ہے۔ یہ کیسا سماجی انصاف ہے؟ خدایا! میعاد پوری نہیں ہوئی گندم خوری کی سزا کی؟

خیالوں کی دھماچوکڑی سے اُس کا سر آبلے کی طرح دکھنے لگا۔ اُس نے اُٹھ کر پانی پیا، سر میں تیل ڈال کے ملایا۔ پھر تکیہ سر کے اوپر رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ راحت ملتے آنکھ لگ گئی۔

''رفّو! کیا حال بنا رکھا ہے؟''

''اماں! میری اماں! آپ زندہ ہیں؟''

رفعت اُن سے لپٹ گئی۔ دوپٹے سے اماں کے بہتے آنسو کو پونچھتے ہوئے وہ بھی سبک پڑی۔

''بٹی! تیری مصیبتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔''

پھر وہ اُسے سینے سے لگا کر سِسکتے ہوئے بولیں، ''شادی میں کچھ بھی نہیں دے سکی تھی۔ اِسے رکھ لو......''

وہ شہانہ جوڑے دے کر بولیں، ''تو شروع سے ہی بے زبان ہے۔ غموں کو آنسو بناتی اور دوسروں کو سکھ بانٹتی رہی ہے۔ تیرے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ تیرا حق مارا جا رہا ہے۔ کب تک آنسوؤں سے تکیہ تر کرتی رہوگی؟ بٹی! یہ فیصلے کی گھڑی ہے۔ بہت سہہ لیا تم نے۔ اب اور نہیں۔ تیرے ساتھ اللہ اور ماں کی دعائیں ہیں......''

وہ دروازہ کھول کر ٹھہر گئیں۔ پھر وہ مڑ کے بولیں، ''اپنے ابا کی سدھ بدھ لے لیا کرنا۔'' پھر وہ تیز قدموں سے نکل گئیں۔

''نہیں، مجھے چھوڑ کر مت جاؤ اماں! دلدل میں دھنستی جا رہی ہوں......''

رفعت کی دلدوز چیخ سن کر شاکرہ بیگم بیٹیوں کے ساتھ کمرے میں پہنچ کر اُسے وحشت زدہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔ وہ پلنگ پر سینے سے تکیہ لگائے سِسکیاں لے رہی تھی۔ شاکرہ بیگم آنسو پونچھتے ہوئے شفقت سے بولیں، ''شام کے وقت چھت پر بُرے سایے کا بھی گزر ہوتا رہتا ہے۔ میں نے کئی بار منع کیا کہ......''

پھر وہ بیٹیوں کو جانے کا اشارہ کر کے بولیں، ''کوئی خاص بات نہیں ہے۔ خواب میں ڈر گئی ہے۔ کمرہ بھی تو اندھیرا کر رکھا تھا۔''

تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھتے ہوئے بولیں، ''حافظ صاحب سے پانی پڑھوا کر منگواتی ہوں۔''

رفعت اُن کا ہاتھ پکڑ کے بولی، ''کچھ دیر اور ٹھہر جایئے......''

شاکرہ بیگم کسمسا کر بیٹھ گئیں۔

''امّی! اب مجھے رہائی چاہئے......'' اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

شاکرہ بیگم چپ رہیں۔ اُن کی چُپّی سے اُکتا کر وہ بولی، ''شاید آپ کو معلوم نہیں؟ بھابھی کے ساتھ اِن کا ناجائز رشتہ ہے۔ مجھے کسی نے کہا نہیں۔ میں نے کئی بار دونوں کو قابلِ اعتراض حالت میں دیکھا ہے۔ اب تو دونوں دیدہ دلیری پر اُتر آئے ہیں۔ امّی! پانی سر سے اُوپر ہو گیا ہے......''

وہ قطع کلام کرتے ہوئے بولیں، ''یہ رشتہ تمھاری شادی کے قبل سے ہے۔''

''کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' وہ ہکا بکا ہو کر اُنھیں ایک ٹک دیکھنے لگی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ سوچا تھا، تم پڑھی لکھی اور کماؤ ہو۔ خود ہی لگام لگا لوگی ...... اِس فعل بد میں حلیم اللہ کا قصور کم ہے۔'' اُن کا لہجہ بے باک تھا۔

''ماں کی ممتا ڈھال بن رہی ہے۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے امّی ......''

''تم سچ مچ سیدھی سادی اور نیک ہو۔ کھوٹ تم میں نہیں، میرا ہی سکہ کھوٹا ہے۔''

''مجھے پتا ہے، ابّا تو بڑے نیک انسان تھے۔''

''بیشک۔ جب تک زندہ رہے، ناموس کی چادر بے داغ رہی۔''

''یعنی اُن کی موت کے بعد؟''

''دُلہن! بیوگی سے بہتر موت ہے۔ بیوہ اِس قدر بے سہارا، بے زبان اور بے وقعت ہو جاتی ہے، اِس کا علم مجھے نہیں تھا......''

''اَن دیکھی اور چُپّی سے ہی شبہ ملا ہو گا، یا پھر......''

شاکرہ بیگم قطع کلام کرتے ہوئے بولیں، ''ننگی اپنا کون سا ستر چھپائے؟ بیٹی! اب تجھ سے کیا چُھپا رہ گیا ہے؟ میں سچ کہتی ہوں کہ غربت سے بڑی کوئی لعنت نہیں۔ ہم پر بہت بُرے دن گزرے ہیں۔ تمھارے خسُر تنگ دستی کے سبب خون تھوک تھوک کر مرے۔ ایک یُگ کے بعد اُنھیں کی موت پر پُرسا دینے صابرہ آپا آئی تھیں۔ آتے ہی گھر کا سارا خرچ اُٹھالیا تھا۔ چالیسواں کے بعد جب آپا جانے کو تیار ہوئیں تو نسرین انکار کرتے ہوئے بولی، اماں! خالہ کو چھوڑ کر میں نہیں جاؤں گی۔ رو رو کر یہ بھی جان دے دیں گی......''

صابرہ آپا بولیں، ''تو بیٹا! تجھے چھوڑ کر جانے میں ہمیں کوئی عذر نہیں۔ لیکن اس گھر میں جوان لڑکے بھی ہیں۔ لوگ باگ کے منہ بے لگام ہوتے ہیں۔''

اُنھوں نے اپنی مجبوری ظاہر کی تو مشاطہ خورشیدہ بولی، ''بہن! نکاحی بیٹی تو چھوڑ کر جاسکتی ہو۔ سگی بہنوں کے درمیان رشتے میں جانچ پرکھ کیسا اور کیا لینا، کیا دینا۔ جب کہ دھن دولت اکلوتی نسرین بیگم ہی کا ہے۔ لگا لو رشتے میں ایک گانٹھ اور۔ بن جاؤ سمدھن۔''

نسرین اُٹھ کر کمرے میں چلی گئی، تب خورشیدہ بولی، ''بڑی حیادار بچی ہے۔ شادی کی بات سن کر سُرخ ہوگئی۔ چہرہ، نانا مرحوم کی طرح نورانی اور رنگ، ناک نقشہ ہو بہو ماں کا پایا ہے۔ لاکھوں میں ایک ہے بٹیا۔ کہیں میری ہی نظر نہ لگ جائے، ماشاءاللہ......''

پھر وہ آپا سے مخاطب ہوئی، ''بہن اِسے ہی کہتے ہیں چراغ تلے اندھیرا......''

صابرہ آپا قطع کلام کرتے ہوئے بولیں، ''میں تو بیٹی والی ہوں نہ۔ شاکرہ راضی ہوجائے تو مجھے خوشی ہوگی۔''

''بیٹے سے تو پوچھ لوں پہلے۔'' یہ کہہ کر میں نے اُس وقت جان چھڑائی تھی۔

عظیم اللہ سے پوچھا تو مجھے لگا کہ وہ تیار ہی بیٹھا تھا۔ وہ اَفسردہ لہجے میں بولا، ''ابا کے مرنے کے بعد ہی ہمارے دن پھرنے والے ہیں ورنہ خالہ اتنی رحم دل نہیں۔ کبھی ہم لوگوں کی سُدھ نہیں لی تھی۔''

پھر وہ تھوڑی دیر چُپ رہ کر بولا، ''لگتا ہے خدا کو بھی یہ رشتہ منظور ہے۔ اماں! اب تمھیں بھی آرام کی سخت ضرورت ہے۔ دن رات مرغی بکری میں لگی رہتی ہو۔ صحت بھی

گرنے لگی ہے۔ آپ کی مشقت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔''

بیٹی! مستقل دکھ جھیلتے رہنے سے آدمی کی عقل ماری جاتی ہے۔ سوچا تھا کہ بہن، بیٹی دے گی تو اُس کے عیش و آرام کا بھی انتظام کرے گی۔ میرے گھر کا نقشہ بدل جائے گا۔ سر پر لڑکیاں بیٹھی اور لڑکے بے روزگار ہیں۔ اِن کا بھی بھلا ہوگا۔ اِسی لالچ میں رضامند ہوگئی تھی۔

پھر صابرہ آپا نے واپسی کا سفر ملتوی کیا۔ نوشے بھائی کو آدمی بھیج کر بلایا گیا اور سادگی سے نکاح ہوا۔ پھر نوشے بھائی نے اپنی نگرانی میں یہ مکان تعمیر کروایا۔ بیٹی! میں نے جیسا سوچا تھا، ویسا ہی ہوا۔ مجھے بھی مرغی بکری کے جھمیلوں سے نجات مل گئی۔ غلّہ پانی سے گھر بھرا رہنے لگا۔ کھان پان اور رہن سہن میں بڑا فرق آگیا۔ محلّے میں بھی عزت بڑھ گئی۔

اتفاق سے شادی کے بعد رمضان میں آپا کے گاؤں کی ایک فقیرن فطرہ زکوٰۃ مانگتی ہوئی آئی اور موقع نکال کر مجھ سے بولی، ''اماں! آپ صاف دل کی سیدھی سادی عورت ہو۔ سگی بہن فریب دے گئی۔ نسرین بی بی پیٹ گرا کر آئی تھی۔ عین وقت پر ماسٹر صاحب کی موت اُن کے کام آئی۔ مجھے سب معلوم ہے، خورشیدہ کو ایک ہزار روپے، پازیب اور ساڑی کپڑا دیا گیا ہے۔ یقین نہ آئے تو خورشیدہ کو بلوا کر میرے سامنے پوچھ لو، اماں! اُس کی مجال کہ میرے سامنے مکر جائے۔ آمد و رفت کا خرچہ مل جائے تو میں دائی کو بھی ساتھ لا سکتی ہوں اماں!''

خدا گواہ ہے، پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی تھی۔ حالات کا رُخ بدل دینا میرے بس میں نہیں تھا۔ بھلا نگلی ہوئی مکھی کا کوئی اعلان کرتا ہے؟ میں نے اُس کی خوب خاطر داری کی۔ رخصت کرتے وقت ایک ہزار روپئے اور نئے پرانے کپڑے دے کر تین بار بلند آواز میں اولاد کی قسم کھِلائی کہ وہ اِس بات کو ہمیشہ کے لئے سینے میں دفن کر لے گی۔

سال بھی پورا نہیں ہوا کہ میاں بیوی کے جھگڑے اور تو تو میں میں سے گھر کا سکون جاتا رہا۔ وہ بات بات پر میاں کو نِکمّا نِکھٹّو کا طعنہ دینے لگی۔ بیٹی! مرد کی اَنا خرگوش کے کان کی طرح حساس ہوتی ہے۔ ایک دن عظیم اللہ کی اَنا بیدار ہوگئی۔ وہ کلکتہ جانے کی

تیاری کرنے لگا، تب اُس نے کہا تھا، ''خالی ہاتھ کلکتے جاکر ہاتھ ملتے گھر لوٹو گے۔ مرد بنتے ہو تو عرب جاؤ۔ میں گھر بیٹھے سارا انتظام کروادوں گی......''

بیٹی! غضب کی عورت ہے۔ اُس نے سچ مچ میاں کو ہوائی جہاز پر چڑھا کر ہی دَم لیا۔ میں نے سوچا کہ چلو اچھا ہی ہوا۔ آمدنی بڑھے گی اور گھر کا سکون بھی لوٹ آئے گا۔ لیکن یہ میری خوش گمانی ثابت ہوئی۔ عظیم اللہ کو گئے ابھی ہفتہ دس دن بھی نہیں گزرا تھا کہ منہ اندھیرے حلیم اللہ کو چور کی طرح بہو کے کمرے سے نکلتے ہوئے میں نے دیکھ لیا تھا۔ پہلے اشاروں سے کام لیا۔ پھر میں دَبی زبان سے بیٹے کو ٹوکنے روکنے لگی۔ لیکن دھیرے دھیرے دونوں کی دیدہ دلیری بڑھنے لگی۔ میں بے چین رہنے لگی کہ بات کہیں آنگن کی دیوار پھاند نہ جائے۔ حلیم اللہ کی شادی میں ہی مجھے مسئلے کا حل نظر آیا۔ لیکن بیٹی! تو بھی تو اللہ میاں کی گائے نکلی۔

شاکرہ بیگم اتنا کہہ کے پلنگ سے اُتر گئیں۔ پھر وہ دو قدم چل کر لوٹیں اور بہو کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولیں، ''اللہ بڑا کارساز ہے۔ بس کچھ دن اور صبر کرلو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ اللہ تمھارا شوہر لوٹادے گا......''

''وہ کیسے......؟'' اُس نے بے تابی سے پوچھا۔

''وہ موبائل پر میاں کو حلیم اللہ کے لئے ویزا بھیجنے کا حکم دے رہی تھی۔ پاسپورٹ کے لئے تھانے سے سپاہی آکر اِس بار سات سو روپے لے گیا ہے۔''

شیشے پر منہ سے بھاپ نکال کر شاکرہ بیگم آنچل سے عینک صاف کرنے لگیں، تب رفعت نے پوچھا، ''آپ اِسی بنیاد پر کہہ رہی ہیں؟''

''نہیں۔ ایک وجہ اور ہے......''

اُس نے بے تابی سے اُن کا ہاتھ پکڑ کے پوچھا، ''جلدی سے بتایئے نہ......''

''ایک رات جب وہ فاحشہ رفع حاجت کے بہانے نکلی تھی، تب میں نے قدرت اللہ کو بلّی کی طرح پنجوں کے بل چل کر اُس بدکار کے کمرے میں گھستے ہوئے دیکھ لیا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ تیز قدموں سے باہر نکل گئیں۔

رفعت بت سی پلنگ پر بیٹھی رہی۔ اچانک اُسے شدید گھٹن کا احساس ہوا۔ اُس نے جسم سے الجھے دوپٹے کو نوچ کر تکیے پر رکھا۔ پھر وہ کھڑکی کے سلاخوں کو پکڑ کے صبح اختر کا انتظار کرنے لگی۔

●

(یہ پہلا افسانہ ہے، جو ماہنامہ 'ایوانِ اُردو'، دہلی، جلد۔۲۰، شمارہ۔۴، اگست ۲۰۰۶ء، شش ماہی 'شعر و حکمت'، حیدرآباد، جلد دوم، دسمبر ۲۰۰۶ء اور دو ماہی 'گلبن'، لکھنؤ جلد۔۲۸، شمارہ۔۶، نومبر۔دسمبر ۲۰۱۶ء میں شائع)

گردشِ ایّام

''نکی ،بلو!'' غزالہ نے دوسری بار پُکارا۔
اِس پُکار میں غصّے کے ساتھ ایک میسج بھی تھا۔
''ممّا! آرہے ہیں نا......''

دادی کے بستر پر بڑی بہن کے ساتھ بیٹھا بلو قدرے توقف کے بعد بولا۔اِس کے لہجے میں بھی کھیج اور بیزاری گھُلی ملی تھی۔

بیگم شرجیل احمد بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں، ''جاؤ بیٹے! ہوم ورک کرلو۔میں مہمان نہیں کہ چلی جاؤں گی۔اِس واقعے کو پھر کبھی پورا کردوں گی۔اُس وقت یاد دِلا دینا کہ کہاں تک سن چکے ہو۔''

''دادی! آج سنڈے ہے نہ۔ہم لوگوں نے صبح ہی ہوم ورک فِنش کرلیا ہے۔ یہ ہمارے کھیلنے اور ٹی وی دیکھنے کا ٹائم ہے۔کارٹون دیکھنے سے زیادہ مزہ تو آپ کے پاس رہنے اور آپ کی باتوں سے آتا ہے۔دادی! ریئلی آپ بہت سوئیٹ ہیں۔ہم لوگوں کو اچھی اچھی باتیں بتاتی ہیں، اِسٹوری اور اِنسیڈنٹ سناتی ہیں۔ممّا تو کلاس ٹیچر جیسی ہیں...... پلیز! جلدی سے بتایئے نہ! ہمارے پاپا کو دادا نے سون پور میلے میں صرف خرگوش اور میرے مٹھو جیسا طوطا دِلایا تھا؟''

نکی بھائی کا ہاتھ پکڑ کے بولی، ''چلو نہ!''

بلو بہن کا ہاتھ جھٹک کر بولا، ''دادی! اگر پاپا کے ساتھ میں بھی گیا ہوتا تو ضد

کر کے دادا سے ہاتھی کا بچہ خرید واتا۔''

نکّی ہنستے ہوئے بولی، ''تم پاپا کے ساتھ نہیں جا سکتے تھے۔''

''کیوں نہیں جا سکتا تھا؟ میں جب رونے لگتا، تب دادا مجھے ضرور لے جاتے۔''

'فولش! اُس وقت پاپا، بچہ تھے۔ اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ شادی کے بعد نہ بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ہے نہ! دادی؟''

بیگم شرجیل احمد پوتی سے آنکھیں چُراتے ہوئے سوچنے لگیں کہ وہ اِس عمر میں بڑوں کا کہا سچ مان گئی تھیں کہ بچہ میلے اور اسپتال سے خریدا جاتا ہے۔ اُنھیں دکھ پہنچا کہ ٹی وی اور انٹرنیٹ نے بچوں سے بچپن اور اُن کی معصومیت چھین کر اُنھیں بالغ الذّہن بنا دیا ہے۔ وہ پُچکارتے ہوئے بولیں، ''جاؤ بیٹا! ممّی بُلا رہی ہیں۔''

ببلو اَن سنی کرتے ہوئے بولا، ''دادی! ایک سو روپیہ لے کر ایک دن کلاس ٹیچر پورے کلاس کو زو گھمانے لے گئی تھی۔ ہاتھی کے پاس کھڑا آدمی ایک مٹھّی چنا دے کر کہتا تھا، اِس میں سکّے رکھ کر کھِلائیے، یہ سکّے نہیں کھائے گا۔ جب کوئی سکّہ ڈال کر ہاتھی کو چنا کھِلاتا، تب وہ منہ میں چنا رکھ کر سکّے اُسے دے دیتا اور وہ سکّہ دِکھا کر جیب میں رکھ لیتا تھا۔ دادی! وہ ایک روپیہ لے کر تو متو ہاتھی سے سیک ہینڈ بھی کرواتا تھا۔ میں نے بھی سیک ہینڈ کیا تھا۔ مجھے خوب گدگدی لگی تھی اور ہاتھ میں اُس کا تھوک بھی لگ گیا تھا۔ دادی! اگر ضد کر کے پاپا نے ہاتھی کا بچہ خریدوایا ہوتا، تو آج وہ بڑا سا ہو جاتا نہ؟......''

نکّی قطع کلام کرتے ہوئے بولی، ''اچھا ہوا، نہیں خریدایا۔''

''کیوں اچھا ہوا؟'' ببلو نے معصومیت سے پوچھا۔

''اُسے رکھتے کہاں؟ پارکنگ میں؟ یا مِٹھو کی طرح پنجرے میں؟'' نکّی نے اُلٹے سوالات جڑ دیئے۔

ببلو اُفسردہ ہو گیا۔ بیگم شرجیل احمد نے بچوں کو شفقت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچا کہ اِن کی محبت نے ہی اُنھیں باندھ رکھا ہے۔

نکّی کو بھی باتوں میں مزہ آ رہا تھا۔ لیکن اُسے معلوم ہے، ممّی تیسری بار پُکارتی نہیں، سزا دیتی ہیں۔ اگر وہ چلی گئی تو ببلو کی خوب پِٹائی ہو گی۔ وہ بھائی کا ہاتھ پکڑ کے کھینچتے

ہوتے ہوئے بولی، ''اب چلو ببلو! ممّا دوسری بار پکار چکی ہیں۔ وہ دادی کے پاس پھر نہیں آنے دیں گی......''

قدموں کی آہٹ پا کر بچے گھبرائی بلّی کی طرح کمرے سے نکل گئے۔

تھوڑی دیر بعد نگی دادی کے بستر پر پُرانے اخبار کا ایک صفحہ بچھا کر لوٹ گئی۔ پھر وہ ایک سجایا پلیٹ رکھ کر پانی لانے چلی گئی۔ بیگم شرجیل احمد کی نگاہیں جائزہ لینے لگیں۔ تھوڑا سا چاول، چھوٹے چھوٹے خانوں میں دال، سبزی، سلاد اور چاول کے اُوپر دو روٹی، تلی ہوئی مچھلی اور پاپڑ کا ایک ایک ٹکڑا رکھا تھا۔ اُنھوں نے سوچا کہ ایسی پلیٹ سستے ہوٹلوں میں استعمال ہوتی ہے، جس میں ایک ساتھ کئی چیزیں پروسی جاتی ہیں۔ اُنھیں لگا کہ یہ کسی سڑک چھاپ ہوٹل کا نا نو ینج تھال ہے۔

بیگم شرجیل احمد کے ذہن میں گزرے ایام گردش کرنے لگے۔ ایک منظر از خود رواں ہو گیا۔ وہ بھی شوہر اور بیٹے کے ساتھ اِسی طرح ہنستی بولتی ہوئی کھاتی پیتی تھیں۔ وہ چُن چُن کر کلیجی، گُردے اور اچھی بوٹیاں نکال کر بیٹے کو کھِلاتے اور نلّی کا گودا جھاڑ کر اُس کی زبان پر رکھتے تھے۔ اُنھیں چھوٹی مچھلی پسند تھی لیکن جب تمثیل چاول روٹی کھانے لگا، تب وہ بڑی مچھلی لاتے اور کانٹا نکال کر اُسے کھِلاتے۔ خصّی کا مغز اور مچھلی کا سیرا اُنھیں بہت پسند تھا، جس کا بیشتر حصّہ وہ بیٹے کو کھِلا دیتے تھے۔ اِس منظر کو ماں کی نظر سے دیکھ کر وہ خوش ہو جاتی۔ لیکن جب وہ بیوی کی نگاہ سے دیکھتی، تب اُن کا دل کچوٹنے لگتا تھا کہ وہ خود ٹھیک سے کھا نہیں پاتے تھے۔ وہ اُس وقت مسکرانے لگتی، جب وہ لقمہ اپنے منہ میں رکھنا چاہتے اور بیٹا منہ کھول دیتا، تب وہ ہاتھ روک کے تھوڑا سا اُس کے منہ میں ڈال کر بچا نوالہ اپنے منہ میں رکھ لیتے تھے۔ ایک بار اُس نے کہا تھا، ''لایئے! اب میں کھِلاتی ہوں۔'' تب وہ بولے تھے، ''جمیلہ بیگم! بڑھاپے میں ہمارا بیٹا بھی اِسی طرح ہمیں کھِلائے گا۔''

وہ مسرور ہو کر اُن کے خوابوں اور ارمانوں کو پتنگ کی طرح اُٹھان لیتے ہوئے دیکھنے لگی تھی۔

ذہن میں رواں منظر از خود بدل گیا۔ بیگم شرجیل احمد کی نگاہوں میں گاؤں کی ایک پڑوسن مجسّم ہو گئی۔ وہ تام چینی کی رکابی میں سب کچھ چاول پر لاد کر سائل کو کھانا دیتی تھی۔

وہ بے چارہ حکمت لگا کر کھاتا تھا۔ کھانا کم پڑ جاتا تو وہ شرم سے مانگ نہیں پاتا اور زیادہ ہوتا، تب وہ کسی طرح اُسے حلق کے نیچے اُتار کر رکابی گلاس دھو کر لوٹاتا تھا۔ اُس عورت نے فقیر کے لئے برتن الگ کر رکھا تھا۔

غزالہ نے بھی اُن کے کھانے پینے کا برتن، باتھ روم، غسل کی بالٹی، جگ، تولیہ اور صابن وغیرہ الگ کر رکھا ہے۔ وہ اپنے کپڑے واشنگ مشین میں دھوتی ہے اور وہ غسل سے پہلے اور بعد میں اپنی اُترن خود دھوتی۔

بیگم شرجیل احمد ہمیشہ سوچتی ہوئی ہر لقمہ کو تادیر چباتیں۔ گویا منہ میں چھبتے تذلیل کے نوالے کو وہ رقیق بنا کر گھونٹ لینا چاہتی ہوں۔

اُنھیں یاد ہے، ایک بار اُنھوں نے نگی سے پلیٹ مانگ کر کھانا، چمچ سے نکال کر واپس کیا تھا، جسے کتّے کو کھلایا گیا۔ اُسی دن سے وہ بچا کھانا خود ہی ٹھکانے لگا دیتی ہیں۔

غزالہ گاؤں کے اسکول کی پڑھی لکھی اور تمثیل احمد ایم بی اے ہے۔ پھر بھی گھر کی باگ ڈور اُسی کے ہاتھوں میں ہے۔ اُس نے ہوسٹل سُپرنٹنڈنٹ کی طرح کھانے پینے، پڑھنے سونے اور ٹی وی دیکھنے کا وقت متعین کر رکھا ہے۔ گھڑی کی سوئی سب کو متحرک رکھتی ہے۔ وہ زبان سے کم، آنکھوں سے زیادہ کام لیتی ہے۔ اُس کا حکم حتمی اور اشارہ واضح ہوتا ہے۔ ٹی وی دیکھتے وقت وہ ٹی وی اور اے سی کا ریموٹ اپنے قبضے میں رکھتی ہے۔ دوپہر اور رات آٹھ سے نو بجے کا وقت اُس کے سیریل دیکھنے کا ہے۔

بیگم شرجیل احمد حیران تھی کہ تھپک تھپک کر سُلائی خواہش آج پھر مچلنے لگی ہے کہ وہ بھی ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھیں، جہاں اُن کا بیٹا، بال بچوں کے ساتھ ہنس بول کر کھانے والا ہے۔

پانی بھرا گلاس رکھ کر گم صُم کھڑی نگی سوچ رہی تھی کہ دادی بھی ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھاتیں تو بہت اچھا لگتا۔ جس طرح پاپا، چُن چُن کر اچھی اچھی چیزیں ممّی کی پلیٹ میں رکھتے ہیں، میں بھی دادی کی پلیٹ میں رکھتی......

''نگی! پاپا تمھارا انتظار کر رہے ہیں......'' غزالہ کی پُکار میں بیزاری اور پھٹکار گھُلی ملی تھی۔

''چیّو! جاتی ہے تو چپک جاتی ہے۔'' وہ بھُن بھُنائی۔

''دادی! کچھ لینا ہو تو مانگ لیجئے گا۔'' یہ کہہ کر وہ بھاگتی ہوئی ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھی۔

کھانا کھاتے ہوئے نکّی کو وہ دن یاد آ گیا، جب دادی نے ایک ایک لقمہ ببلو اور اُس کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ منہ چلاتے کمرے سے نکلتے دیکھ کر ممّا نے منہ کھلوا کے دیکھا تھا۔ پھر اُنھوں نے چبائے لقمے کو اُگلوا کر گالوں پر تمانچے رسید کر کے زبان کاٹ دینے کی دھمکی دی تھی۔ اُس دن کے بعد دادی نے پھر کبھی اُن کے منہ میں کچھ بھی نہیں رکھا۔

ایک دن دوپہر میں بیگم شرجیل احمد ماضی کی سنگلاخ وادی میں داخل ہو گئیں۔ وہ سخت تپش والی دوپہر تھی۔ غزالہ بچوں کے ساتھ کھانا کھا کر سو رہی تھی۔ اُنھوں نے فریج سے بوتل نکال کر پانی پی لیا تھا۔ شام کے وقت غزالہ نے فریج کی صفائی کی اور آفس سے آتے شوہر کے کان بھرے۔ تمثیل اُلٹے پاؤں بازار گیا اور پانچ لیٹر کا واٹر پاٹ اور تپائی لے کر لوٹا۔ وہ پانی بھر کے پاٹ تپائی پر رکھ کر بولا تھا، ''امّی! اب آپ کو دقت نہیں ہوگی۔ نکّی ٹھنڈا پانی بھر دیا کرے گی۔ بارہ گھنٹے تک پانی گرم نہیں ہوگا۔'' پھر وہ فوراً کمرے سے نکل گیا تھا اور وہ سوچنے لگی تھی کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اُس میں سما جائے۔

اچھے بُرے واقعات و حادثات ذہن میں محفوظ رہتے ہیں۔ ذہن، ٹچ اِسکرین موبائل سا ہوتا ہے، جو چاہے، اَن چاہے لمس سے متحرک ہو جاتا ہے۔ اِن دنوں بیگم شرجیل احمد کا ذہن آٹو پلے موڈ میں رہتا ہے۔ ایک رات تذلیل کا دوسرا افو میج از خود رواں ہو گیا۔

اُس دن بھی گرمی اپنے شباب پر تھی۔ پنکھے کی ہوا لو جیسی لگ رہی تھی۔ وہ اُٹھ اُٹھ کر پانی پیتی پھر بھی تشنگی برقرار رہتی۔ تیسرے پہر کی اُمس سے اُن کا جی بگڑا جا رہا تھا۔ شام کے وقت میاں بیوی مجبوراً بچوں کو گھر پر چھوڑ کر کسی کام سے باہر نکلے تھے۔ وہ نماز پڑھ چکی، تب بچے آ دھمکے۔ ماں کی غیر موجودگی نے اُنھیں نِڈر بنا دیا تھا۔ دونوں ایک ایک ہاتھ پکڑ کے اُنھیں کھینچتے ہوئے ماں کے کمرے میں لے گئے تھے۔

غزالہ کا کمرہ صاف ستھرا، سجا سنورا اور دلکش تھا۔ متصل بالکونی میں خوش نما پھولوں کے گملے رکھے تھے۔ دیوار میں چھوٹا سا ساؤنڈ بکس آویزاں تھا۔ ایک طرف کُرسی اور ٹی ٹیبل لگا تھا۔ وہ گرمی کی شام اور جاڑے کی صبح یہاں بیٹھ کر چائے پیتی ہوئی نغمے سنتی ہے۔ اُس نے

سنگاردان کو مخصوص زاویے سے لگا رکھا ہے تاکہ وہ کمرے میں رہ کر بھی باہر نظر رکھ سکے۔

اُنھیں بستر پر بٹھا کر نکّی نے پاپا، ممّی کا تکیہ پیٹھ کے پیچھے لگا دیا تھا اور ببلو نے جھومر روشن کر کے ٹی وی آن کر دیا۔ پھر دونوں اُن کے زانو پر سر رکھے کارٹون دیکھنے لگے تھے۔ کتّے بلّی کی عجیب و مضحکہ خیز حرکتوں پر وہ بھی بچوں کے ساتھ ہنستی اور کبھی مسکرانے لگتی۔ اے سی کی ٹھنڈک سکون بخش تھی۔ اُنھیں لگا تھا کہ آج وہ اپنے گھر میں اپنوں کے ساتھ ہیں۔

اچانک بچے سہم کر اُٹھ بیٹھے، تب اُنھوں نے سر گھما کر دیکھا تھا۔ غزالہ حسبِ عادت دروازے کا لاک بے آواز کھول کر دبے پاؤں کمرے میں آئی تھی۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھے بچوں کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی اور تمثیل ہاتھوں میں تھیلے لئے نادم سا کھڑا تھا۔ وہ فوراً اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔

پھر بچوں کے رونے اور ''سوری ممی۔'' کی صدائیں آنے لگی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد تمثیل بیوی سے بولا تھا، ''اب بس بھی کیجئے۔ غلطی اِن کی نہیں۔''

اُن پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ دوشی ٹھہرائی جا چکی تھی۔

بچے جانتے تھے کہ پاپا یا دادی کی گوہار لگائی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اُس کی مداخلت سے معاملہ طول پکڑ لیتا۔ بے بسی نے اُسے اَجگر کی طرح جکڑ رکھا تھا۔ لیکن طوطا، ''ببلو، نکّی ...... چُپ، چُپ۔'' کی صدائیں بلند کرنے لگا تھا۔

غزالہ نے جب چپّل، چادر اور تکیے کا غلاف کمرے سے باہر پھینکا، تب وہ گھبرا کر پردے کی اوٹ میں جا کھڑی ہوئی تھی۔ تمثیل چپّل کو اُن کے کمرے کی جانب ٹھوکر مار کے صفائی اَبھیان میں بیوی کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ وہ بار بار معافی مانگ رہا تھا اور غزالہ نے چپّی سادھ رکھی تھی۔ اُس کی چپّی زلزلہ کے بعد متوقع واپسی جھٹکے سا تا دیر دہشت میں رکھتی ہے۔

اُس رات نکّی، ببلو بغیر کھائے سو گئے تھے اور وہ کانٹوں کی سیج پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ وہ جانتی ہیں کہ غزالہ نے دانستہ بچوں کی خوب پٹائی کی تھی تاکہ وہ پھر کبھی اُس کے کمرے کا رُخ نہ کریں۔ قدموں کی آہٹ پا کر اُس نے آنکھوں پر بازو رکھ لیا تھا۔ تمثیل کھانا رکھ کر اُلٹے پاؤں لوٹ گیا تھا۔ اپنی اولاد کی بے رُخی اور روّیے پر اُن کا دل بھر آیا تھا۔ پھر وہ

سینے سے تکیہ لگائے تا دیر روتی رہی تھی۔

اچانک اُسے لگا کہ تمثیل کے ابّا سرہانے بیٹھے تسلّی دے رہے ہیں، ''جمیلہ بیگم! تم بیٹا بہو کے گلے نہیں پڑی ہو بلکہ بیٹا نے لوک لاج میں تمھیں قیدی بنا رکھا ہے۔ یہ فلیٹ غزالہ کے نام ہے، تو کیا ہوا؟ یہ ہمارے پیسوں سے خریدا گیا تمھارے بیٹے کا گھر ہے۔ تم فریج، اے سی اور واشنگ مشین کا استعمال کر سکتی ہو۔ بیٹے کے بستر پر بیٹھ کے پوتا پوتی کو پہلو سے لگائے ٹی وی دیکھ سکتی ہو۔ کچن میں جا کر اپنے اور اپنوں کے لئے چائے ناشتہ بنا سکتی ہو۔ ڈائننگ ٹیبل پر مل بیٹھ کر کھا پی سکتی اور بیٹے کے ساتھ بازار اور تقریبات میں جا سکتی ہو۔ یہ تمھارا گھر ہے، جس میں بیٹا اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ یہ جیل، پنجرا اور شوکیس نہیں کہ وہ تمھیں قیدی یا شوپیس بنا کر رکھے......''

اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا تھا، ''ہاں! میں ایسا کر سکتی ہوں۔ لیکن کروں گی نہیں۔ ماں ہوں نہ۔ دھرتی اور ماں سینے میں جوالا رکھ کر بھی شانت رہتی ہے۔''

سر درد سے پھٹنے، کنپٹی کی نسیں پھڑ پھڑانے اور دماغ ماؤف ہونے لگا تھا، تب اُسے محسوس ہوا تھا کہ وہ میرا سر دَبانے لگے ہیں۔ نہ جانے کس پہر اُن کی آنکھ لگ گئی تھی۔ بے شک! اللہ نے رات کو پردہ پوش اور نیند کو راحت بخش بنایا ہے۔

دوسرے دن تمثیل آفس سے لوٹتے وقت ایک منی کولر، ٹی وی اور اِسٹینڈ لیتا ہوا آیا تھا۔ مستری نے اُسی وقت اُنھیں فٹ کر کے آن کر دیا تھا۔ وہ بستر پر خاموش بیٹھی بیٹے کی بے بسی اور اپنی ذلّت و رسوائی کا غم جھیل رہی تھی۔ وہ کمرے سے نکلتے ہوئے بولا تھا کہ ''امّی! اب آپ کو کسی کے کمرے میں جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔'' وہ لکشمن ریکھا کھینچ کر نکلا تھا۔

اُس کی آنکھوں سے خون کی نہریں جاری ہو گئی تھیں۔ اُسی وقت طوطا، ''ببلو، نکّی۔'' کی صدائیں بلند کرنے لگا، جسے سن کے اُنھیں لگا تھا کہ وہ ساتھی قیدی کا درد محسوس کر کے ببلو اور نکّی کو پُکار کر کہہ رہا ہے، ''دادی کے پاس جاؤ نہ۔''

مِٹھو گردن گھما گھما کر سب کو دیکھتا اور باتوں کو سنتا رہتا۔ اُس کا جب جی چاہتا، تب وہ ''ببلو، ببلو''، ''نکّی، نکّی'' کی صدائیں بلند کرنے لگتا۔ بچے اپنا نام سن کر مسرور ہو جاتے۔ لیکن جب کبھی وہ ''دادی، دادی'' پُکارنے لگتا، تب غزالہ ''چُپ'' کہہ کے پنجرے

کونل کے نیچے رکھ کر ٹیپ کھول دیتی۔ پھر وہ تیز دھار کی مار سے بچنے کے لئے پھڑ پھڑاتا ہوا جائے پناہ ڈھونڈ ھنے لگتا، تب اُنھیں لگتا کہ مٹھو کے ساتھ وہ بھی سزا بھگت رہی ہیں۔

زمین اور آدمی حالات سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ لیکن ہوا اپنی مرضی سے رُخ اختیار کرتی ہے۔ بیگم شرجیل احمد نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا ہے۔ پھر بھی بیوگی کی بے بسی اُنھیں سالتی اور شوہر کے ساتھ گزرے ایام یاد آنے لگتے۔ اُن کا گُم صُم رہنا، خود کلامی کرنا، کھڑکی سے لگ کر مہانگر کی بھاگتی دوڑتی زندگی کو دیکھنا، آنکھوں پر بازو رکھے خاموش پڑی رہنا اور نکی، ببلو کو بیتے دنوں کے واقعات سنانا غزالہ کو پھوٹی آنکھ نہیں بھاتا۔ اُس کی آنکھیں سی سی ٹی وی کیمرے سا بیگم شرجیل احمد کی حرکات و سکنات کو ریکارڈ کرتی رہتیں۔ اُس نے شوہر کو بتا اور دِکھا کر قائل کر دیا تھا کہ اُن کی ماں ذہنی مریضہ ہیں۔

اُس شام میاں بیوی میں بہت دیر تک تکرار چلی تھی۔ پھر تمثیل احمد ماں کو ایک پیکٹ پکڑاتے ہوئے بولا، ''امّی! باس کی بیٹی کا برتھ ڈے ہے۔ اُنھوں نے آپ کو بھی ساتھ لانے کی تاکید کی ہے۔ جلدی سے تیار ہو جائیے۔''

کمرے سے نکلتے وقت وہ بیوی سے ٹکرا گیا تھا۔

بیگم شرجیل احمد گود میں پیکٹ رکھے بیٹھی رہیں۔ ماں کا کمرہ مسلسل کھلا دیکھ کر وہ پھر اندر گیا۔ اُنھیں گُم صُم دیکھ کر وہ جھلّا کر بولا، ''پلیز! تیار ہو جائیے نہ! ویسے بھی کافی دیر ہو چکی ہے۔ مجھے آپ کو ساتھ لے کر ہی جانا ہے۔ میں باس کو ناراض کر کے مصیبت مول نہیں لے سکتا۔ میری مجبوری سمجھئے!'' پھر وہ پاؤں پٹکتا ہوا کمرے سے نکل گیا تھا۔

بیگم شرجیل احمد کے دل میں بیٹے کی پریشانی کا خدشہ پیدا ہو گیا، تب وہ فوراً اُٹھ کر لباس تبدیل کرنے لگیں۔

وہ پہلی بار اُس کار پر پوتا پوتی کے ساتھ بیٹھیں، جس کی قسط اُن کے پنشن سے ادا کی جا رہی ہے۔

پارٹی سے لوٹ کر بیگم شرجیل احمد بہت مسرور تھیں۔ لیکن غزالہ کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اُس نے پہلی بار تذلیل کا کڑوا کسیلا ذائقہ چکھا تھا۔ مسٹر سندیپ ورما اور میڈم سلو جا اُسے بُری طرح نظر انداز کر کے بیگم شرجیل احمد سے تپاک سے ملی تھی۔ ورما جی کومل کو بُلا کر بولے،

''بیٹی! ماتا جی کا چرن اُسپرش کرآشیرواد لو۔ بزرگوں کا آشیرواد اَنمول ہوتا ہے۔ میں نے ماں کے آشیرواد سے ہی پد پرتشٹھا، جن دھن بلکہ سب کچھ پراپت کیا ہے۔ آج میرے پاس سب کچھ ہے، ماں نہیں۔ تم دادی کو مِس کرتی رہتی ہو، اِسی لئے میں نے مسٹر تمثیل کو تاکید کی تھی کہ وہ ماتا جی کو ساتھ لائیے۔ بیٹا! آج سے یہ تمھاری دادی اور ہم لوگوں کی ماتا شری ہیں۔''

بیگم شرجیل احمد مان سمّان پاکر آبدیدہ ہوگئیں۔ جذبات سے مغلوب ورما جی اچانک جھکے اور اُن کے قدموں کو اُسپرش کرنے لگے۔ پھر ماں بیٹی نے ایک ساتھ چرن اُسپرش کرکے ہاتھ ماتھے پر پھیر لیا۔ اُنھوں نے دعائیں دیتے ہوئے بانہیں پھیلا دیں اور تینوں کو سینے سے لگالیا۔ تقریب میں شامل بیشتر لوگ موبائل سے بھی فوٹو کھینچنے اور ویڈیو بنانے لگے تھے۔

کومَل نے کیک کاٹ کر خلافِ توقع پہلا ٹکڑا دادی کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ پھر ہیپّی برتھ ڈے کا نغمہ پھوٹا، بیلون پھوڑے جانے لگے۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ اور مبارک بادی سے پورا ہال گونجنے لگا تھا۔ بیگم شرجیل احمد نے کیک کو ٹونگ کر فوراً اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا، تب کومَل نے کیک کا ایک ایک ٹکڑا ہاتھوں میں لے کر ایک ساتھ پاپا ممی کے ہونٹوں سے سٹایا تھا۔ پھر باضابطہ کیک کی تقسیم ہوئی۔ کومَل اپنے دوستوں کے ساتھ نکلی، بلو کو بھی ساتھ لئے اِدھر اُدھر پھرنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مہمان گپ شپ کرتے ہوئے کھانے پینے لگے تھے۔

اپنے ساتھ کھانا کھلاکر سُلو جا، بیگم شرجیل احمد کو گھر دِکھانے لے گئی۔ وہ اپنے کمرے میں اُن سے دیر تک باتیں کرتی رہی۔ پھر اُنھیں قیمتی گرم شال کا تحفہ دیا۔

غزالہ نے گھوم ٹہل کے اُنھیں ہنستے بولتے ہوئے دیکھ سن لیا تھا۔

دوسرے ہی دن صبح تمثیل احمد ماں سے یہ کہہ کر نکلا کہ وہ ڈاکٹر اے کے وشواس کے یہاں نمبر لگانے جارہا ہے۔

تمثیل احمد کار کھڑی کرکے سیدھے ماں کے کمرے میں گیا اور نرم لہجے میں بولا،

''امّی! جلدی سے تیار ہوجائیے۔ بڑی مشکل سے چھٹی لے کر نمبر لگایا ہے۔''

بیگم شرجیل احمد کو غزالہ کی چال سمجھتے دیر نہیں لگی۔ پھر اُن کے صبر وضبط کا باندھ

ٹوٹ گیا۔ وہ بولیں، ''بیٹا! یہ کوئی بیماری نہیں۔ فقط گزرے ایّام کو پھر سے جینے کی تمنا اور اُن سے محظوظ ہونے کا ایک فطری عمل ہے۔ اِسے تم فراریت یا تلاشِ سکون بھی کہہ سکتے ہو۔ ماضی کو کریدنے کی یہ لت مجھے تمھارے والد کی موت کے بعد لگی ہے۔''

پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولیں، ''اگر دُلہن یہ سمجھتی ہے کہ میں بچوں کے ذہن میں الّم غلّم بھر رہی ہوں اور اُس کے گھر پریوار پر تسلط جمانا چاہتی ہوں یا پھر اپنے گھر جیسا مالکانہ حق کے ساتھ میں رہنا چاہتی ہوں، تو مجھے گاؤں پہنچا دو۔ آج بھی مہانگر سے گاؤں اچھا ہے، جہاں اُنس ومحبت، اخلاق ومروّت اور ایثار واخلاص باقی ہے۔ ممبئی کی مشینی زندگی مجھے راس نہیں آرہی ہے۔ جذبات سے عاری، عدیم الفرصت، بھاگتا ہوا انسان......''

تمثیل احمد قطع کلام کرتے ہوئے بولا، ''امّی! آپ کی سوچ پر میں حیران ہوں۔ آپ نے خواہ مخواہ غزالہ کے خلاف دل میں بغض عناد پال رکھا ہے، جب کہ وہ آپ کی خاطر تواضع میں پیش پیش رہتی ہے۔ وہ پہلے آپ کو کھلاتی پلاتی ہے۔ اُسی نے مجھ سے آپ کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا عمدہ انتظام کروایا ہے۔ اُسی کے دباؤ میں واٹر پاٹ، کولر اور ٹی وی لایا ہوں۔ وہ آپ سے بات چیت نہیں کرتی لیکن وہی آپ کی ضرورتوں کا پورا خیال رکھتی ہے۔ اگر وہ نہیں چاہے گی، تب آپ نکی، ببلو کی صورت دیکھنے کے لئے بھی ترس جائیں گی۔ آپ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے! اُس نے روایتی بہو کی طرح آپ سے تو تو مَیں مَیں نہیں کیا ہے اور نہ مجھے ہی آپ کے خلاف کبھی بھڑکایا ہے۔ پھر بھی آپ کو شکایت ہے؟ تو کھل کر کہئے نہ! ہم لوگ اُس کا حل بھی نکال ہی لیں گے۔'' اُس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

بیگم شرجیل احمد ہکّا بکّا لختِ جگر کو دیکھنے لگیں، تب وہ نرم لہجے میں بولا، ''امّی! آپ جانتی ہیں، غزالہ صفائی پسند ہے اور اُس کی سب سے بڑی کمزوری بچے ہیں۔ اُسے فکر لگی رہتی ہے کہ کہیں اُن کا ریجلٹ خراب نہ ہو اور ذہن میں فالتو باتیں گھر نہ کر جائیں...... اور یہ کیا کہہ دیا آپ نے؟ گاؤں پہنچا دوں؟ یعنی آپ یہ چاہتی ہیں کہ گاؤں والے اور رشتے دار آپ پر ترس کھائیں اور مجھ پر تھوکیں۔ امّی! دل پر ہاتھ رکھ کر کہئے! یہ سکھ سویدھا آپ کو وہاں مل پائے گی؟ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں، نہیں، ہرگز نہیں......''

ماں کے متغیر ہوتے چہرے کو دیکھ کر تمثیل احمد یوٹرن لیتا ہوا بولا، ''امّی! ہم لوگ

جانتے ہیں کہ آپ بالکل صحت مند ہیں۔ اِسی لئے فیزیشین کو دِکھانے نہیں لے جار ہا ہوں۔ صرف ایک کھٹکا ہے، جسے وقت رہتے ہم لوگ دل سے نکالنا چاہتے ہیں کہ ابّا کی موت نے کہیں آپ کے ذہن پر منفی اثر تو نہیں ڈالا؟''

بیگم شرجیل احمد اُٹھ کھڑی ہوئیں، تب اُس نے انتہائی نرم لہجے میں کہا، ''امّی! فریش ہو کر لباس تبدیل کر لیجئے۔''

وہ بھڑک کر بولیں، ''میں کسی تقریب میں نہیں جا رہی ہوں۔''

پردے کی اوٹ میں کھڑی غزالہ کے لوٹتے قدموں پر نظر پڑتے بیگم شرجیل احمد احساسِ شکست خوردگی سے لہولُہان ہو گئیں۔

ویز یٹرس روم میں بیگم شرجیل احمد کی آنکھیں گردش کرتے ہوئے روبرو بیٹھی ایک دوشیزہ پر مرکوز ہو گئیں، جس کا ایک ہاتھ پکڑے اُس کی ماں بیٹھی تھی۔ وہ اُٹھ کر اُس کی ماں کے پہلو میں جا بیٹھیں، تب وہ لڑکی ایک نظر اُنھیں دیکھ کر ماں سے بولی، ''ماں! تم اِدھر آجاؤ۔ میں بیچ میں بیٹھوں گی۔''

ماں کسمسا کر اُٹھی۔ وہ جگہ تبدیل کر کے پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کے بیٹھ گئی، تب وہ لڑکی دوسرا ہاتھ بیگم شرجیل احمد کے زانو پر رکھ کر بے تکلفی سے بولی، ''اِسے آپ پکڑ لو۔''

بیگم شرجیل احمد پس و پیش میں پڑ گئیں۔ اُن کا تجسس اُنھیں اُٹھا لایا تھا۔ دراصل وہ یہ جاننا چاہتی تھیں کہ ایک تندرست لڑکی کو نفسیاتی معالج کے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟

اُنھیں گُم صُم دیکھ کر وہ اُن کے زانو کو تھپ تھپا کر ملتجی لہجے میں بولی، ''پلیز! خوب کس کے پکڑیئے گا۔''

پھر وہ قہقہے لگا کر آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولی، ''لیکن اب میں بھاگوں گی نہیں۔''

وہ سب کی مرکزِ نگاہ بن گئی تھی۔ اُس کی ویران آنکھوں میں بیگم شرجیل احمد کو بگولے اُڑتے نظر آئے۔ وہ اُکتا کر اُن کی ہتھیلی پر ہاتھ رکھ کر بولی، ''اب پکڑ بھی لیجئے نہ۔''

اُس کی ماں نے فوراً التجا کی، ''بہن! اِس کی بات مان لیجئے ورنہ یہ طوفان مچا دے گی۔ خود اپنا چہرہ اور بالوں کو نوچنے لگے گی۔''

گھبرا کر اُنھوں نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا، تب وہ قہقہے لگاتے ہوئے

ایک جھٹکے سے کلائیوں کو چھڑا کر بولی، ''میں عورت ہوں۔ لیکن کمزور نہیں۔ مجھ پر قابو پانا آسان نہیں۔ میں شیرا والی ہوں۔ سُمر پن کو کمزوری مت سمجھنا...... تم سب شریر کو قیدی بنا سکتے ہو، آتما کو نہیں۔ آتما تو ایک پنچھی ہے، جو اُڑ جاتی ہے، پھُر......'' پھر وہ مسلسل قہقہے لگانے لگی۔

اُس کی ماں پھُس پھُسا کر بولی، ''بہن! اِس کی باتوں کا بُرا نہیں مانئے گا۔ یہ بہت نیک اور سیدھی سادی لڑکی تھی۔ اِس کی سُندرتا نے ہی اِسے برباد کر دیا۔ پریم میں دھوکھے کھا کر یہ وِچھپت ہو گئی ہے......''

وہ قطع کلام کرتے ہوئے بولی، ''چُپ رہو! کچھ نہ کہو۔ تم سب نے سازش رَچ کر اُس کی ہتیا کرا دی ہے۔ اب مجھے پَرلوک جا کر اُس سے ملنا ہے۔ بولو! کب تک روک پاؤ گی مجھے؟''

پھر وہ دیدے مٹکاتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں بولی، ''پکڑو میرا ہاتھ۔''

اُس کی ماں نے فوراً ہاتھ پکڑ کر اُنھیں بھی ہاتھ پکڑ لینے کا اشارہ کیا۔ لیکن وہ خاموش بیٹھی رہیں، تب وہ پھر زانو تھپ تھپاتے ہوئے بولی، ''موسی! پکڑو نا میرا ہاتھ۔''

اُنھوں نے بے دِلی سے اُس کی کلائی پھر پکڑ لی۔

تھوڑی دیر بعد تمثیل احمد لپکتا ہوا آیا اور بولا، ''امّی! جلدی سے چلئے۔ نمبر آ گیا ہے۔''

وہ فوراً اُس کا ہاتھ چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں، تب وہ لپک کر اُن کا ہاتھ پکڑ کے بولی، ''نہیں! مجھے چھوڑ کر مت جاؤ موسی! میں ایک عورت ہوں۔ اکیلی، بے سہارا۔ کمزور، بہت کمزور...... مجھے سہارا چاہئے......''

بیگم شرجیل احمد ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کے آگے بڑھ گئیں۔ لیکن اُس کی التجا، صدائے بازگشت کی طرح فضا میں گونجتی رہی۔

آگے آگے چلتے ہوئے بیٹے کو دیکھ کر بیگم شرجیل احمد نے سوچا کہ وہ لڑکی سچ بول رہی ہے۔ اکیلی، بے سہارا عورت کمزور ہوتی ہے۔ عورت کو تاعمر مرد کا سہارا چاہئے۔ ضعیف و ناتواں شوہر بھی قوت کا منبع ہوتا ہے اور تحفظ کا احساس دلاتا ہے۔ گھر سے باہر اُنگلی پکڑے ساتھ چلتا بچہ بھی مرد کا متبادل بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر اے کے وشواس ساحر صفت تھا۔ امّی جان! کہہ کر وہ بیگم شرجیل احمد سے سوال پوچھتا رہا اور وہ سحر زدہ سی بولتی رہیں۔ چند منٹوں میں ہی اُس نے سینے سے دفینہ نکال لیا تھا۔

چیمبر میں لوٹنے سے قبل اُس نے کہا، ''امّی جان! آپ بالکل صحت مند ہیں۔ لیکن ذہنی تناؤ میں رہتی ہیں۔ دوا وقت پر کھایئے گا، اِس سے آرام ملے گا اور گہری نیند بھی آئے گی۔''

بیگم شرجیل احمد بولیں، ''بیٹا! تم نے امّی کہہ کر مجھے ماں بنالیا ہے۔ اب تم پر ماں کی مدد کا فرض لازم ہو گیا ہے۔ میں بڑی اُمید لے کر آئی ہوں۔ میری مدد کرو۔'' اُن کی نگاہیں ڈاکٹر پر مرکوز ہو گئیں۔

''امّی جان! کیسی مدد چاہیے؟'' اُس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

بیگم شرجیل احمد بولیں، ''چیمبر میں بیٹھا میرا اکلوتا بیٹا، تمثیل احمد ہے۔ میرے شوہر بہار سرکار میں اَفسر تھے۔ وہ دل کے مریض تھے۔ پچھلے سال اُن کی موت ہو گئی۔ میرا بیٹا نیک اور سیدھا سادا ہے۔ لیکن بیوی کے چنگل میں بُری طرح پھنسا ہوا ہے۔ بیوی اِس کی چاہت وضرورت اور ماں کو ساتھ رکھنا اِس کی مجبوری ہے۔ میں باقی ماندہ زندگی گاؤں میں گزارنا چاہتی ہوں تا کہ میرا بیٹا بھی بال بچوں کے ساتھ پُرسکون زندگی جی سکے۔ بیٹا! گاؤں میں میرا گھر اور چاہنے والے لوگ ہیں۔ تمھاری مدد سے گھر واپسی ہو سکتی ہے۔''

''امّی جان! میں کوشش کرتا ہوں۔'' اُس کا لہجہ پُرعزم تھا۔

بیگم شرجیل احمد کو ویزیٹرس روم میں بھیج کر ڈاکٹر وشواس تمثیل احمد سے بولے، ''اِن کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ اِن پر کبھی بھی پاگل پن کا دورہ پڑ سکتا ہے یا ذہنی تناؤ سے دماغ کی نس پھٹ سکتی ہے۔ مسٹر تمثیل! جتنی جلدی ہو سکے آپ اِنھیں کسی ہل اسٹیشن کی سیر کرا لایئے۔ میں اکیس دنوں کی دوا لکھ رہا ہوں اور بائیسویں دن کا کنفرم ڈیٹ دے رہا ہوں۔''

گھر لوٹتے وقت تمثیل احمد ذہنی عذاب میں مبتلا تھا۔ اُسے بیوی پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ مسئلہ پیدا کرتی ہے اور حل اُسے نکالنا پڑتا ہے۔ اُس نے بار بار تلوار کی دھار پر اُسے چلایا ہے۔ امّی کا وجود کتنا اہم ہے، وہ نہیں جانتی۔ پُرعیش زندگی اُن ہی کا عطیہ ہے۔

اُسے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ وہ گھر پہنچ کر بیوی سے بولا، ''تمھارے سبب آج میں ایک بڑے خرچ میں پڑ گیا ہوں۔ ڈاکٹر نے امّی کے سامنے ہی اُنھیں فوراً سے پیشتر کسی ہِل اسٹیشن لے جانے کی تاکید کی ہے۔ اِس مسئلے کا حل تمھیں ہی نکالنا ہے۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔ اتنا بڑا خرچ برداشت کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔''

غزالہ خشک لہجے میں بولی، ''آپ کی ماں کا دَم گاؤں میں اُٹکا ہوا ہے، گاؤں لے جائیے۔ لیکن ایک شرط ہے۔ اگر وہ نہ آنا چاہیں تو گھسیٹ کر نہیں لانا ہے۔ ورنہ......'' اُس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

تیر نشانے پر لگا۔ وہ فوراً ماں کے کمرے میں جا کر بولا، ''امّی! اِن دنوں اکثر ابّا مرحوم میرے خواب میں آ رہے ہیں۔ کیوں نہ ہفتہ دس دنوں کے لئے ہم دونوں گاؤں چلیں۔ گھر کی صاف صفائی ہو جائے گی، آپ کا دل بہل جائے گا اور قرآن خوانی کے بعد فقیروں کو کھانا بھی کِھلا دیں گے۔''

اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں۔ بیگم شرجیل نے حامی بھر دی۔

تمثیل احمد سفر کی تیاری میں لگ گیا۔ نگّی، ببلو اُفسردہ، طوطا گُم صُم، بیگم شرجیل احمد پُرسکون اور غزالہ مسرور رہنے لگی۔

غزالہ کار نکال کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی رہی۔ بیگم شرجیل احمد نمازِ فجر پڑھنے لگیں۔ تمثیل احمد سامان لئے بچوں کے ساتھ باہر نکلتا ہوا بولا، ''امّی! جلدی کیجئے نہ۔ غزالہ کو تنہا بچوں کے ساتھ گھر لوٹنا ہے۔''

بیگم شرجیل احمد نماز پڑھ کے اُٹھیں اور پنجرے کا در کھول کر بولیں، ''ساتھی قیدی! تم بھی آزاد ہو جاؤ۔۔''

●

(ماہنامہ 'زبان و ادب'، پٹنہ، جلد۔ ۳۹، شمارہ۔ ۲، فروری، ۲۰۱۸ء، ماہنامہ 'شاعر'، بمبئی، جلد۔ ۸۸، شمارہ۔ ۱۲-۱۱، نومبر۔ دسمبر ۲۰۱۷ء (تاخیر سے شائع) اور ماہنامہ 'اُردو آنگن'، ممبئی، جلد۔ ۲، شمارہ ۱۰، اپریل ۲۰۱۸ء میں شائع) اور ماہنامہ 'ندائے گل'، لاہور، پاکستان، سالنامہ۔ ۲۰۱۸-۲۰۱۹، جلد۔ ۶، شمارہ ۲۰، ستمبر ۲۰۱۹ء

مردم گزیدہ

دیوالی کی خریداری کرکے اَجئے ، مِناکشی ، شبنم اور سومِت گھر لوٹے تو سب سے پہلے مِناکشی کی نظر شناسا گٹھڑ پر پڑی۔ اُس نے فوراً ساوتری سے پوچھا، ''دلشاد کب آیا؟''

''آپ لوگوں کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد بھیّا جی آئے تھے۔ چائے پانی کے لئے پوچھا تو بولے، ابھی نہیں، بہن کے ساتھ، پھر وہ ترّت چلے گئے۔'' ساوتری کا چہرہ خنداں اور آواز مسرّت سے لبریز تھی۔

شبنم اور سومِت پٹاخوں کے ڈبّے لئے اپنے کمرے میں چلے گئے ۔ مِناکشی تھیلوں کو دانستہ صوفے پر رکھ کر دھم سے بیٹھ گئی۔ اَجئے کار گیراج میں لگا کر آیا اور سنگل صوفے پر جا بیٹھا۔

دونوں کے چہرے پر تھکان سے زیادہ ناراضگی عیاں تھی۔ ساوتری کو یہ سمجھتے دیر نہیں لگی کہ آج بھی دونوں کا موڈ خراب ہے۔ اُسے کوفت ہونے لگی۔ اُس نے سوچا کہ دونوں اچھے موڈ میں گھر سے نکلتے ہیں۔ لیکن واپسی پر اکثر اُن کے چہرے پر کھیج اور پچھتاوا جھلکتا ہے۔ اُس کے ذہن میں اپنا گھر پَریوار رقص کر گیا۔ اُس کی آنکھوں میں وہ رات مجسّم و متحرّک ہو گئی۔ بابو جی شراب پی کر آئے تھے۔ اُنھوں نے خوب اُودھم مچایا اور ماں کو بے رحمی سے مارا پیٹا بھی تھا۔ لیکن جب وہ سِسکتے ہوئے کھانا پروس رہی تھی، تب اُنھوں نے نرمی سے پوچھا تھا، ''چوٹ جادا جور سے تو نہیں لگ گئی تھی؟ ماں آنسو پونچھ کر بولی، ''کوئی کھاس نہیں۔'' وہ حیرت سے ماں کو دیکھنے لگی تھی۔ بابو جی کی ہمدردی نے ماں کو جھوٹ بولنے پر

مجبور کر دیا تھا۔ اُس رات دونوں دیر تک کھُسر پھُسر کرتے رہے۔ بالکل بچوں جیسی اُن کی لڑائی اور دوستی۔ کون کیا بولا اور کس نے کیا جواب دیا تھا؟ کسی کو یاد نہیں رہتا۔ لیکن بڑے لوگ ایک دوسرے پر کڑی نظر رکھتے، باتیں پکڑتے اور موقع ملتے بتلاتے جتلاتے بھی ہیں۔

کام کرتے وقت اکثر ساوتری کا دماغ رواں رہتا ہے۔ اُس نے جوسر سے جوس نکال کر گلاس میں رکھا۔ پھر مِناکشی اور اَجے کو پیش کر کے وہ فوراً کچن میں لوٹ گئی۔

گھڑی پر نظر پڑتے مِناکشی کا چڑھا پارہ سیڑھیاں اُترنے لگا۔ اُس نے جوس پیتے ہوئے اندازہ لگایا کہ دلشاد تقریباً ساڑھے پانچ بجے آیا ہوگا۔ وہ بھوکھا ہوگا۔ چائے ناشتہ کے فوراً بعد وہ کھانا ٹھیک سے نہیں کھا پائے گا۔ اُس نے طے کیا کہ آتے ہی اُسے کھانا کِھلائے گی۔

جوس پی کر مِناکشی سیدھے کچن میں گئی۔ ساوتری کھانا بنا کر کچن صاف کر رہی تھی۔ وہ تیار کھانوں کا جائزہ لے کر بولی، ''اچھا کیا پالک پنیر اور زیرہ رائس بنا لیا۔''

ساوتری لہک کر بولی، ''بھیّا جی کو پسند ہے، اِسی لئے بنا دیا۔''

ساوتری کے مسرور چہرے کو دیکھ کر مِناکشی نے سوچا کہ پریم خود رو پودے کی طرح کہیں بھی جڑ جما لیتا ہے۔ اُس نے دودھ کی پتیلی کا ڈھکّن اُٹھا کر دیکھا۔ پھر وہ ساوتری سے بولی، ''سب سے پہلے ایک لیٹر دودھ لے کر آؤ۔ اُس کے بعد کھیر کے لئے چاول چُن لینا۔ مونگ کی دال اور کھیر میں بناؤں گی۔''

''آپ بھیّا جی سے حال سماچار پوچھئے گا۔ بڑے دن بعد وہ آئے ہیں۔ دال اور کھیر ہم بنا دیں گے۔''

''نہیں۔ تم جانتی ہو اُسے میرے ہاتھوں کا بنا پسند ہے۔''

''دیدی! جس طرح آپ بناتی ہیں ٹھیک اُسی طرح بناؤں گی۔ دیکھ لیجئے گا کہ بھیّا جی پکڑ نہیں پائیں گے۔''

''نہیں! تم سے اور بھی کام لینا ہے۔ تم چادر اور پلو گور بدل کر نیا والا نِٹ لگا دینا۔ ڈینگو کا مرض پھیلا ہوا ہے۔'' اُس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

وہ کام سونپ کر کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔

کچن میں قدم رکھتے سب سے پہلے مِناکشی نے فریج کھولا۔ دہی دیکھ کر وہ خوش

ہوگئی۔ٹرے میں ہری مرچ، نیبو، چکندر، گاجر، کھیرااور مولی یعنی سلاد کی تمام چیزیں تھیں۔ ریک پر رکھے مرتبان میں ماں کے ہاتھوں کا بنا آنولہ، ثوت اور کروندے کا اچار تھا۔اُس نے دھڑکتے دل سے پاپڑ کا ڈبّہ کھولا۔ سابودانہ اور مونگ کے پاپڑ اور مسالے دار تِلوری دیکھ کر اُس کا چہرہ کِھل اُٹھا۔ پھر وہ منصوبہ بنانے لگی۔ ساوتری کے ہاتھوں کے بنے اور تلے پاپڑ اور تِلوری دلشاد کو بہت پسند ہے۔ کھانا پروسے جانے کے بعد ساوتری سے ہی اِنھیں تلواؤں گی۔ رائتا اور دہی بڑا تو وہ مانگ مانگ کر کھاتا ہے۔ رائتا کا سامان بھی ہے، اِسے بنا دیتی ہوں۔ کلا کند لیتی آئی ہوں۔ اُرد کی دال اور مسالہ ہے۔ دہی بڑا کل بناؤں گی۔ سمَے بہت ہوگیا ہے۔ آج اتنا ہی ٹھیک ہے۔ بھوک مرجائے گی تو وہ چاہ کر بھی کھا نہیں پائے گا۔

کچن کے کاموں سے فراغت پا کر مِناکشی بیڈ روم میں گئی تو دیکھا، اَجے چینل بدل بدل کر نیوز دیکھنے میں مگن ہے۔ اِس عیش پر اُس کا غصّہ اُلٹے پاؤں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ پھر بھی وہ خاموش کھڑی رہی۔ اُسے لگا کہ وہ جان بوجھ کر انجان بنا اُس کی موجودگی کو نظر انداز کر رہا ہے۔ وہ سوچ رہا ہوگا کہ مہمان اُس کا ہے۔ اِسی لئے سواگت ستکار کی ذمّہ داری اُسی پر ہے۔ یہ بدلے چکا رہا ہے۔ اُس نے حقارت سے اَجے کو دیکھتے سوچا کہ بچوں پر پڑھنے لکھنے کا تغلقی فرمان جاری کر کے یہ خود ٹی وی پر قبضہ جمالیتا ہے۔ ڈِسکوری سے تو اِس کا جی نہیں بھرتا۔ معصوم جانوروں کو چیڑ پھاڑ کر کھاتے درندوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ سِڈیسٹ......

اَجے چور نگاہوں سے مِناکشی کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ آج ڈائننگ ٹیبل کو سجایا جائے گا۔ اِس کے پاس اپنوں کے لئے ہی جذبہ، خواہش، پیسہ، وقت اور مستعدی یعنی سب کچھ ہے۔ اُس کے ذہن میں ماضی کے کئی تلخ واقعات پھُپکارنے لگے۔ یہ احساس اُسے اذیّت دینے لگا کہ وہ چاہ کر بھی اپنے گھر والوں کے لئے اِس سے کچھ نہیں کروا پاتا ہے۔ رشتے دار اُس کی لاچاری جان گئے ہیں۔ اِسی لئے گھر سے باہر بھینٹ ملاقات کرتے اور اچھی بُری خبریں موبائل فون پر دیتے ہیں۔ روتی ہوئی گاؤں لوٹی ماں نے اِس گھر میں پھر قدم نہیں رکھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ اب تک اِسی لئے کھڑی ہے کہ وہ چاہ رہی ہے، گھر کا ماحول خوشگوار لگے۔ اچانک اُس کے دل میں یہ خیال آیا کہ وہ بانھیں پکڑ کے کہے، مطلبی عورت! میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ بِنا بھید بھاؤ مہمانوں کا کھلے دل سے سواگت ستکار ہو۔

وہ اپنا رزق کھاتے ہیں۔ اُن کے نصیب سے ہی گھر والے بھی اچھا کھا پی لیتے ہیں۔ خوشگوار گھریلو ماحول سب کو اچھا لگتا ہے۔ لیکن وہ گردن گھما کر بولا، ''تمھارے چہرے سے خوشی، ہرسنگار کے پھول کی طرح جھر رہی ہے۔ سچی خوشیاں تو میکے والے ہی دے پاتے ہیں۔'' وہ جلدی جلدی چینل بدلنے لگا۔

مِناکشی کی اَفسردگی بڑھ گئی۔ اُس نے سوچا کہ اِس آدمی سے رتّی بھر خوشی دیکھی نہیں جاتی۔ موقع ملتے ہی بدلے چکانا چاہتا ہے۔ وہ دَھم سے بستر پر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ اَجئے پہلے جیسا نہیں رہا۔ اِس کے پریم میں اب وہ دیوانگی اور چاہت میں وہ خلوص نہیں رہا۔ اب یہ اُسے 'نازنین'، 'ملکہء حسن'، 'راحتِ روح'، 'لیلیٰ'، 'سونی' اور 'جانو' جیسے القاب سے مخاطب نہیں کرتا۔ اب یہ سزا یافتہ قیدی کی طرح مجبور اًپتی اور پتا کا فرض نبھا رہا ہے......

خاموشی، مَہیب سناٹے میں تبدیل ہونے لگی، تب اَجئے گردن گھمائے بغیر بولا، ''تمھارا بھائی بہت دنوں بعد دیپاولی کے اَوسر پر آیا ہے، کیا خاص بنوا رہی ہو؟''

مِناکشی کو لگا کہ اَجئے اِرشالو بچے کی طرح پھونک مار کر آنند دیپ کو بجھا دینا چاہتا ہے۔ اُس کے ذہن میں شادی کے بعد گاؤں میں گزارے ایام، کالے دیو کا روپ دھارن کر قہقہے لگانے لگے۔ دیو کا جسم جنگلی بھینسا جیسا، ناخن بھالو جیسے، گوریلا جیسے بدرنگ مٹ میلے دانت اور کچڑ اچنتی بچی سارو کھے سوکھے بال۔ پھر وہ اَجئے کا جائزہ لینے لگی۔ اِس کا جسم متناسب، ناخن تراشے ہوئے، دانت صاف ستھرے چمکیلے، زُلفیں سنوری ہوئیں اور چہرہ معصوم و دلکش۔ اُس نے تڑپ کر سوچا، لیکن کتنا برعکس ہے اِس آدمی کا سُبھاؤ۔ مکڑی اپنے کمزور تاروں سے جکڑ کے کیڑے مکوڑے کو قابو میں کرلیتی ہے۔ لیکن وہ اپنی سُندرتا، سَمرپن، سیوا اور سہیوگ کے مضبوط ریشمی دھاگوں سے اِسے باندھ نہیں پائی۔ آج بھی اِس کے من آنگن میں گاؤں آباد ہے۔ یہ گھر پَریوار سے دور ہوا ہے، الگ نہیں۔ صرف میں، بچوں کے ساتھ نکل آئی ہوں اُس یاتنا گریہہ (عُقوبت خانہ) سے۔ یہ میرے سپنوں کا گھر نہیں، ریلوے کا ویٹنگ روم ہے۔ میں جیون پتھ پر بچوں کو کندھوں پر لئے تپتی ریت پر ننگے پاؤں چل رہی ہوں۔ اُس نے پھر حقارت بھری نظروں سے اَجئے کو دیکھا۔

مِناکشی کے ذہن میں خریداری میں گزرے پَل تازہ ہوگئے۔ پٹاخوں اور پھلجھڑیوں

کے ڈبّوں کو چُن چُن کر چھانٹتے ہوئے اِس نے پوچھا تھا، ''کسی کو دینا، بھیجنا بھی ہے؟''
مٹھائی خریدتے سمے بھی اِس نے ٹوکا تھا، ''بس ہوگیا؟'' میری چتّی سے اِس کا منصوبہ فیل
ہوگیا تھا۔ پھر اُسے لگا کہ نہیں، ایسا ہو نہیں سکتا۔ وہ بے کار خوش ہو رہی ہے۔ پٹاخے اور
روپے گھر والوں کو یہ پہلے ہی بھجوا چکا ہوگا، بہت شاطر ہے۔ اپنے کسی کاموں کی بھنک تک
لگنے نہیں دیتا۔ لاک موبائل فون کو بھی سینے سے لگائے رکھتا ہے۔ لیکن وہ بھی کم نہیں، سُراغ
لگا ہی لیتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ وہ جب گاؤں جاتا ہے، تب تھیلے بھر بھر کر سامان لے جاتا
ہے۔ وِدھوا بہن کے کھاتے میں ہر ماہ موٹی رقم ڈالی جاتی ہے۔ بابو جی کی بیماری اور شرادھ
میں اِس نے اے ٹی ایم کا منہ کھول دیا تھا۔ یہ آدمی ایک ساتھ دو جیون جی رہا ہے۔ اِسی لئے
چھٹپٹاتا، شبد بان چلاتا اور خود کو بھی کوستا، گالیاں دیتا رہتا ہے۔ اُس کا جی چاہتا ہے، اِسی سمے
پوچھوں کہ مرتے دم تک گھر والوں کی سیوا کرنی ہے، تو شادی کیوں کی؟ کس نے اَدھیکار
دیا تھا، ایک نِردوش کے جیون کو نرک بنانے کا؟ کیوں بات کا بتنگڑ بنا کر غرّاتے ہو؟ بے چارہ
کہلانا چاہتے ہو۔ بچے بھی اُوب چکے ہیں آئے دن کے جھگڑوں سے۔ وہ بھی اپنی دنیا میں
مگن رہنے لگے ہیں، تمھارے کارن۔ اِس سمے یہی جتلانا چاہتے ہو کہ ایسی خوشی تمھارے
گھر والوں کو دیکھ کر میرے چہرے پر نظر نہیں آتی ہے۔ اِسی طرح میں اُن کا سواگت ستکار
نہیں کرتی۔ تو سنو مسٹر اَجے! میں نفرت کرتی ہوں تم سے، تمھاری ماں، بہن سے اور اُن
سب سے، جنھیں تم چاہتے ہو......

اچانک اُسے ماں کی کہی بات یاد آگئی، ''پَرادھین ناری نِربل اور کماؤ مرد اَہنکاری
ہوتا ہے۔ اَجگر ہر سمے شکار نہیں کرتا، ساہل جیون رکچھا میں کانٹے کھولتا اور کچھوا خطرہ بھانپتے
گردن کھینچ لیتا ہے۔'' اُس نے یلغار کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اُسے لگا کہ اِس وقت وہ جنگ ہار
جائے گی۔ دلشاد بھی اُسے ہی سمجھانے بجھانے لگے گا۔ وہ نرم لہجے میں بولی، ''لوٹنے میں دیر
ہوگئی۔ ساوتری نے پالک پنیر اور زیرہ رائس بنا لیا تھا۔ میں صرف کھیر، مونگ کی بھُنی دال اور
رایتا ہی بنا پائی۔ تم جانتے ہو، دلشاد کو میرے ہاتھوں کا بنا یہ سب بہت پسند ہے۔''

''اچھا ہوا کہ دلشاد آگیا۔ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اب دو چار دنوں تک
تمھارے ہاتھوں کا بنا کھانا کھا پاؤں گا۔'' اُس لہجہ استہزائیہ تھا۔

مِناکشی خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔ اُسے لگا کہ اُس نے کھانا بنانے کی ذمہ داری ساوتری کو سونپ دی ہے، اِسی بات کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ چنا، سرسوں، بھتوئے کا ساگ، مکئی اور چاول کی روٹی، چھوٹی مچھلی، کونی کی کھیر، کدم، آنولہ، دھنیا کی چٹنی کے شوقین اِس دیہاتی کو میرے ہاتھوں کا کھانا پسند نہیں بلکہ مجھے بیل کی طرح کھٹتے ہوئے دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ اُس نے سخت لہجے میں پوچھا، ''کیا میں نے کھانا بنانا بالکل چھوڑ دیا ہے؟ اب میں کچن میں پاؤں نہیں رکھتی؟''

''مینو! میں تو مذاق کر رہا تھا۔ ویسے بھی آج ناراض ہونے کا دن نہیں۔ تمھارا بھائی آیا ہوا ہے......'' دُکھتی رگ پر اُنگلی رکھ کر وہ مسکرایا۔

مِناکشی خشمگیں نگاہوں سے اُسے گھورتی ہوئی بولی۔ ''دل کی بات زبان پر آ ہی گئی نہ۔ ماں کی ممتا تم کیا جانو! صبح سے رات تک مجھے کھٹتے مرتے دیکھ کر ہی ماں نے ساوتری کے باپ کو موٹی رقم تھما کر اِسے بھجوایا ہے۔ تمھارے دل میں اپنوں کے لئے جیسا درد اور جذبہ ہے، ویسا ہی میرے لئے کبھی پیدا ہوا؟ نہیں نہ؟ اور ہوگا بھی نہیں۔''

اَجئے نے خود کو سمجھایا کہ اب یہ بھولی بھالی گاؤں کی گوری نہیں رہی بلکہ ایک تجربہ کار، حاضر جواب اور چالاک عورت بن چکی ہے۔ اِس سے پنجہ لڑانا اور اپنی بات منوا لینا آسان نہیں رہا۔ پھر اُس نے شہہ مات سی چال چلتے ہوئے نرم لہجے میں کہا، ''میرا مطلب یہ تھا کہ آج میں تمھارے ہاتھوں کی بنی چیزیں بھی کھاؤں گا۔''

پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولا، ''مینو! دلشاد کو بھائی بنا کر تم نے بہت ہی اچھا کام کیا کہ بچوں کو ماما اور مجھے بھی دل لگی کے لئے سالا مل گیا۔ پہلے تو مجھے لگا تھا کہ وہ تمھیں بہن بنا کر لوٹ رہا ہے۔ لیکن بعد میں احساس ہوا کہ وہ تم سے بزنس نہیں کرتا بلکہ نمونہ چیزیں ڈھونڈ کر لاتا اور کہانیاں گڑھ کے کم قیمت بتاتا ہے تاکہ تم اُنھیں لے سکو۔ بہت نیک، حسّاس اور جذباتی ہے تمھارا بھائی۔ وہ ضرور بچوں کے لئے کچھ لانے گیا ہے۔''

تیر نشانے پر لگا۔ توصیفی کلمات اور میٹھے بول کا عورت پر مثبت اثر پڑتا ہے۔ جذبات سے مغلوب مِناکشی کی آنکھیں پُرآب ہوگئیں اور اُس کا غصہ نقلی صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ اَجئے کے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی۔ ٹی وی آف کر کے وہ بولا، ''ملکہء

حسن! تمھاری آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیر رہے ہیں۔'' اُس نے مدّتوں بعد دانستہ ملکہء حسن کہا تھا۔

مِناکشی کے کانوں میں القاب رس گھولنے لگا۔ وہ اور بھی جذباتی ہوگئی۔ قدرے توقف کے بعد وہ بولی، ''بھگوان کی لیلا عجیب ہے۔ مجھے راکھی باندھنے کا شوق اور تمھیں سالہ سالی سے چھیڑ چھاڑ کا ارمان ہے۔ میں نے دلشاد کو بھائی بنا کر سب کی مَنو کامنا پوری کر دی۔ دیکھتے نہیں! وہ بچوں پر جان چھڑکتا، مجھے بہن، بہن کہتے نہیں تھکتا اور تمھارے کسی مذاق کا بُرا نہیں مانتا ہے۔ وہ کبھی خالی ہاتھ نہیں آتا۔ اجو! میرا دل کہتا ہے، یہ میرے پُروجنم کا بھائی ہے......''

''ماما جی آگئے۔'' کہتے ہوئے شبنم اور سومت کمرے سے دوڑ پڑے۔

اَجئے اور مِناکشی بھی استقبال کے لئے لپک کر کمرے سے نکلے۔ دلشاد نے تپاک سے دونوں کو سلام کیا۔ پھر مِٹھائی اور پٹاخوں کے ڈبّوں کو ٹی ٹیبل پر رکھ کر وہ اَجئے کے سینے سے تادیر لگا رہا۔

پیٹھ تھپ تھپاتے ہوئے اَجئے بولا، ''کشمیر جانے سے بچ گیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ بہن بھائی میں اَن بن ہوگئی ہے۔ اِسی لئے سالے صاحب نہیں آرہے ہیں۔ مجھے ہی منا پھُسلا کر لانا اور میل ملاپ کرانا پڑے گا۔''

''ایسا کبھی نہیں ہوسکتا ہے...... حادثہ ہی......'' وہ فوراً خاموش ہوگیا۔

''کیا ہوا تھا؟'' ایک ساتھ مِناکشی اور اَجئے نے پوچھا۔

''اطمینان سے بتاؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ ٹال گیا۔

پھر وہ شبنم اور سومِت کو بانھوں کے حصار میں لے کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا، ''بھائی صاحب! کشمیر تو جانا ہی پڑے گا۔ لیکن اکیلے نہیں، سبھی کو ساتھ لے کر۔ ثمرین کی شادی طے ہوگئی ہے۔ آپ لوگوں کو ساتھ لانے کے لئے ہی خاص طور پر مجھے بھیجا گیا ہے۔''

جیب سے دعوت نامہ نکال کر دیتے ہوئے وہ بولا، ''اِس بار تجارتی مقصد سے نہیں آیا ہوں۔ مجبوراً تھوڑا سا آرڈر کا مال ساتھ لیتا آیا......''

''پیاری ثمرین کی شادی میں ہم لوگ ضرور چلیں گے۔'' مِناکشی لہک کر بولی۔

''سیر سپاٹے میں کم سے کم پندرہ دن تو لگ ہی جائیں گے۔ سب انتظام ہو چکا ہے۔ ابا نے ایک شکارا آپ لوگوں کے لئے بُک کروادیا ہے۔''

پھر وہ اَجیئے سے بولا، ''بھائی صاحب! آپ اِسی حساب سے چھُٹی لیجئے گا۔ درجنوں سالے سالیاں آپ کے سواگت ستکار کی تیاریوں میں لگی ہیں۔'' آنکھیں مٹکا کر اُس نے ''سواگت ستکار'' کو معنویت عطا کرنے کی کوشش کی۔

اَجیئے بولا، ''بھائی! مجھے تو معاف کردو۔ شاید ہی چھٹی ملے۔ میں تمھاری شادی میں ضرور جاؤں گا۔ بہن اور بچوں کو تم ساتھ لے کر جا سکتے ہو۔''

اَجیئے ماں اور بہن کو بھی کشمیر کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ گنجائش نہ دیکھ کر اُس نے نہیں جانے کا عذر پیش کیا۔

دلشاد کا خنداں چہرہ پژمردہ ہو گیا اور ماحول پر اچانک اَفسردگی چھا گئی۔ مِناکشی تڑپ کر بولی، ''تم اُداس کیوں ہوتے ہو دلشاد؟ یہ کیسے نہیں جائیں گے؟ اِنھیں جانا ہی پڑے گا۔ میں ذمہ لیتی ہوں۔ چلو! اب مسکراؤ۔ مسکراؤ نہ......''

دلشاد کے چہرے پر مسکان، موسمِ بہار کی طرح لوٹ آئی۔ مِناکشی کے سخت تیور اور عزمِ مصمّم دیکھ کر اَجیئے ہکا بکا رہ گیا۔

شبنم اور سومت آہستہ آہستہ دلشاد کے پہلو میں چیونٹی کاٹنے لگے، تب وہ اُٹھا اور سر پر پنجہ پھنسا کر کھڑا ہو گیا۔ بازوؤں کے تکون سے دونوں جھول گئے۔ دلشاد گول گھومنے لگا۔ بچوں کو چکری کی سواری جیسا مزہ ملنے لگا۔ بہت دنوں بعد بچوں کو دلی خوشی ملی اور گھر گلزار ہوا۔ یہ منظر دیکھ کر مِناکشی بے حد جذباتی ہو گئی۔ اُس کی آنکھیں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگے۔ اُسے لگا کہ میکے سے اُس کا سگا بھائی خوشیوں کا سندیسہ لے کر شادی کا نیوتا دینے آیا ہے۔ مِناکشی کی پلکوں میں پھنسے آنسو تراشیدہ ہیرے کی طرح دَمکنے لگے۔ جذبات کی منتہا دیکھ کر اَجیئے کا دل کچوٹنے لگا، تب وہ موبائل فون کان میں سٹا کر اُٹھا اور کمرے میں چلا گیا۔

دلشاد مزے لے لے کر کھانے لگا تو مِناکشی کی آنکھوں میں خوشیاں دونے میں رکھ کر گنگا میں بہائے دیئے کی طرح جگمگانے لگیں۔ اُس نے سوچا کہ پریم کا بندھن کتنا

عجیب ہوتا ہے۔ جتنا کسے اتنا ہی سکھ دیتا ہے۔ پھر اُس نے دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں اور شوکیس میں سجے نادر شوپیس پر نظر ڈالی۔ سب کے سب دلشاد کے لائے ہوئے تھے۔ جذبات سے مغلوب مِناکشی کو لگا کہ وہ پیپل ہے اور دلشاد پیپل میں اُگا چھوٹا سا برگد۔

دلشاد، اَجے اور بچوں کے ساتھ چہل قدمی کر کے لوٹا تو سب سے پہلے اُس نے ٹافیوں اور پٹاخوں کو تقسیم کیا۔ اُس کے بعد گٹھڑ سے ایک گٹھڑی نکالی، جس میں سبھوں کے لئے روایتی کشمیری لباس تھے۔ اَجے کے لئے ایک نفیس فرغل بھی۔ خرگوش کے چمڑے کا روئیں دار کوٹ اور بھڑکیلا لباس بچوں کے لئے۔ مِناکشی کا قیمتی کامدار لباس دیکھ کر اَجے کی آنکھیں پھیل گئیں۔ دوری بنائے کھڑی ساوتری کو بلا کر اُسے ست رنگا لہنگا، پٹاخے اور ٹافیاں دیتے ہوئے اُس نے، ''بہنا! یہ تمھارے لئے۔''

ساوتری دوپٹے میں سامان سمٹتے ہوئی بولی، ''بھیا جی! میرے لئے بھی؟ تھینک یو!'' بارِ ممنویت سے شرسار آنکھیں پلکیں جھپکانے لگیں۔

شبنم اور سومِت تو اُسی وقت اپنے اپنے لباس پہن کر آئینے کے سامنے طرح طرح کے پوز دے کر خود کو نہارنے لگے۔ سومِت چلآیا، ''سالا میں تو کشمیری بن گیا......'' خوشیوں سے لبریز منظر دیکھ کر دلشاد نہال ہو گیا۔ اُس نے سوچا کہ جذبات کے اظہار میں پیسے اور اشیا کا اہم رول ہوتا ہے۔ اُس نے چور نگاہوں سے مِناکشی کو دیکھا۔ وہ اپنے لباس کو سینے سے لگائے نہ جانے کن خیالوں میں محو تھی۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اچانک اَجے اُٹھا اور دلشاد کو سینے سے لگا کر بولا، ''سمجھ میں نہیں آتا بھائی! جس کشمیر میں بے پناہ محبت کرنے والے لوگ بستے ہیں، وہ جل کیوں رہا ہے؟ اُسے کس کی نظر لگ گئی؟''

مِناکشی کا وجود جلتے کینڈل کی طرح پگھل رہا تھا۔ وہ سامان اُٹھا کر بچوں کو ساتھ لیتی کمرے سے نکلتی ہوئی بولی، ''دلشاد! اب تم آرام کرو۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔''

پھر وہ اَجے سے بولی، ''آپ بھی چلئے۔''

مِناکشی کے جانے کے بعد دونوں باتیں کرنے لگے۔ دلشاد نے اَجے کو اپنی لمبی غیر حاضری کا سبب بتایا کر بہن کو نہ کہنے کی تاکید کر دی۔ تھوڑی دیر بعد اشارے سے بلاتی مِناکشی کو دیکھ کر افسردہ اَجے ''گڈ نائٹ'' کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

دوسرے دن سے دلشاد اپنے تجارتی کاموں میں لگ گیا۔ اَجئے سے موٹی رقم وصول کر مِناکشی نے بھی شادی کی خریداری شروع کر دی۔ سب کے لئے کچھ نہ کچھ اور ثمرین کے لئے اُس نے بہت کچھ خریدے۔

شادی کی تقریب انتہائی سادہ تھی۔ اُنھیں دلشاد بتا چکا تھا کہ اب شادی پہلے جیسی دھوم دھام سے نہیں ہوتی۔ لوگ عزیزوں کو کفناتے دفناتے تھک چکے ہیں۔ قبرستانوں میں جگہ نہیں بچی ہے۔ گورکن گوشت لگی ہڈّیوں کو چُن چُن کر جمع کرتے پھر اُنھیں میت کے پہلو میں رکھ دیتے ہیں۔ اب تو بڑا حادثہ بھی ایک معمولی واقعہ سا لگتا ہے۔ رو رو کر لوگوں کی آنکھیں ناکارہ نہر سی خشک ہو چکی ہیں۔ آنکھوں سے نہ غم میں آنسو بہتے اور نہ خوشی کے موقعوں پر چھلکتے۔ شادی کی نہیں جاتی بلکہ لڑکی کو باعزت رخصت کر دیا جاتا ہے۔

شادی میں مِناکشی کو بڑی بیٹی اور اَجئے کو داماد کی حیثیت سے ہر جگہ پیش پیش رکھا گیا۔ روایتی کشمیری لباس میں مِناکشی، ساوتری، اَجئے اور بچے بھی کشمیری لگ رہے تھے۔

شادی کے بعد سلسلہ شروع ہوا دلشاد کے رشتہ داروں، پڑوسیوں اور دوستوں کے گھر دعوتوں اور سیر و سیاحت کا۔ میزبان کے بچے سومِت اور شبنم کو طرح طرح کی چیزیں کھلاتے، اپنے دوستوں سے مِلاتے اور اُنھیں آس پاس گھمانے لے جاتے۔ وقتِ رخصت بڑے بزرگ اُنھیں سینے سے لگاتے، پیار کرتے اور مٹھی میں روپے رکھ کر ہلکا سا دَبا کر پورے جسم میں اُنس و محبت کی ترنگ دوڑا دیتے۔ پیشانی پر ثبت بوسے تا دیر بچوں کے وجود میں شفقت و اپنائیت کا اِرتعاش پیدا کرتے رہتے۔ اَجئے کو سلامی ملتی۔ سوغات دے کر نم آنکھوں سے مِناکشی سے پھر آنے کا وعدہ لے کر اُسے رخصت کیا جاتا۔

دلشاد کا بھتیجا عمران موقع نکال کر شبنم اور سومِت کو آس پاس سیر کرانے لے جاتا۔ خوبصورت پس منظر میں وہ اُن کی تصویریں کھینچتا، سیلفی لیتا اور وی ڈی او بناتا۔ پھر اُنھیں تصویریں اور وی ڈی او دکھاتا۔ بچے بے حد خوش تھے۔ خوشیاں لوٹتے اور موج مستی میں مست بچوں کو کیا پتا کہ اب کشمیر، جنت نظیر نہیں۔ سبھی خوف کے سائے میں جی رہے ہیں۔ کاروبار ٹھپ ہے اور سیّاح جنّتِ ارضی کی سیر سے کترانے لگے ہیں۔

ایک دن دلشاد کے ماموں بچوں کو سیب کے باغ کی سیر کرانے لے گئے۔ واپسی

سے قبل اُنھوں نے لوہے کی ایک ایک کیل دے کر سومت اور شبنم سے کہا،''بچو! اپنی اپنی پسند کے ایک ایک پیڑ چُن کر اُس پر اپنا اپنا نام لکھ دو۔''

خوشی خوشی دونوں نے اپنا اپنا نام لکھا، دل کا نقشہ بنایا اور اُس میں تیر آر پار کر کے تاریخ بھی درج کر دی۔ خوشیوں سے دَمکتے چہروں کو دیکھ کر مسرور ماموں بچوں کو بازوؤں میں بھر کر بولے،''آج سے یہ پیڑ تمھارے ہو گئے۔ سیب اور بیچے گئے سیب کی قیمت تم لوگوں تک دلشاد پہونچا دیا کرے گا۔''

اِس انوکھی خوشی کو ماں باپ سے ساجھا کرنے کے لئے بے قرار بچے واپسی میں سیب کھاتے ہوئے آگے آگے چل رہے تھے۔

دلشاد کے والدین نے بیٹی داماد کو تحفے میں دینے کے لئے چنار کا منقش سنگار بکس، چندن کا قلمدان، دبیز خوبصورت قالین اور بہت سارے چھوٹے بڑے سامان خرید رکھے تھے۔ دلشاد کی پھوپھی نے ایک کارٹون خشک میوہ پہلے ہی لا کر رکھ دیا تھا۔ ماموں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ بچے جتنا لے جاسکیں سیب لیتے جائیں گے۔ بڑے ابا نے سب کو کشمیری شال کا تحفہ دیا۔

ایک دن مولوی برکت اللہ اَجے کو مقامی مذہبی مقامات کی سیر کرانے لے گئے۔ وہ دورانِ گفتگو بولے،''اَجے بابو! یہاں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ رہن سہن، بول چال، پہناوے اور شکل وصورت دیکھ کر آج بھی کسی سیّاح کو یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ وہ جس شخص سے گفتگو کر رہا ہے، اُس کا تعلق کس مذہب سے ہے۔ اشتراک، رواداری، اخلاق ومحبت، ایثار اور درگزر کا جذبہ ہمارے خون میں رچا بسا ہے۔ ہم اِس خطّے کی ثقافت کے امین ومحافظ، امن پسند اور محبِ وطن ہیں۔ چند لوگ تفریق، نفرت اور دہشت کی کھیتی کرنا چاہتے ہیں جب کہ ہم لوگ زعفران کے کاشت کار ہیں......''

اَجے قطع کلام کرتے ہوئے بولا،''آپ کی باتوں سے میں اتفاق رکھتا ہوں۔ کشمیر آنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہماری سوچ اور نظریے میں تبدیلی آگئی ہے۔ لیکن......''

مولوی برکت اللہ قطع کلام کرتے ہوئے بولے،''یہی نہ کہ ٹی وی اور اخبار میں دکھائی اور شائع کی جانے والی خبریں کچھ اور بیان کرتی ہیں......''

اَجے‘ قطع کلام کرتے ہوئے بولا، ”آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔“

”اَجے بابو! اب اقتدار نے تجارت کا روپ اختیار کرلیا ہے۔ سیاست داں عوامی نمائندے کہلاتے ہیں، ہوتے نہیں۔ اِسی لئے وہ عوام کی خواہش، ضرورت اور اُن کے جذبات کے مطابق کام نہیں کرتے۔ اُن کا پورا عمل پارٹی اور ذاتی مفاد پر منحصر ہوتا ہے۔ اُن کی نیتی پھوٹ ڈالو، راج کرو۔ دنگا کراؤ، انتخاب جیتو۔ ’سیکولرزم خطرے میں ہے‘ کی دہائی لگاؤ اور اقتدار ہتھیاؤ۔ دَل بدلو، وزیر بنو۔ پارٹی چھوڑو، پارٹی بناؤ اور سرکار گراؤ، سرکار بناؤ۔ یہی سب ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں نہ؟ اَجے بابو! آزادی کے بعد سے آج تک اقتدار اور صاحب اقتدار بدلتا رہا ہے، سوچ اور عمل نہیں بدلا۔ آپ ہی بتایئے! ایسا کوئی مسئلہ ہے، جس کا حل نہ ہو؟ دراصل مسئلے کو لہو سے سینچ کر زندہ رکھا جارہا ہے۔ چوتھے کھمبے میں بھی دیمک لگ چکی ہے۔ پیڈ نیوز کا چلن بڑھا ہے۔ خبریں دیکھ پڑھ کر ہم لوگ بھی چکرا جاتے ہیں۔“

پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولے، ”آج پورا صوبہ دہشت گردی کی زد میں ہے۔ ہم لوگ دُہری مار جھیل رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کون دوست، کون دشمن ہے؟ وردی دھاری ہمارے محافظ ہیں یا جان کے دشمن؟ گھروں میں بے دھڑک گھسنے کے لئے مخبری اور پناہ دینے کا الزام کافی ہے۔ سہمی سمٹی گھر لوٹی بچی منہ ڈھانپ کر سبکتی اور گھر والے اُس کے زندہ واپسی پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اَجے بابو! آج بیشتر ماؤں کو معلوم نہیں، بچے کا باپ کون ہے؟ ہماری بے بس آنکھیں سب کچھ دیکھتیں، کان سنتے ہیں۔ لیکن زبان نہیں کھلتی۔ پشتینی ہنر کا صفایا ہو رہا ہے۔ کاروبار جاری رکھنا آسان نہیں رہا۔ ہماری حب الوطنی مشکوک، ہم نامعتبر اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔ سچ کہوں! مظلوموں کے آنسو رواں نہیں رہتے تو ڈل جھیل کب کا سوکھ چکا ہوتا۔ جنت نظیر کشمیر کو کس کی نظر لگ گئی اور امن کس غار میں قید ہے، نہیں معلوم۔“

تھوڑی دیر تک دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ مولوی صاحب ایک مندر کو دِکھاتے ہوئے بولے، ”گھنی مسلم آبادی میں مسجد سے متصل یہ مندر نور محمد شاہ نے اپنے دوست پنڈت جگن ناتھ کے لئے بنوایا تھا۔ نیک صفت باریش پنڈت جی مندر کے صحن میں بچوں کو عربی و فارسی کے ساتھ سنسکرت بھی پڑھاتے تھے۔ آج دونوں بزرگ اِس دنیا میں

نہیں۔ لیکن یہ مسجد و مندر اُن کی دوستی کی مثال اور گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔‘‘

جذبات سے مغلوب مولوی صاحب مندر کے چبوترے پر بیٹھ کر نم آنکھوں کو خشک کرنے لگے۔ اَجئے اُن کے پہلو میں بیٹھ کر اُن کے پنجے کو تھپتھپانے لگا۔ اُنھیں لگا کہ اَجئے بابو تسلّی دے رہے ہیں کہ حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔

اَجئے وادی کا جائزہ لینے لگا۔ اُسے ہر طرف ہریالی ہی ہریالی نظر آئی۔ اچانک اُس کی نگاہ کچھ دوری پر جُھلسے ہوئے درختوں اور اَدھ جلے ایک مکان پر مرکوز ہو گئی۔ مولوی صاحب نے دھیرے سے کہا، ’’یہ ایک مُدھ بھیڑ کی نشانی ہے۔‘‘

واپسی سے قبل ڈاکٹر عرفان ملک نے بھی اَجئے کو دعوت دی۔ بنگلے سے متصل گارڈن میں بیٹھے ڈاکٹر صاحب، اُن کی بیوی عائشہ جمال، مِناکشی اور اَجئے محوِ گفتگو تھے۔ شبنم طرح طرح کے پھولوں کو توڑ کر ساوتری کو لا لا کر دے رہی تھی اور وہ خوبصورت مالائیں بنا رہی تھی۔ سومِت تتلیوں کو پکڑنے میں لگا تھا۔ الوداعی سلام کرتا سورج تیزی سے غروب ہو رہا تھا۔ وادی کی ہریالی سیاہی مائل ہونے لگی تھی۔ پرندے قبل از وقت بسیرے کے لئے لوٹ رہے تھے۔

عائشہ جمال کو اچانک شناسا بوڑھا پھیری والا نظر آیا۔ وہ فوراً اُٹھ گئیں۔ مِناکشی کنکھیوں سے اُنھیں دیکھنے لگی۔ وہ سومِت اور شبنم کی پسند سے پھیری والے سے کھِلونے خرید رہی تھیں۔

اُسی وقت ایک پریشان حال شخص ڈاکٹر صاحب سے مِلنے آ گیا۔ وہ نسخہ دیکھتے ہوئے مریض کی کیفیت سن کر بولے، ’’حالت ٹھیک نہیں لگتی ہے۔ رات بھر جاگنا ہوگا۔‘‘ پھر وہ نسخے پر اُنگلی رکھ کر اُس شخص کو دِکھاتے ہوئے بولے، ’’گولی چلتی رہے گی۔ اب آپ جائیے۔‘‘

’’گولی چلتی رہے گی......‘‘ سنتے پھیری والا بدحواس ہو گیا۔ وہ چھانٹے گئے کھِلونوں کی قیمت لئے بغیر ٹوکری سر پر رکھ کر بھاگنے لگا۔ عائشہ جمال اُسے پکارتی رہیں۔ لیکن وہ رُکا نہیں۔

وہ مُڑے بغیر بلند آواز میں بولا، ’’بہن! زندہ رہا تو پیسے لے جاؤں گا، نہ رہا تو

میری طرف سے بچوں کا تحفہ۔ گھر میں جوان بہو بیٹیاں ہیں......"

دہشت زدہ پھیری والے کی لرزتی آواز فضا میں تا دیر گونجتی رہی......

●

('نگینہ'، سری نگر، اکتوبر۔نومبر ۲۰۱۴ء میں شائع)

دست و بازو

موسمِ گرما کی یہ تیسری اور سب سے بڑی آندھی تھی۔ دوپہر سے ہی آسمان کئی بار اپنا رنگ روپ بدل چکا تھا۔ شام کے وقت تو ایسا لگنے لگا تھا کہ سُرخ آندھی کا یہ پیش خیمہ ہے یا پھر اُفق پر خودکش حملوں میں لاکھوں بے گناہوں کا خون بہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شفق سیاہ بادلوں میں گم ہوگئی۔ پھر رہ رہ کر بجلی چمکنے اور بادل اِس طرح اُمنڈنے لگے گویا کسی نے اژدھے کا سر کچل کر چھوڑ دیا ہو۔

زبیدہ بی بی جلدی جلدی جلاون اُٹھاتے ہوئے بولیں، ''دُلہن! باہر آکر آسمان تو دیکھو! اللہ کا جلال صاف نظر آرہا ہے۔ وہ اپنی ناراضگی اِسی طرح جتلاتا ہے۔ ہم بھی تو دین سے دور اور دنیا سے چمٹے ہوئے ہیں۔''

شبنم برآمدے میں کھڑی ہوکر آسمان دیکھتی ہوئی بولی، ''مجھ سے نہیں دیکھا جائے گا۔ اب آپ بھی کمرے میں چلی جایئے۔''

''بس، چولہے کی آگ بجھا دوں۔ ایسے وقت چنگاری کو بھی پَر لگ جاتی اور وہ اپنی قوت دِکھانے لگتی ہے۔''

آگ بجھاتے وقت زبیدہ بی بی کے پلّو میں آگ لگ گئی۔ اُنھوں نے پہلے تھپّڑ پھر چپل مار مار کر آگ بجھا دی۔ لیکن تشویش کی آگ سے اُن کا وجود جلنے لگا۔ وہ بہو کے کمرے میں جا کر جلے پلّو دِکھاتے ہوئے بولیں، ''دُلہن! تم بھی خدا سے خیر مانگو۔ آنچل کا جلنا اچھا شگون نہیں۔ کئی دنوں سے بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔ چھپکلی میں بھی بُرے

خواب دیکھنے لگتی ہوں۔ اللہ میرے لعل کو اپنے امان میں رکھے۔ اب تو گھر لوٹتے لوگوں پر بھی قہر ڈھایا جانے لگا ہے۔ اللہ جانے جیتے جی اور کون کون سا دن دیکھنا باقی رہ گیا ہے......''

شبنم قطع کلام کرتے ہوئے بولی، ''یہ بھی ایک سیاسی ہتھکنڈا ہے، سستی شہرت حاصل کرنے کا ایک بھونڈا طریقہ۔ اب اُن کی سمجھ میں بھی آچکا ہے کہ فرقہ وارانہ فساد، بابری مسجد کا تنازعہ وانہدام اور دہشت گردی کے ہتھیار ناکارہ ثابت ہو چکے ہیں۔ اِسی لئے صوبائی تفریق اور نسلی منافرت پھیلائی جارہی ہے......''

''اگر سبھی اِسی راہ پر چل نکلے تو؟'' اُن کا لہجہ استفہامیہ تھا۔

''ایسا نہیں ہوگا۔ اب دنگوں اور سیریل بم دھماکوں کے بعد بھی لوگ متحد رہنے اور صبر و تحمل سے کام لینے لگے ہیں۔ خبریں سن سن کر آپ کچھ زیادہ ہی پریشان رہنے لگی ہیں۔''

''سنا ہے ٹی وی پر تو سب کچھ ہوتے ہوئے دِکھایا جارہا ہے۔''

پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولیں، ''خدا جانے میرا لعل کس حال میں ہے؟''

اُنھیں تسلّی دیتی ہوئی شبنم بولی، ''اللہ پر بھروسہ رکھیئے۔ اُن کا خط تو پڑھ کر سنا ہی چکی ہوں۔ مُرادآباد والے دوست کی موت کے بعد وہ رات کے وقت ٹیکسی نہیں چلاتے۔ دن میں بھی محتاط رہتے ہیں۔ موبائل فون ہوتا، تب میں آپ کو جی بھر کے بات کروادیتی۔''

پھر وہ اُن کے آنچل کا جلا حصّہ پھاڑ کے بولی، ''اب جا کر ساڑی بدل لیجئے۔''

زبیدہ بی بی نحیف مریضہ کی طرح اُٹھتی ہوئی بولیں، ''جی چاہتا ہے آج ہی بمبئی والی گاڑی پر سوار ہو جاؤں۔''

پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولیں، ''عورت کی ذات آدھی اَدھوری۔ وہ دس بچوں کو بھی پال پوس کے پڑھا لکھا کر اعلیٰ مقام دِلا سکتی ہے۔ لیکن تنہا سفر نہیں کر سکتی۔ وہ کوئی بڑا قدم اُٹھا نہیں سکتی۔ اُسے مرتے دم تک سہارا چاہیئے۔''

جب پپوٹے آنسو کے ریلے کو روک پانے میں ناکام ہونے لگے، تب وہ اپنے کمرے میں چلی آئیں اور دَھم سے بستر پر بیٹھ کر خود کلامی کرنے لگیں، ''رجّو! تو جانتا ہے، میں اختلاجی ہوں۔ تیری چِنتی کلیجہ کھائے جارہی ہے۔ بیٹا! ایک بے بس بیوہ ماں آنسو بہا کر صرف خیر کی دعائیں مانگ سکتی ہے۔''

پھر وہ آنچل پھیلا کر دعائیں مانگنے لگیں، ''یا اللہ! اِس گھر کے چراغ کو محفوظ رکھنا۔ وہی ہمارا ولی و کفیل اور اِس گھر کا تنہا وارث ہے۔ اُس کے بغیر ہم سب جیتے جی مر جائیں گے......''

آندھی شروع ہوتے ہی لوگ باگ تھیلا، بورا، چادر اور لُنگی لئے آس پاس کے باغوں میں جا گھسے۔ ڈانٹ، پھٹکار اور دھمکیوں کو بے اثر ہوتے دیکھ کر رکھوالے بھی گرے آم بٹورنے لگے۔ غریب، دَلت اور مہا دَلت کے بچے گرے ٹِکوں، سوکھی لکڑیوں اور ہرے بھرے شاخوں کو ہی گھسیٹتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔

لوٹنے میں ایک مخصوص لطف اور سُرور و انبساط ملتا ہے۔ چاہے ٹوٹا چرخہ ہاتھ لگے یا منہدم تاریخی عمارت کی اینٹ یا پھر کسی معصوم و بے گناہ کی آبرو۔

تھوڑی دیر بعد تباہی مچا کر آندھی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ گویا تھکا قاتل تلوار پکڑے بیٹھ کر سُستانے لگا ہو۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ موٹی موٹی بوندوں سے ہلکی دھول اُڑی۔ کھپریل اور ٹین کی چھتیں بجنے لگیں اور چھپّر پانی جذب کرنے لگے۔ پھر مٹّی کی مخصوص سوندھی مہک نتھنوں میں سمانے لگی۔

شبنم نے برتنوں کو ٹپکنے والی جگہوں پر پہلے ہی رکھ دیا تھا۔

زبیدہ بی بی عشا کی نماز پڑھ کر کھانا کھاتی ہیں۔ اِن دنوں وہ وظیفہ بھی تا دیر پڑھنے لگی ہیں۔ شبنم اُن کا کھانا پانی کمرے میں رکھنے کے بعد مچھر دانی لگا کر روتی چندا کو بازوؤں میں بھر کے اُس کے ہونٹوں پر رُخسار رکھ رکھ کر بولنے لگی، ''نا! نا!...... بابو بہادر ہے۔ وہ بجلی کی چمک، گرج سے نہیں ڈرتی۔ اُسے تو پاپا یاد آ رہے ہیں۔ بابو بھی خیر کی دعا مانگے گی۔ پاپا، اپنی گڑیا رانی کے لئے کِھلونے، کپڑے اور مٹھائی لے کر آئیں گے......''

ماں کا قُرب اور ممتا کا لمس پا کر چندا چپ ہو گئی۔

بستر پر لیٹتے ہی شبنم کو یہ خیال آیا کہ صبح ریڈیو اور ٹارچ کے لئے بیٹریاں منگوانی ہے۔ بے خیالی میں اُس کا ہاتھ شوہر کے تکیہ پر چلا گیا۔ اُس نے فوراً تکیہ بدل لیا۔ تکیے میں پیوست مخصوص مہک میٹھی یادوں کو گدگدانے لگی۔ وہ بیٹی کے سر پر ہاتھ پھرتی ہوئی اللہ سے ہم کلام ہوئی، ''یا اللہ! باپ کا سایہ معصوم کے سر پر بنائے رکھنا۔ آپ نے ہی مرد کو کنبے کا

محافظ و کفیل بنایا ہے۔''

جب وہ اندیشوں کے حصار میں گھِر گئی، تب وہ خیالوں کے دریچے بند کر کے ماضی کی بالکونی پر جا کھڑی ہوئی۔

شبنم کے ذہن میں اُس دن کا پورا منظر رقص کر گیا۔ اُنھوں نے حد پار کر دی تھی۔ ساون کا تیسرا پہر تھا۔ دھوپ کھِلی ہوئی تھی۔ آنگن میں کپڑے سوکھ رہے تھے۔ اماں ایک مریضہ کی عیادت کرنے گئی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے آوارہ بادل ہم آغوش ہوئے اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔ کپڑے اُٹھانے میں وہ بھی بھیگ گئے تھے۔ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا تھا۔ اُنھیں شرارت سوجھ گئی تھی، تب اُنھوں نے دروازہ بند کیا اور اُسے بازوؤں میں بھر کے اولتی کے نیچے وہ جا کھڑا ہوئے تھے۔ جسم پر پانی گرتا رہا اور وہ جی بھر کر من مانی کرتے رہے۔ شرم، آنکھوں میں ہوتی ہے۔ وہ آنکھیں موندے کٹھ پُتلی سی متحرک رہی اور وہ...... چھی! یہ خیال بعد میں آیا تھا کہ وہ ایسے موقعے پر سحر زدہ سی کیوں ہو جاتی ہے۔ کئی دنوں تک وہ اُن سے آنکھیں ملا کر بات نہیں کر سکی تھی۔ یہ شُبہ پھانس کی طرح دل و دماغ میں چبھا ہے کہ کہیں تاڑ چڑھے پاسی نے دیکھ نہ لیا ہو؟ یہ سچ ہے کہ تنہائی، بے خوفی اور بے حیائی کو پروان چڑھاتی اور موقع ملتے ہی مرد جوگاڑ بیٹھا لیتا ہے۔

چندا کسمسائی، تب وہ ماضی کی بالکونی سے لوٹ آئی۔ اب اُسے بارش کی آواز سنائی دینے لگی اور اُس کے ذہن و دل میں بیتے دن برساتی پودوں کی طرح نمودار ہونے لگے۔ اُس نے کروٹ بدل کر تکیے کو سینے سے بھینچ لیا۔ اُسے لگا کہ وہ نم زلفوں میں اُنگلیاں پھنسا کر کھیلتے ہوئے اُس کے کان میں پھُسپھُسائے، ''شبّو! جھما جھم بارش کی آواز میں کتنی موسیقیت ہے......''

لیکن آج تو اُسے یہ پُر کیف نغمہ نہیں بلکہ فراق زدہ کا جگر لرزاں نوحہ لگ رہا ہے۔

اچانک اُس کے دل میں یہ خیال کود پڑا کہ وہ ہوتے تو آج بھی وہ...... ذہن میں بنتے گرداب سے وہ ٹھٹھک گئی۔ بے خیالی میں اُس نے بیٹی کو سینے پر لیٹا کر اُسے بھینچ لیا۔ چندا بلبلا کر رونے لگی، تب اُس نے بلاؤز کا بٹن کھول دیا۔ وہ دودھ پیتے ہوئے حلق سے مخصوص آواز نکالنے اور ٹھہر ٹھہر کے سانسیں چھوڑنے لگی۔ شبنم کی آنکھوں میں وہ رات

کنگ فیسر کی طرح ڈھپ سے کود پڑی۔

آندھی کے بعد اُس رات بھی مُوسلا دھار بارش ہوئی تھی۔ چھت سے پانی اسی طرح ٹپک رہا تھا۔ وہ غصّے میں بندروں کو کوسنے لگی تھی، ''خدا غارت کرے بندروں کو، سب کے سب بجلی کے تاروں میں کوّے کی طرح جھول جائیں۔''

''تار میں کرنٹ ہوگا، تب ہی نہ جھولیں گے۔'' اُنھوں نے مُسکرا کر کہا تھا۔

وہ بڑبڑاتے ہوئے بولی تھی، ''ٹرانسفر مر جلے دو ماہ گزر چکا ہے۔''

پھر اُس نے جواز پیش کیا تھا، ''آسمانی بجلی بھی تاروں پر دوڑ سکتی ہے۔''

وہ بازوں میں چیونٹی کاٹ کر بولے تھے، ''بندر بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ اِس وقت سبھی دُبکے پڑے ہوں گے۔ تمھیں پتا ہے؟ پہلے یہ آدمی تھا۔''

''اسی لئے آدمی کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ بدذات دِکھا دِکھا کر کھیرے اُلٹتا ہے۔ موقع ملتے ہی کوئی چیز اُچک کر چھت پر جا بیٹھتا اور کھانے کی چیزیں لے کر بھی مان منوّل کے بعد سامان پھینکتا ہے۔ لاٹھی اُٹھاؤ تو دانت نپوڑ کر ایسی گھُڑکی دیتا ہے، جیسے وہ بدن پر ہی کود پڑے گا۔ اب تو پٹاخوں سے بھی نہیں ڈرتے، غریب بچوں سا مزہ لیتے ہیں۔''

اُنھوں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا تھا، ''شادی سے پہلے کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایک دن اماں سوکر اُٹھیں۔ گردن میں اکڑن محسوس کیا، تب اُنھوں نے اپنا تکیہ دھوپ میں رکھ دیا تھا۔ چوکسی کے باوجود ایک بندریا اُسے لے بھاگی تھی۔ اماں ہائے توبہ کرتے کچھ لانے کو دوڑیں اور میں نے پاس پڑی لاٹھی اُٹھا کر اُسے دھمکایا تھا۔ وہ طیش میں آکر تکیے کا پیٹ پھاڑ کے لگی روئی اُڑانے۔ تکیے کا تِکّا بوٹی ہوتے دیکھ کر اماں نے جلدی سے چھت پر کیلے اُچھالے۔ اُس نے تکیہ نہیں پھینکا بلکہ لگی کیلے چھیل چھیل کر کھانے۔ وہ تا دیر بندریا کی منّت کرتی رہیں، پھر لگیں اُسے کوسنے۔ تھوڑی دیر بعد وہ تکیہ لے کر کہیں اور چلی گئی۔ اماں کے لئے ابّا مرحوم نے منہ پر رومال باندھ کر اُسے بنایا تھا۔ وہ جب کبھی بیمار پڑتیں، تب وہ اُسے سینے سے لگائے رکھتی تھیں۔ بستر علالت پر اُنھیں بندریا یاد آجاتی ہے اور وہ اُسے کوسنے لگتی ہیں۔''

بندروں کے خلاف اُس کا غصّہ اُبل پڑا تھا۔ اُس نے پُرعزم لہجے میں کہا تھا،

مداری والا آجائے تو وہ اناج اور روپے دے کر دو چار بندروں کو ضرور پھنسواؤں گی۔ پھر وہ اِس گھر آنگن کا رُخ نہیں کریں گے۔"

اُنھوں نے ڈھارس بندھایا تھا، "اِس بار آؤں گا تو ایر گن ضرور لاؤں گا...... تم دیکھنا، بندوق دیکھتے ہی بندر گھر آنگن چھوڑ دیں گے۔"

وہ تنک کر بولی تھی، "ایک اچھا غلیل تو بناتے نہیں، چلے ہیں گن لانے۔ رہنے دیجیے۔ بندروں کے مظالم سہنے کی میں عادی ہو چکی ہوں۔ وہ بھی جانتے ہیں کہ عورتیں پیدائشی ڈرپوک ہوتی ہیں۔ دیکھتے نہیں آپ کے آتے ہی وہ گھر آنگن سے اُچھل اُچھل کر چھت پر جا بیٹھتے ہیں۔ لوگ بھی اُسی عورت سے ڈرتے ہیں، جس کی پیٹھ پر مضبوط مرد ہوتا ہے......" اُسے بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بولے تھے، "اِس بار آؤں گا تو ٹین کی چھت بنواؤں گا، تب بارش میں چھت گائے گی اور ہم خوب مزے لوٹیں گے۔"

اُنھوں نے چٹ چٹ بوسے جڑ دیئے، تب وہ غصیلے لہجے میں بولی تھی، "تا کہ بندر اُچھل کود کر گھر میں جینا بھی حرام کر دیں۔"

قدرے توقف کے بعد وہ بولے تھے، "پھر ایسا کرتے ہیں، ٹین کی چھت پر کھر بچھوا کر کھپرے پھیروا دوں گا۔ گرمی میں راحت ملے گی اور برسات میں بلبلانا نہیں پڑے گا۔"

"آپ تو ایسا کہہ رہے ہیں جیسے صبح سے ہی کام شروع ہو رہا ہے۔" اُس نے تُرش لہجے میں کہا تھا۔

اُن کا چہرہ بجھ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اُسے دیکھتے رہے۔ پھر وہ اُٹھے اور چراغ کی پھُلیا جھاڑ کر لَو کو اُکسا دیا تھا۔ صندوق پر رکھی دیگچی سے گرتے پانی کو دیکھ کر وہ لپکے، تب میں نے نرم لہجے میں کہا تھا، "ذرا سنبھل کے! پھسلن بہت ہے۔ کھانا لگاتے وقت میں بال بال بچی ہوں۔"

"ننگے پاؤں ناخن گڑا کر چلنے سے آدمی نہیں گرتا ہے۔"

دیگچی اُٹھائے مست بلّے کی طرح قدم رکھتے ہوئے اُنھوں نے اُسے اطمینان دلایا تھا۔ پھر بھرے اور اَدھ بھرے برتنوں کا پانی پھینک کر اُنھوں نے کہا تھا، "نشبو! ٹپکتے پانی کی

آوازوں میں قدرتی لَے اور موسیقیت ہے۔ لیکن اِن میں ایک مکروہ آواز بھی سنائی دے رہی ہے۔"

پھر اُنھوں نے ٹارچ جلا کر دیکھا تھا۔ اُڑتی چھینٹوں سے اُنھیں جلد ہی سُراغ مل گیا تھا۔ شہتیر سے بندھی ایک کڑی کے بندھن میں پانی تیزی سے جمع ہوتا، بوند کی شکل اختیار کرتا، پھر پکی نبولی کی طرح ٹین کے صندوق پر ٹپک جاتا۔ چھینٹوں سے آس پاس کے سامان بھی تر ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے بستر کو پلٹ کے پلاسٹک کا ایک بڑا تھیلا چن کے نکالا اور اُسے پھاڑ کر بکس کے اُوپر بچھایا۔ پھر اُس پر لنگی رکھتے ہوئے وہ بولے تھے، "چلو! مکروہ آواز سے نجات مل گئی۔ لیکن تمھارا کام بڑھ گیا ہے۔ گیلے کپڑوں کو دھوپ دِکھا دینا۔"

وہ کمرے سے باہر نکل کر بولے تھے، "شبّو! بادل اب چھٹنے لگا ہے۔ ہوا سیٹیاں بجا رہی ہے۔ شاخیں جھوم رہی ہیں۔ شیشم کا پتلا والا پیڑ پھن کاڑھے ناگ کی طرح لہرا رہا ہے۔ پپیتے کا بوڑھا پیڑ گر گیا۔ کیلے کے پتے تار تار ہو چکے ہیں۔ اَمر پالی میں شاید ہی دس بیس آم بچے رہ گئے ہوں گے۔ لگتا ہے، جامن کا ایک ڈال بھی ٹوٹ گیا ہے۔ صبح ہی نقصان کا صحیح اندازہ لگے گا......"

"طبیعت خراب ہو جائے گی۔ اب اندر چلے آیئے......" اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے دانستہ چلّا کر کہا تھا تا کہ اماں بھی سن لیں اور اُنھیں ڈانٹ پڑے۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوٹ آئے تھے۔ اُنھوں نے پلنگ کے پاس ٹپکتے پانی سے بھرے لگن میں پاؤں ڈال کر صاف کیا۔ پھر وہ چالاک مسافر کی طرح اُس سے سٹ کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ منصوبہ بنا کر نکلے تھے۔

اُن کی نگاہیں چیتے کی طرح جائزہ لے رہی تھیں اور وہ آنکھوں پر بازو رکھے، نرغے میں آئی ہرنی جیسی راہِ نجات تلاش رہی تھی۔ چراغ میں پھُلیئے پھر بن گئے تھے۔ مٹی کے تیل میں ڈیزل ملایا ہوا تھا۔ مدھم روشنی رومان پرور تھی۔ پھر وہ ساحر کی طرح جادو جگانے لگے تھے اور اُس کا عزم، سیمل کے پکے پھل کی طرح چٹکنے لگا تھا۔ اُسے لگا تھا کہ عورت ساز کی طرح سازندے کے بس میں ہوتی ہے۔

اچانک وہ ہاتھ گھٹنے کے اوپر تک لے جا کر بولے، "تمھارے کپڑے نم ہیں،

اُتار دو۔ طبیعت خراب ہو جائے گی......''

خاموشی سے شبہ پا کر اُن کا ہاتھ رُکا نہیں، تب وہ اُٹھ بیٹھی تھی۔

پھر وہ کندھے پر سر رکھ کر بولے، ''شب......بو......''

''نہیں، بالکل نہیں۔'' اُس نے تنکے سے لکیر کھینچ کر سیلاب کا رُخ بدلنا چاہا تھا۔

''نیند نہیں آ رہی ہے۔'' اُنھوں نے ہمیشہ کی طرح جواز پیش کر دیا تھا۔

سائل شوہر کو سیراب کرنے کا شرعی حکم ہے۔ پھر بھی اُس نے ڈوبتے کی طرح تنکا پکڑ لیا تھا، ''سمجھتے کیوں نہیں، زمین اور عورت بیج رکھ نہیں پاتی۔ چندا چھ ماہ کی بھی نہیں ہوئی ہے۔ آپ کو سفر کرنا ہے۔ صبح صبح نہانا پڑے گا۔ اماں سمجھ جائیں گی......''

وہ قطع کلام کرتے ہوئے بولے تھے، ''تم دیکھنا! اماں خود ہی میرے غسل کا انتظام کریں گی۔''

ہتھیار ڈالتے ہوئے وہ بولی تھی، ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے......''

پھر وہ چتر بہرے کی طرح اَن سنا کر کے اپنی بھوک مٹانے لگے تھے۔

صبح دَھرام سے گرنے کی آواز پر وہ بھی دوڑی تھی۔ رات کا فاتح، صبح آنگن میں چاروں خانے چت پڑا تھا۔ لگن دور جا گرا تھا۔ کپڑے کیچڑ سے لت پت ہو گئے تھے اور اماں جلدی جلدی بیٹے کے غسل کا انتظام کر رہی تھیں۔

جب وہ اماں سے ملنے کے بعد دوبارہ بہانے بنا کر اُس سے ملنے آئے تھے، تب وہ بولی تھی، ''کوشش کریں تو آپ کو آرٹ فلم میں رول مل سکتا ہے۔ میں تو سچ مچ ڈر گئی تھی کہ کہیں ہاتھ پاؤں ٹوٹ نہ گئے ہوں۔ لیکن رات کہی بات یاد آ گئی اور اماں کی بھاگ دوڑ دیکھتے ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ پھسل کر گر پڑنے والوں پر سب ہنستے ہیں۔ اماں بھی منہ پھیر کر مُسکرا رہی تھیں۔''

چندا کو بھی بوسے لے کر کمرے سے نکلنے سے قبل وہ بولے تھے، ''شبّو! پردیسی کے لئے یادیں زادِ راہ اور گزرے حسین لمحات، سوغات ہوتے ہیں۔''

سوئی ہوئی چندا کی لار سے شبنم کا سینہ تر ہو گیا تھا، تب وہ اُسے بستر پر سُلا کے اُٹھی اور کمرے سے باہر نکل کر فضا کا جائزہ لینے لگی۔ آسمان صاف اور فضا خوشگوار تھی۔ تاریک

رات میں کاہ کشاں جاذبِ نظر تھی ۔ جھینگر کی صدا خاموش فضا میں نقب لگا رہی تھی ۔ رہ رہ کر میڈک ٹرّانے لگتے ، لیکن کتے چُپ تھے ۔ اُس نے سوچا کہ اگر وہ رہتے ، تب وہ بھی اِن باتوں کو اُنھیں ضرور بتاتی کہ آسمان صاف ہو گیا ہے......

''دُلہن ! ذرا ٹھہرو ، میں بھی چلتی ہوں ۔'' زبیدہ بی بی بلند آواز میں بولیں ۔

واپسی میں اُس نے پوچھا ،'' اماں ! چاند نظر نہیں آ رہا ؟''

'' اماوس ہے ۔'' اُنھوں نے مختصر سا جواب دے کر پوچھا ،'' اب تک جاگ رہی تھی ؟''

'' اِن دنوں نیند نہیں آتی ۔ جھپکی میں بھی بُرے خیال آتے رہتے ہیں ۔'' وہ بولی ۔

'' سچ پوچھو تو میرا جی بھی ہر وقت بے کل رہتا ہے ۔ وَظیفے کی گنتی بھول جاتی ہوں ۔ یہ بھی یاد نہیں رہتا کون پڑھا اور کون سا باقی ہے ۔ تم جاؤ ! میں کمرے بند کر کے آتی ہوں ۔''

زبیدہ بی بی پلنگ پر بیٹے کی جگہ اُس کے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئیں ۔ پھر وہ سوئی چندا کو کلیجے میں سمیٹتے ہوئے بولیں ،'' لاحول پڑھ لو ۔ شیطانی وسوسے سے نجات مل جائے گی ۔ پھر بھی نیند نہ آئے تو لیٹی لیٹی ہی وظیفہ پڑھو !''

چند منٹوں میں ہی زبیدہ بی بی خراٹے لینے لگیں ۔ شبنم ایک نئے عذاب میں مبتلا ہو گئی ۔ اب اُسے جھینگر اور میڈک کی آواز بُری نہیں لگ رہی تھی ۔ وہ منقطع خیالوں کی کڑی جوڑنے کی کوشش کر رہی تھی کہ چندا اِبلبلا اُٹھی ۔ وہ فوراً متوجہ ہوئی ۔ چندا ، دادی کی سخت گرفت میں تھی ۔ شبنم نے جلدی سے اُن کا ہاتھ کھینچ کر گرفت کو ڈھیلا کرتے ہوئے سوچا ، قبضہ جمانا اور حق جتلانا عورت کی فطرت ہے ۔ ورنہ اماں بات بیچھے میرا بیٹا ، میری پوتی ، میری بہو ، میرا گھر کہہ کہہ کر حقِ ملکیت کا اعلان نہ کرتیں ۔ اُسے لگا کہ اماں ، پوتی کے وسیلے سے بیٹے تک جا پہنچیں ۔

صبح صبح چندا کو لئے زبیدہ بی بی آندھی سے ہوئے نقصان کا جائزہ لے رہی تھیں کہ اچانک شور بلند ہوا ۔ وہ بدحواسی میں ننگے پاؤں دروازے پر نکل گئیں ۔ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے کئی لڑکوں سے اُنھوں نے پوچھا ،'' کیا ہوا بیٹا ؟ کچھ تو بتاتے جاؤ......''

جب کوئی متوجہ نہ ہوا ، تب اُن کی بے کلی بڑھ گئی ۔ وہ فوراً اندر گئیں اور بہو سے بولیں ، دُلہن ! چندا کو سنبھالو ۔ میں پتا لگا کر آتی ہوں ۔ آخر کٹھ پُلیا کی طرف لوگ باگ کیوں

بے تحاشہ دوڑے جارہے ہیں۔''

شبنم آٹا گوندھ رہی تھی۔ وہ دوڑی ہوئی آنگن میں آئی۔ پھر اُس نے باھیں وا کردی۔ زبیدہ بی بی نے جبراً پوتی کو بہو کے سینے سے لگادیا۔ چندا رونے بلبلانے لگی۔ وہ دادی کے ساتھ گھومنا چاہتی تھی۔ بیٹی کو بانھوں میں جکڑ کے شبنم ملتجی لہجے میں بولی، ''ذرا دو قدم بڑھ کر دیکھئے گا۔ میرا کلیجہ ابھی سے بیٹھا جارہا ہے۔ خدا خیر کرے......''

پھر وہ چندا کے گال پر تھپّڑ جڑ کے بولی، ''چپ منحوس! ابھی سے کیوں رونے لگی؟''

زبیدہ بی بی نے جلدی سے سر پر چادر ڈالی، کیچڑ آلود پاؤں میں چپّل پھنسایا اور بھاگتی ہوئی سڑک کنارے مہوا کے پیر کے نیچے جا کھڑی ہوئیں۔ پھر اُنھوں نے آنکھوں پر ہتھیلی کا چھجّا بنا کر کٹھ پُلیا کی جانب بغور دیکھا۔ جیپ کو گاؤں کی جانب آتا دیکھ کر اُن کا دل بے قابو اور جسم کانپنے لگا۔ وہ درخت سے پیٹھ لگا کر انتظار کرنے لگیں۔

گہری لیک والی خستہ کچّی سڑک پر ہلتی ڈولتی سُست رفتار جیپ کی اگلی سیٹ پر بیٹھا آدمی اور ڈرائیور نے منہ پر گمچھا باندھ رکھا تھا۔ پچھلے حصّے میں چادر سے ڈھنکی لاش سے بدبو پھوٹ رہی تھی۔ پھر بھی بچے جیپ کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ کچھ لوگ لاش دیکھنے کے لئے دھکّا مکّی کررہے تھے۔ زبیدہ بی بی جلدی سے سڑک کنارے گئیں اور لپک کر ایک بچے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کے پوچھا، ''کچھ پتا چلا؟ کون ہے؟ کہاں مرا؟''

''مویشی چوری کرتے پکڑا گیا تھا۔ یادو ٹولہ والوں نے پیٹ پیٹ کر چار جنوں کو مار ڈالا، یہ مکھیا جی کا بیٹا......''

گرفت ڈھیلی پڑتے بچہ ہاتھ جھٹک کر بھاگ نکلا۔

زبیدہ بی بی کیچڑ میں دھنسی رہ گئیں چپّلوں کو نکالتی ہوئی گھر لوٹیں۔ چندا اُنھیں دیکھتے ہمکنے لگی، تب وہ اُسے گود میں لے کر بہو کو روداد سنا کر خاموش ہوگئیں۔

الگنی پر کپڑے پسارتے ہوئے شبنم بولی، ''اب کس بے خوفی سے لوگ قانون کو ہاتھ میں لینے لگے ہیں۔ لاقانونیت، سنگ دلی، نسلی و علاقائی تفریق، علیحدگی پسندی اور عدم برداشت کا رُجحان تیزی سے بڑھنے لگا ہے، اِنھیں روکا جانا چاہئے۔ ناکافی ثبوت کی بنیاد پر بیشتر قاتل، زانی اور گھوٹالے بازوں کو کلین چٹ مل جاتی ہے اور بے قصور قیدی باعزت رہائی

کی اُمید میں دم توڑ دیتے ہیں۔ گواہ اور ثبوت پیش نہ کرنے اور جھوٹے ثبوت و گواہ کی بنیاد پر معصوموں کو جیل میں سڑا دینے والوں پر مقدمہ چلے اور اُنھیں عبرت ناک سزا ملے، تب ہی بہتر نتیجے آئیں گے۔ لیکن یہ قوتِ ارادی اور شفافیت کے بغیر ممکن نہیں۔ سرکار کی کُرسی برف کے سِل پر رکھی ہوتی ہے۔ اِسی لئے اُن کا زیادہ وقت پگھلتی برف اور دھنستی کُرسی پر نظر رکھنے میں صرف ہو جاتا ہے......"

زبیدہ بیگم بُت بنی سنتی رہیں۔ شبنم کو اچانک خیال آیا کہ دادی پوتی بھوکی ہیں، تب وہ فوراً کچن میں چلی گئی۔

زبیدہ بی بی اور شبنم کا اضطراب عروج پر تھا۔ مردے کو دفن کر کے غم، ماہ و سال میں کم ہو کر ختم ہو جاتا اور زندگی معمول پر آ جاتی ہے۔ لیکن گمشدگی کی اذیّت لامتناہی ہوتی ہے۔ شبنم کا زیادہ تر وقت خبریں سننے اور ساس کو سمجھانے بجھانے میں گزر جاتا۔ اب وہ ہندی کے علاوہ اُردو خبریں بھی تاکید سے سنتی۔ وہ بی بی سی کو سننا کبھی نہیں بھولتی۔ لیکن کبھی کبھی اُسے مایوسی ہوتی، جب پاکستانی سیاست، اسرائیل اور فلسطین کی چپقلش، عرب ممالک کے خلاف امریکی زہر افشانی یا پھر القاعدہ اور آئی ایس کے تجزیے پر زیادہ وقت صرف کیا جاتا۔

حالات بدلتے اور قسمت کا ستارہ چمکتے دیر نہیں لگتی۔ لیکن اچھے دن موسمِ سرما کی دھوپ کی طرح لمبے ڈیگ بھرتے لوٹ جاتے اور بُرے دن، شام کے وقت آئے مہمان کی طرح ٹھہر جاتے ہیں۔

اِن دنوں چندا رونا شروع کرتی تو وہ چُپ ہونے کا نام نہیں لیتی۔ شبنم اُسیب ار بار مارنے لگی تھی۔ گھر آنگن کی باقاعدہ صفائی بند تھی۔ چولہے کو ہر روز لیپا نہیں جاتا اور راکھ دو چار دنوں پر نکالی جاتی۔ شبنم جس رات نالی میں روک لگانا بھول جاتی، کتّے گھر میں گھُس آتے۔ ایک رات آنگن میں گھسا ایک کتا رونے لگا تھا، تب اُسے بھگا کر زبیدہ بی بی، بہو کو ساتھ لے کر نمازِ فجر تک وظیفہ پڑھتی رہیں۔

زبیدہ بی بی گھر لوٹے مزدور کا سُراغ لگاتی رہتیں۔ سراغ ملتے وہ سر پر چادر ڈال کے کسی بچے کو ساتھ لے کر اُس کے گھر پہنچ جاتیں۔ اُنھیں پکی خبر نہیں ملتی۔ اُلٹے وہاں کی روداد سن کر اُن کی بے کلی اور بڑھ جاتی۔

ایک دن زبیدہ بی بی امام صاحب کو گھر بلوا کر اُن سے بولیں، ''امام صاحب! اللہ کے کلام میں بڑی طاقت ہے۔ آپ کوئی ایسی تدبیر لگائیے کہ میرا بیٹا صحیح سلامت گھر لوٹ آئے۔''

امام صاحب نے دو تعویز لکھ کر ایک کو چوکور موڑا اور دوسرے کا رول بنا کے اُنھیں دِکھاتے کہا، ''چوکور تعویز کو کسی پتھر کے نیچے دَبا کر رکھ دینا ہے اور اِسے سوتی کپڑے میں لپیٹ کر مٹی کے دیئے میں، سرسوں کے تیل سے مغرب کے وقت تھوڑی دیر تک جلا کر بجھا دینا ہے۔ زندہ شخص تعویز کے جل کر ختم ہونے سے قبل گھر لوٹ آتا ہے۔ ان شا اللہ آپ کا بیٹا گھر لوٹ آئے گا۔''

دس بارہ دن گزر گئے۔ چراغ جلاتے وقت زبیدہ بی بی بتّی نکال کر اُس کی لمبائی دیکھ لیتیں۔ وہ اکثر چراغ بجھا کر مخمسے میں گرفتار ہو جاتیں کہ اُنھوں نے چراغ کو جلدی تو نہیں بجھا دیا؟ اُن کے کان ہرنی جیسے چوکنے ہو گئے تھے۔ وہ آہٹ پر بھی دروازہ کھول کر نگاہیں دوڑانے لگتیں۔ فجر کی نماز سے فارغ ہو کر وہ پچھواڑے جاتی اور پتھر کو اُٹھا کر تعویز کو دیکھ لیتیں۔ وسوسہ کان میں گھسی لال چیونٹی کی طرح اُنھیں بے کل رکھتا۔

ایک دن اُنھوں نے بہو سے پوچھا، ''دُلہن! تیرا من کیا کہتا ہے؟ رجّو زندہ ہے؟ یا......''

وہ قطع کلام کرتے ہوئے بولی، ''سچ کہوں اماں؟''

''ہاں! ہاں۔ دراصل میں اپنے دل کی بات سے ملانا چاہتی ہوں۔''

''جب چندا بے وجہ روتی اور چُپ ہونے کا نام نہیں لیتی ہے، تب میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ لیکن جب میں سوئی چندا کا چہرہ غور سے دیکھتی ہوں، تب وہ یتیموں جیسا نہیں لگتا۔''

دلی کیفیت بیان کر کے خاموش وہ ہو گئی۔

وہ جذبات سے مغلوب ہو کر سوئی پوتی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں، ''دُلہن! نا اُمیدی کفر ہے۔ لیکن سچ کہتی ہوں، کبھی کبھی اُمید کا دامن چھوٹنے لگتا ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ میرا بیٹا ایسا بے درد نہیں۔ وہ کیوں ماں کو ناحق تڑپائے گا؟ وہ ضرور کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہے یا پھر...... نہیں! نہیں!...... توبہ! توبہ!...... اللہ اُسے اپنے امان میں رکھے اور میری بچی عمر بھی اُسے بخش دے......''

وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے گالوں پر تھپڑ مارتے ہوئے جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ پھر وہ اُلٹے پاؤں لوٹ کر بولیں، ''بیٹی! روز کنگھی چوٹی کر لیا کرو...... تمھاری پیشانی پر لال بندی خوب پھبتی ہے۔''

ایک رات عشا کی نماز پڑھ کر زبیدہ بی بی نے وظیفہ شروع کیا تھا کہ اُنھیں دروازے پر ٹھہر ٹھہر کر کسی کے ٹھوکر مارنے کی آواز سنائی دی۔ اُنھوں نے پہلے تو اِسے شیطانی وسوسہ سمجھ کر لاحول پڑھا۔ پھر لگا کہ آنگن میں گھسا کتا دروازے کی راہ نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پھر اُنھیں گن بھر بجی بتی اور امام صاحب کی بات یاد آ گئی۔ وہ مضطرب ہو گئیں۔ اُنھیں محسوس ہوا کہ یہ دستک ممتا کے دَر پر دی جا رہی ہے۔ وہ بے تابانہ باہر نکل کر بولیں، ''دُلہن! لگتا ہے دروازے پر کوئی دستک دے رہا ہے۔ میرے ساتھ چلو تو......''

شبنم بھی جاگی تھی۔ دستک سن کر وہ بھی لیٹے لیٹے گمان کے گھوڑے دوڑا رہی تھی۔ ساس کی پکار پر وہ سینے سے لگ کر سوئی بیٹی کو لے کر ننگے پاؤں ٹارچ جلائے دوڑ پڑی۔

دروازے پر رضی حیدر سر جھکائے کھڑا تھا۔ زبیدہ بی بی لالٹین چہرے کے سامنے رکھے بیٹے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگیں۔ خط و گیسو بڑھے اور چادر لپیٹے شوہر کو دیکھ کر شبنم کو سانپ سونگھ گیا۔ ایک جھٹکے سے اُٹھائی گئی چندا کو جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا، تب وہ منہ کھول کر رونے لگی۔ زبیدہ بی بی چہک کر بولیں، ''دُلہن! میرا بیٹا آ گیا ہے۔ جلدی سے اِس کی گود میں بچہ دے دو نہ، وہ چُپ ہو جائے گی۔''

جب وہ روتی چندا کو پکڑانے لگی، تب رضی حیدر دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا ماں کے کمرے میں جا کھڑا ہوا۔ زبیدہ بی بی جلدی سے قرآن شریف اور وظیفے کی کتابیں ہٹا کر بستر پر مسند لگا کے بولیں، ''بیٹا! پہلے آرام سے بستر پر مسند سے لگ کر بیٹھ جا۔ پھر بتانا اتنے دنوں تک کیوں تڑپایا اختلاجی ماں کو؟......''

رضی حیدر جیل سے رہا قیدی کی طرح جی بھر کے سب کو دیکھ رہا تھا۔

خاموشی طویل ہونے لگی، تب وہ تڑپ کر بولیں، ''رجّو! کچھ بولتا کیوں نہیں؟ بول! کچھ بھی بول بیٹا! ورنہ ماں کا کلیجہ اَنڈی کے پکے پھل کی طرح پھٹ جائے گا......''

رضی حیدر نے سر اُٹھا کر ماں اور روتی چندا کو دیکھا۔ چہرے پر نظر جمائے بیوی

سے آنکھیں چار ہوتے وہ نظریں چُرانے لگا۔ شبنم تیسرے امپائر کی طرح جائزہ لے رہی تھی۔ اُسے شوہر کی بولتی آنکھیں گونگی اور ہنس مکھ چہرہ پژمردہ لگا۔ چندا منہ پھاڑ پھاڑ کر روئے جا رہی تھی۔ زبیدہ بی بی ساکت و منجمد منظر کو تا دیر جھیل نہیں پائیں۔ جذبات سے مغلوب ہو کر اُنھوں نے بیٹے کو بازوؤں میں بھر کر بھینچ لیا۔ رضی حیدر بلبلانے لگا، تب اُنھوں نے فوراً اُس کے کندھوں سے چادر گرادی۔ پھر وہ کٹے بازوؤں کو دیکھ کر چیخ مار کے بے ہوش ہو گئیں۔

رضی حیدر سر کچلے سانپ کی طرح اینٹھنے لگا اور آنسو ضبط کی باندھ توڑ کر بہنے لگے۔ اُس نے کہا، ''شبّو! اِنھیں جلدی سے ہوش میں لاؤ نہ۔ یہی سب سوچ کر میں گھر آنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں میں سحر زدہ سا کھنچا چلا آیا۔''

بیٹی کو جلدی سے بستر پر سُلا کر شبنم اُنھیں ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگی۔ وہ ہوش میں آکر، پھر بے ہوش ہو جاتیں، تب رضی حیدر نے کہا، ''جلدی سے جیب سے دوا نکال کر سامنے رکھو۔ اُن میں نیند کی ٹکیہ بھی ہے۔''

شبنم نے دواؤں کو نکال کر بستر پر پھیلا دیا۔ رضی حیدر غور سے دیکھ کر بولا، ''بلو کلر والی ایک ٹکیہ کسی طرح اِنھیں کھلا دو۔''

پھر وہ روتی چندا کو چُپ کرانے لگا۔ باپ کی آواز اور بوسوں کا اُس پر جادوئی اثر ہوا۔ وہ چُپ ہو کر لیٹی لیٹی باپ کے رُخسار کو چھونے، پکڑنے لگی۔ جب وہ اُس کے پیٹ میں ٹھڈّی سے گُدگُدی لگاتا، تب وہ کِھلکِھلا کر ہنسنے لگتی۔

نیند کی دوا کِھلا کر شبنم اُن کے سر میں کدّو کا تیل ڈال کر مالش کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دوا اور مالش نے اثر دِکھایا۔ جب وہ سو گئیں، تب شبنم بیٹی کو گود میں لے کر شوہر کو ساتھ لیتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی۔

تھوڑی دیر بعد شبنم ساس کو دیکھنے اُن کے کمرے میں گئی۔ وہ گہری نیند میں تھیں۔ اُنھوں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ شبنم اُن کے پہلو میں مسند لگا کر کھانا اُٹھا کے اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ پھر اُس نے تولیہ بھگو کر رضی حیدر کا منہ پوچھا اور بیٹی کو سینے سے لگا کر بیٹھ گئی۔ جب اُس نے روٹی سبزی کا لقمہ بنا کر رضی حیدر کے ہونٹوں سے لگایا، تب وہ بولا، ''نہیں! پہلے ایک لقمہ خود کھاؤ اور دوسرا مجھے دو۔''

صرف ایک جملے نے شبنم کے وجود کو سیراب کر دیا۔ وہ مسکرا کر بولی، ''آپ بھوکے ہیں۔ جب آپ چار لقمہ کھائیں گے، تب میں ایک لقمہ......''

''شبّو! مدّتوں بعد گھر کا کھانا نصیب ہوا ہے......'' اُس کے لہجے میں سرخوشی تھی۔

شبنم بچے کی طرح، کھلانے لگی اور رضی حیدر مار کھائے بچے کی طرح ٹپ ٹپ آنسو بہاتے ہوئے کھا رہا تھا۔ اچانک وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بولا، ''شبّو! اب میں ایک مستقل بوجھ بن گیا تم سب پر......''

''اب سمجھ میں آیا۔ یعنی آپ اب تک ہم لوگوں کو ایک بوجھ کی طرح ڈھو رہے تھے۔'' وہ مخصوص ادا سے بولی۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔'' رضی حیدر نے فوراً احتجاج کیا۔

''زن و شو کا رشتہ اللہ جوڑتا ہے، جو باہمی اخلاص و محبت اور ایثار و وفا سے قابلِ رشک بن جاتا ہے۔ میں اور تو کا فرق مٹ جاتا ہے۔ اگر اچھے بُرے دن کو مل جُل کر کاٹا جائے تو بنواس میں بھی سیاحت سا لطف ملتا ہے۔ سمجھ میں آیا؟''

پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولی، ''اگر یہی حادثہ میرے ساتھ ہوتا، تب؟ میں بھی......''

اُس نے شبنم کے ہونٹوں پر رخسار ٹکا کر اُسے بولنے سے روک دیا۔ پھر وہ تشکر آمیز نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ اُسے محسوس ہوا کہ خشک پنکھڑی پر ٹھہری شبنم کی طرح شبّو بھی اُس کے وجود کو ٹھنڈک پہنچا رہی ہے۔ ذہن میں چبھا شبے کا پھانس نکل گیا۔ مایوسی اور احساسِ کمتری کے بادل چھٹ گئے اور اُس کے دل میں ایک نئی زندگی جینے کی للک پیدا ہو گئی۔

چندا باپ کے پہلو سے لگی سوئی تھی۔ رضی حیدر نے حادثے کی مختصر روداد سنائی۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ علاحدگی پسند عناصر کے ہاتھوں ایک نیم مردہ بہاری امتحان دہندہ کو اُس نے اسپتال پہنچایا تھا۔ اِسی پاداش میں اُس کے ہاتھ کاٹ کر ٹیکسی بھی جلا دی گئی۔ اتفاق سے گھر لوٹ رہے ایک ڈاکٹر نے اُسے سڑک کنارے پڑا دیکھ لیا تھا۔ اُس نیک دل انسان نے اپنے نرسنگ ہوم میں مفت علاج کر کے اُس کی جان بچائی۔ عجیب اتفاق کہ وہ ایک مراٹھی تھا۔ رضی حیدر نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ اُسے ڈسچارج نہیں کیا گیا تھا

بلکہ وہ اچانک بے قرار ہو کر نرسنگ ہوم سے نکل بھاگا۔

شبنم سوچنے لگی کہ دنیا بُرے لوگوں سے بھری ہے اور نہ اچھوں سے خالی۔ اُن لوگوں پر تو پہاڑ ٹوٹ پڑا ہوگا، جن کے سگے سمبندھی مارے گئے یا گمشدہ ہیں۔ گھر کا کفیل مرجاتا ہے، تب اُس کا کنبہ بھی جیتے جی مرجاتا ہے۔ معاوضے کی رقم مرنے والے کی جگہ نہیں لے سکتی۔ ایک اپاہج مزدور، مرتے دم تک اَنا کی لاش ڈھوتا ہے۔ ہمدردی اُس کے وجود کو تیزاب کی طرح چاٹتی ہے۔ پھر وہ دل میں علاحدگی پسندوں کو مخاطب کر کے بولی، ''تم لوگ دہشت پھیلا کر، اپاہج بنا کر اور شہر بدر کر کے مزدوروں کے حوصلے پست نہیں کر سکتے۔ دیکھتے نہیں! مزدوروں کی جلائی گئی جھونپڑیوں کی راکھ پر خودرو پودوں کی طرح جھونپڑیاں اُگتی رہتی ہیں۔''

خاموشی، مہیب شکل اختیار کرنے لگی، تب رضی حیدر نے کہا، ''شبّو! میں اِیرگن نہیں لا سکا اور اب ٹین کی چھت بھی نہیں لگوا سکوں گا......اور......اور......''

''ہاں!......ہاں!...... بولیئے نہ......اور کیا؟''

''اب میں دست درازی نہیں کر پاؤں گا اور بندر بھی مجھ سے نہیں ڈریں گے۔''

پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولا، ''شبّو! مرد اور مزدور کو اپنے بازو اور بیٹوں پر بڑا ابھیمان ہوتا ہے۔ میرے تو......''

اچانک شبنم سطحِ آب پر پھسلتی کشتی کی طرح رضی حیدر کے سینے سے جا لگی اور پے در پے بوسے لے کر اُس نے پوچھا، ''کچھ سمجھ میں آیا؟''

ہکّابکّا رضی حیدر اُسے دیکھتے ہوئے بولا، ''نہیں......''

''اب، میں دست درازی کروں گی۔ مجھے حساب برابر کرنا ہے نہ......''

پھر وہ اُس کے کان میں بولی، ''آپ کا دست و بازو میری کوکھ میں پل رہا ہے۔''

شدّتِ جذبات سے مغلوب رضی حیدر نے اپنا دایاں پاؤں شبنم کے بائیں پاؤں پر رکھ کر آنکھیں موندلیں، تب اُسے لگا کہ کٹے بازوؤں میں کونپلیں پھوٹنے لگی ہیں......

●

(ماہنامہ 'سب رس'، حیدر آباد اور 'نگینہ انٹرنیشنل'، سری نگر، 'تخلیق نمبر'، جلد۔ ۴۹، شمارہ۔ ۱، جنوری۔ جولائی ۲۰۱۷ء میں شائع)

مُہاجر

میں کرب و اذیّت کے گرداب میں پھنسا تھا۔ساتویں پسلی کی چبھن ناقابلِ برداشت ہونے لگی تھی۔رات آنکھوں میں کٹتی اور جھپکی میں بھی گزرے ایام کے فوٹیج رواں ہو جاتے۔اکثر شبِ تنہائی میں ماضی، اژدہے کی طرح گرفت میں لے کر آہستہ آہستہ پسلیاں چٹخاتے ہوئے جب مجھے زندہ نگلنے لگتا، تب جی یہ چاہتا کہ دَبے پاؤں کمرے سے نکل کر صحرا میں جاؤں اور ببول کے خاروں میں اپنے تمام کرب و بے بسی کو کھوس آؤں۔

عورت غنچے کی طرح منہ بند ہوتی ہے۔وہ بھی دھیرے دھیرے سوچ و عمل کی پنکھڑی کھولتی ہے۔اُس کا اصلی روپ دو بچوں کی پیدائش کے بعد عیاں ہوتا ہے۔وہ بھی برگِ حنا کی طرح اندر سے کچھ اور ہوتی ہے، یہ سمجھ مجھ میں نہیں تھی۔میری سوچ ساون کے اندھوں جیسی تھی۔میں نے قوسِ قزح کے خوش رنگ منظر کو آنکھوں میں بسائے رکھا اور ازدواجی زندگی کے اچھے دن انعامی رقم کی طرح فَر فَر خرچ کر دیئے۔وہ دور عجیب تھا۔منفی و مُضر باتیں مثبت لگتیں اور بہی خواہوں کے مشورے گمراہ کُن۔اِسی سبب خوشگوار ازدواجی زندگی کا بیڑا غرق ہوا۔پھر میں مجروح احساس و جذبات کا کرب و کسک جھیلنے لگا۔

میاں بیوی میں تُو تُو میں میں، سرحدی جھڑپوں سی ہوتی ہے، جس میں سیز فائر کا معاہدہ ٹوٹتا رہتا ہے۔وہ میری زندگی کا سیاہ ترین دن تھا۔بات ایک دوسرے کو اوقات بتانے پر مرکوز تھی۔اُس کی نظر کیا کیا دیکھتی اور ذہن کیا کیا سوچتا رہتا ہے، یہ بات اُس دن عیاں ہو گئی تھی۔اُس کا غیظ اور بغض و حسد بے قابو ہو کر منہ سے کود پڑا تھا۔وہ بولی تھی،

’’مجھ جیسی سہاگن سے اچھی بیوہ۔‘‘

میں ہکّابکّا رہ گیا تھا اور وہ قسمت کو کوستے ہوئے سسکنے لگی تھی۔

غصّے کو پی کر میں نے کہا تھا، ’’پاگل ہو گئی ہو؟ بیوہ، سہاگن سے اچھی ہو سکتی ہے؟‘‘

وہ بھڑک کر بولی تھی، ’’ہاں! کیوں نہیں؟ ہوتی ہے۔ جب آنکھوں پر پٹّی بندھی ہو، تب سامنے کھڑا ہاتھی بھی نظر نہیں آتا۔‘‘

میں سمجھ گیا تھا کہ اُس کی نظر میں کون ہے۔ میرے چھوٹے بھائی کی جواں مَرگی نے اُس کی بیوی کی زندگی بدل دی تھی۔ وہ پلک جھپکتے خود مختار اور پوری مِلکیت کی تنہا مالکن بن گئی۔ قدغن لگانے والا کوئی نہ رہا۔ سسرالی بندھنوں سے بھی مُکتی مل گئی۔ مانگنے والا ہاتھ کمانے لگا۔ حسن ورعنائی بھی مُراجعت کرنے لگی۔ اُس کے روز وشب اچھے گزرنے لگے۔ بچوں کی تعلیم جاری رہی۔ اُنھیں اتنا ہی فرق پڑا کہ وہ باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے۔

یہ سچ ہے کہ ماں مر جائے تو بیشتر بچے دھن دولت رہتے بے راہ رَو ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایک مفلس بیوہ ماں بھی بچے کو کسی طرح پال پوس کر کسی لائق بنا دیتی ہے۔ میں خوش تھا کہ بارِ کفالت مجھ پر نہیں پڑا۔ لیکن اُس کے رشک وحسد سے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ میں نے تُند وتُرش لہجے میں پوچھا تھا، ’’میری ماں تمھیں نظر نہیں آئی؟ اور......‘‘

وہ قطع کلام کرتے ہوئے بولی تھی، ’’خوب آئی۔ شوہر کے راج میں پھوٹی کوڑی کی محتاجی۔ زندگی روتے بلکتے کٹ رہی تھی اور بیٹوں کے راج میں عیش ہی عیش۔ سب کے نصیب میں یہ عیش کہاں؟‘‘

اُس کے دل ودماغ میں غیظ وغضب کی سونامی چل رہی تھی اور میں بھی آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اچانک مجھے لگا کہ اِس کی انوکھی خواہش کو پورا کرنے کا یہ صحیح وقت ہے، تب میں یہ کہتا ہوا گھر سے نکل گیا تھا کہ ’’ٹھیک ہے! میں تمھیں بھی عیش بھری زندگی کا تحفہ دوں گا۔‘‘

پھر میں اپنے مِشن کی تکمیل میں جُٹ گیا۔

اُس رات میں نے حسبِ منصوبہ منہ اندھیرے بستر چھوڑا تھا۔ گھر بار کو فساد زدہ شخص کی طرح الوداعی سلام کر کے تہی دست وپا پیادہ کوہستان کی جانب چل پڑا تھا۔ وقتِ ہجرت

نہ جانے کیوں میرے دل میں مُہاجرت کی کسک و ملال نہیں تھا بلکہ ایک عجیب سا طنطنہ، بے فکری اور بے مروّتی سمائی تھی۔ نہ موہ مایا دامن گیر تھی اور نہ کل کی چنتا۔ بستر پر وصیت نامہ، دستاویزات، بینکوں کے کھاتے، بلینک چیکس، اے ٹی ایم کارڈس مع پن نمبر، دُکان کی چابھیاں اور ایک رقعہ بھی رکھ دیا تھا۔ اگر چہ دل یہ چاہتا تھا کہ رقعہ میں لہو نچوڑ کر اور کلیجہ چیر کے رکھ دوں۔ پھر سوچا، کیا فائدہ؟ بلا القاب میں اتنا ہی رقم کر سکا تھا کہ ''میرے علاوہ سب کچھ تمھارے پاس ہے۔ اب تم بھی پُر عیش زندگی جی سکتی ہو......الوداع!''

نامعلوم پُر خطر پتھریلی ناہموار راہوں پر چلتے چلتے میں نڈھال ہو جاتا۔ جسم و جاں کا رشتہ اُستوار رکھنا آسان نہیں۔ شکم غذا، جسم آسودگی، ذہن سکون اور اَنا سر بلندی مانگنے لگتی، تب بدھ کا یہ سندیش ''چلتے رہو، چلتے رہو......'' حوصلے کو توانائی بخشتا۔ ذہن، موجِ دریا کی طرح رواں رہتا ہے۔ میں ماضی سے کترا کر چلتا، پھر بھی وہ بیتال کی طرح پیٹھ پر سوار ہو کر سوال کرنے لگتا۔

چلتے چلتے جب میں تھک کر چور چور ہو جاتا، تب کسی درخت کی چھاؤں میں، آکاش تلے یا کسی خوبصورت پُر شکوہ چٹان پر بیٹھ کر سُستانے لگتا۔ ایک دن جب میں بددعا زدہ منجمد شہزادے کی طرح بت بنا رہا، تب تکان بولی کہ عجلت کیسی؟ جب چلنا ہی سفر ہے تو سُستانا بھی اِسی کا حصّہ ہے۔ تازہ دَم انسان کم وقت میں لمبی مسافت طے کر سکتا ہے۔ یہ مشورہ جب کبھی صدائے بازگشت کی طرح سنائی دیتا، تب جسم زیرِ سیلاب مٹّی کے گھر کی طرح زمین بوس ہو جاتا۔ میں جتنی دیر سُستاتا جسم اُس سے زیادہ کا طلب گار رہتا۔

ایک دن میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ منزل طے شدہ ہوتی تو پیچھے مُڑ مُڑ کے دیکھتا۔ پھر بہت آگے نکل آنے کا احساس، سر خوشی بخشتا اور منزل کو جلد پالینے کی للک، قدموں کو رفتار دیتی۔ مجھے یاد ہے کہ دل کی مینا بولی تھی، ''تمھارا مقصد کسی مقام تک پہنچنا نہیں ہے بلکہ کولھو کے بیل کی طرح فقط چلنا اور ایامِ زندگی کے باقی ماندہ دِنوں کو خرچ کر دینا ہے۔ تم ایک سزا یافتہ قیدی ہو اور صحرا نوردی تمھاری سزا ہے۔''

مُہاجر پرندے بھی دورانِ پرواز دَم لیتے ہیں۔ چلتے چلتے جب میرا دَم اُکھڑنے

لگتا، تب میری نظر تھکی چڑیا کی طرح گوشہ ٔ عافیت تلاش کرنے لگتی۔ آرام کا وقفہ طویل تر ہو جاتا، تب میری سوچ از خود بدل جاتی ۔ دل و دماغ میں یہ خیال خلجان پیدا ہونے لگتا کہ سفر بیٹھ کر تو جاری نہیں رکھا جاسکتا اور نہ عزم کو کہنی سے جوئے شیر رواں ہوسکتی ہے، تب میں اُٹھ کھڑا ہوتا اور راہ چلتے ہوئے تازہ دَم رہنے کی ترکیب نکالنے لگتا۔ سحر انگیز فضا، آبشار کی موسیقیت اور خوش گلو پرندوں کے نغمے اکثر میرے قدم روک لیتے، تب میں شفاف جھرنے کی کسی محفوظ چٹان پر بیٹھ کے آرام سے منہ ہاتھ دھوتا اور چلّو سے پانی پیتا۔ پھر پانی میں پاؤں ڈالے قدرت کی رعنائیوں کا لطف لینے لگتا۔ مجھے لگتا کہ میری اُداسی، میرا غم و غصّہ اور دردِ ہجرت تلوے سے نکل کر پانی میں تحلیل ہونے لگا ہے۔ شگافوں میں جاؤ بکی چھوٹی مچھلیاں تھوڑی دیر بعد بے خوف ہوکر پاؤں کے گرد چکّر کاٹتے ہوئے زخموں کا بوسہ لینے لگتیں۔ یہ راحت بخش احساس شریانوں میں توانائی کی اضافی لہر دوڑا دیتا، تب میں اُٹھ کھڑا ہوتا اور شکم سیر آبی پرندوں کی طرح جو جی چاہتا وہی کرتا۔ تکان، وفادار کتّے کی طرح ساتھ ساتھ چلتی ۔ جب مجھ میں قدم بڑھانے کی سکت نہیں رہتی، تب میں بیٹھ کر پیروں کو دَباتا اور سہلاتا، پھر خِراماں خِراماں چلنے لگتا۔ میں اپنے آپ میں مگن رہنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ جہاں جو میسّر ہوتا کھا پی لیتا اور گوریلے کی طرح رات شاخوں پر گزارتا۔ سورج غروب ہوتا، مناظر بدل جاتے اور جب وہ طلوع ہوتا، تب ایک نیا سویرا لاتا۔ ہر دن تازہ تازہ اور ہر رات اَنچھوئی سی لگتی۔ مقام و حالات کے بدلتے معمولاتِ زندگی از خود بدل گئے۔ سوچ کا مرکز گھر پریوار سے منتقل ہوکر اپنی ذات اور جہدِ بقا پر مرکوز ہوگیا۔

ایک رات پونم نے چپکے سے اپنی چال چل دی۔ ذہن میں پورا منظر فلم کی طرح رواں ہوگیا۔ شادی کی پہلی سال گرہ میں وہ اُسے اپنے گاؤں لے گئی تھی۔ وہ موسمِ گرما کی ایک رات تھی۔ گاؤں کی اکلوتی پکّی عمارت کی دو منزلہ چھت پر وہ چاندنی کی رِدا اوڑھے اُس کے پہلو میں بازو پر سر رکھے لیٹی تھی ۔ اُسے گلابی لباس میں وہ شگفتہ گلاب سی لگی تھی۔ اُس کے جسم اور زلفوں سے نکلتی مدہوش کُن بو اُس کے حواس پر چھانے اور شہوت کو ہوا دینے لگی تھی۔ وہ اُس رات کو یادگار بنانا چاہتا تھا۔ وہ چیتے کی طرح گھات لگائے تھا۔ اگر وہ

خوابیدہ شیر خوار بچے کی طرح مسکرا دیتی، تب اُسے بوسہ ثبت کرنے کا جواز مل جاتا۔ پھر وہ دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگتا۔ لیکن وہ تو پپیہے کی ''پی کہاں، پی کہاں'' کی دِل سوز پکار سنتی ہوئی چاند کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کی لاتعلقی اور عدم التفات سے اُسے کوفت ہونے لگی تھی۔ آکروش اُس کے جسم و جذبات پر منفی اثر ڈالنے لگا تھا۔ اُسے پھر یہ احساس ستانے لگا تھا کہ اِس کا جسم اُس کے قبضے میں ہوتا ہے۔ لیکن ذہن و دل کہیں اور۔ اچانک اُس کے دل میں یہ شُبہ پیدا ہوا تھا کہ چاند سا مکھڑا والا اِس کا محبوب ہوگا اور مضطرب پپیہے کی پکار میں یہ اپنی صدا محسوس کر رہی ہے۔ سرا ملتے گرہ کھُل گئی۔ اِس نے سہاگ رات میں اُسے دانستہ تشنہ لب رکھا تھا۔ ''وہ'' نہیں، تو کوئی اور نہیں۔ یہ وعدہ، اِس نے اپنے آپ سے کیا ہوگا، تب اُسے لگا تھا کہ یہ جیون بگھی سے جُتی اُس گھوڑی سی ہے، جو ہم رِکاب گھوڑے کے ساتھ دوڑتی ہے، لیکن اُس کے دل میں چاہت و رَفاقت کا جذبہ نہیں ہوتا۔ اِسی لئے اِس کی خود سپردگی میں چاہت و جذباتیت اور معاونت نہیں بلکہ مقروض سا سبکدوشی کا جذبہ ہوتا ہے۔ اِسی سبب آتشیں لمحوں کے گزرتے اُسے لگتا کہ وہ لبِ ساحل اوندھے منہ گر پڑا اور اُس کے منہ و ناک میں ریت بھر گئی ہے۔

اچانک کسی بوڑھے کے کھانسنے کی آواز آنے لگی تھی۔ پھر ایک نوزائیدہ بچہ رونے لگا، جسے ماں پچکارنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر میں بچہ خاموش ہوگیا۔ لیکن بوڑھا کھانستا اور بلغم تھوکتا رہا۔

جب پپیہے نے چُپّی سادھ لی، تب وہ اپنے آپ میں لوٹ آئی تھی۔ پھر وہ سر اُٹھا کر اُسے دیکھتی ہوئی بولی تھی، ''آپ تو جاگے ہیں۔ مجھے لگا تھا کہ سو گئے۔''

وہ خاموش رہا، تب اُس نے اُسے کریدا تھا، ''کیا سوچ رہے ہیں؟''

''اور تم کن خیالوں میں ڈوبی تھی؟'' اُس نے پلٹ وار کیا تھا۔

''یہی کہ چکور کی پُرخلوص چاہت اور پپیہے کی اٹوٹ آس مثالی ہے۔ چکور اپنی کوششوں سے باز نہیں آتا اور پپیہے کا حوصلہ پست نہیں ہوتا۔''

''دونوں حقیقت ناآشنا ہیں۔'' اُس کا لہجہ تُرش تھا۔

خاموشی، اُکمن کے پھاہے کی طرح فضا میں تیرنے لگی تھی۔ خوش فعلیوں کا وقت ہاتھ سے نکلا جارہا تھا۔ اُسے لگا تھا کہ وہ مداری کا بندر ہے، جو حکم اور اشارے کا منتظر ہوتا ہے یا پھر صدا لگا کر در پر کھڑا پُر اُمید سائل۔

وہ اچانک اُس کے سینے پر ٹھڈی جما کر بولی تھی، ''ایک بات پوچھوں؟''

ٹھڈی چُبھنے لگی تھی، لیکن سینے کا دباؤ سرور بخش تھا۔ اُس نے اُمید کا دامن چھوڑا نہیں تھا۔ اور نہ وہ گفتگو میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ فی الوقت جواب کی منتظر تھی، تب اُس نے کہا تھا، ''پوچھیے! لیکن ایک سے زیادہ نہیں۔''

''آپ نے کسی سے محبت کی ہے؟'' اُس کی نگاہیں اُس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

اُسے لگا تھا کہ لڑکی دیکھنے گئی کوئی چالاک عورت، جس طرح صاحبِ خانہ کا کچن اور باتھ روم کو بھی دیکھ لینا چاہتی ہے۔ یہ بھی اُس کے دل کے نہاں خانے میں جھانکنا چاہتی ہے، تب اُس نے کہا تھا، ''محبت کی نہیں جاتی بلکہ ہو جاتی ہے۔ جیسے پیدائش کے بعد بچے اور والدین میں، شادی کے بعد میاں اور بیوی میں اور......''

وہ قطع کلام کرتے ہوئے بولی تھی، ''میں تو لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور ہیر رانجھا جیسی محبت کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔''

''میں اُن خوش نصیبوں میں شامل نہیں۔'' اُس کا لہجہ خشک اور سپاٹ تھا۔

''لیکن حسین خواب تو دیکھا ہوگا یا پھر کسی نے آپ کو اپنے دل کا شہزادہ بنایا ہوگا؟ پلیز! سچ بولیے گا۔''

پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولی تھی، ''مجھے صدمہ نہیں پہنچے گا کہ میں سچ کا سامنا کر سکتی ہوں۔''

خاموشی طویل ہونے لگی، تب اُس نے کہا تھا، ''خاموش کیوں ہیں؟ میں نے کہا نہ، میں سچ کا سامنا کر سکتی ہوں۔'' اُس نے اُسے بھروسا دِلایا تھا۔

''تو سنو! میں نے کوئی حسین خواب نہیں دیکھا۔ میرا تعلق کسی چاند سے نہیں رہا اور نہ کوئی پپیہے کی طرح مجھے آواز دے رہی ہے۔'' اُس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

اُسے یقین نہیں آیا تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اُسے لگا تھا کہ وہ خزاں رسیدہ پتوں پر دَبے پاؤں چل کر بے آواز نکلنے کی حماقت کر رہا ہے۔

اُس نے مشکوک لہجے میں پوچھا تھا، ''آخر کیوں؟''

پھر وہ ماہرِ نفسیات کی طرح اُس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی، تب اُس نے کہا تھا، ''وہ ایک حقیقت پسند انسان ہے۔ افرادِ خاندان کو غربت کی دلدل سے نکالنے کی ذمہ داری اُسی پر تھی۔ یہی اُس کا مشن تھا، جس میں وہ کامیاب ہوا۔''

اُس نے قدرے توقف کے بعد کہا تھا، ''جانِ من! تُم سے جُتا گھوڑا چاہ کر بھی دائیں، بائیں اور پیچھے نہیں دیکھ پاتا......''

وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر اُس کا ردِّ عمل دیکھنے لگا تھا۔ اُسے گمان و یقین کے درمیان معلّق دیکھ کر اُس نے کہا تھا، ''زندگی کے کینوس پر صرف شوخ رنگوں کا ہی استعمال نہیں ہوتا۔ سپنے کو ساکار بنانے کا جنون کبھی کبھی آدمی کو تپتے ریگستان میں لا کھڑا کرتا ہے۔ پھر پوری زندگی تشنہ لبی اور بھٹکاؤ کی نذر ہو جاتی ہے۔ ریشمی دھاگے میں غلطی سے بھی گرہ لگ جائے تو وہ گانٹھ کھولے نہیں کھلتی......''

وہ قطع کلام کرتے ہوئے بولی تھی، ''عشق و محبت عطیہِ ربانی ہے۔ خدا سب کو عاشق کا دل اور معشوق کا قُرب عطا نہیں کرتا۔ خواب دیکھنے والا ہی زندگی کو خوش رنگ بناتا اور عاشق ویران دل میں بھی زعفران کی کاشت کرتا ہے۔''

پُر سکوت فضا میں پپیہے کی پُکار پھر شگاف لگانے لگی۔ جب وہ لیٹ کر چاند کو دیکھتی ہوئی پپیہے کی پُکار میں اپنی صدا محسوس کرنے لگی تھی، تب اُسے لگا تھا کہ یہ پانی ہے اور وہ اُس پر تیرتا مٹی کا تیل۔ ساتھ ساتھ اور الگ الگ بھی۔ یہ سمجھتے اُسے دیر نہیں لگی تھی کہ یہ رات بھی ''اُسی'' کے نام مخصوص ہے اور یہ گلابی لباس ''اُسے'' پسند ہوگا۔ پھر وہ بچہ بن گیا تھا، جو عاشق و معشوق کی مِلن میں رخنہ ڈال کر خوش ہوتا ہے۔ اُس نے دوستانہ لہجے میں کہا تھا، ''یقیناً تم نے کوئی حسین خواب دیکھا ہوگا۔ کسی کو چاہا یا پھر کسی نے تمھیں اپنے دل کی ملکہ بنایا ہوگا۔ کسی کو چاہنا یا کسی کا منظورِ نظر ہونا اپنے بس میں نہیں۔ تم بھی بے کھٹک اپنے دل کی بات

سا اچھا کر سکتی ہو۔''

اُس کی نگاہیں چاند پر مرکوز تھیں۔اُس نے قدرے توقف کے بعد کہا تھا،''بیشتر دوشیزاؤں کے دل میں خوابوں کا شہزادہ ہوتا ہے۔لیکن......''

''لیکن کیا؟''اُس کی آواز جاں بلب مریض کی کراہ جیسی تھی۔

''لیکن سب خوش نصیب نہیں ہوتیں۔''اُس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

پھر وہ قدرے توقف کے بعد بے باک لہجے میں بولی تھی،''آپ مجھے بالکل بھی پسند نہیں تھے......لیکن......''

''جانِ من!لیکن کیا؟''اُس کا تجسس بجھتے چراغ کی طرح بھبک اُٹھا تھا۔

''لیکن اب آپ اچھے لگنے لگے ہیں۔''اُس نے مُسکرا کر کہا تھا۔

اعتماد کی جلتی چِتا کی بو اُس کے نتھنوں میں سما گئی تھی۔

اُس نے بیٹھ کر جوڑا بنایا۔پھر اُس کے اُداس چہرے پر وہ ایک نظر ڈالتے ہوئے بولی تھی،''ایسا ہوتا ہے۔شادی کے بعد میاں بیوی کی ضرورتیں قُربت پیدا کر دیتی ہیں۔لیکن قُربت اور محبت میں بڑا فرق ہوتا ہے،اُبلے انڈے کے چھلکے اور جھلی سی۔''

قدرے توقف کے بعد اُس نے کہا تھا،''آپ نے بھی بے میل جوڑوں کو ہنستے بولتے اور خوش وخرم زندگی گزارتے ہوئے دیکھا ہوگا۔یہ قدرت کا کرشمہ ہے۔بلّی کتے بھی ساتھ رہنے لگیں تو ایک ہی تھالی کٹورے میں مل بانٹ کر ساتھ کھانے پینے لگتے ہیں۔''

اُسے لگا تھا کہ وہ رَو میں زیادہ بول گئی ہے،تب اُس نے فوراً ایک بوسہ ثبت کر کے اُسے یہ بھروسا دِلایا تھا کہ اب وہ واقعی اُسے اچھا لگنے لگا ہے۔اُس نے حسبِ معمول جوڑا کھول کر اُس کے بازو پر سر رکھا۔پھر وہ اُس کے سینے سے چِپک کر جانگ پر جانگ چڑھا کے آنکھیں موند لی تھی۔اُس نے چاند کو دیکھا تھا۔اُسے لگا تھا کہ وہ بھی اُسے رقیب کی طرح رشک آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔اُسے آتش کا یہ شعر یاد آ گیا تھا،جسے اُس نے تحریف کے ساتھ دل میں اِس طرح پڑھا تھا،

شبِ وصل تھی،چاندنی کا سماں تھا بغل میں صنم تھا،خدا نا مہرباں تھا

پپیہے نے پھر چپّی سادھ لی تھی۔ خاموشی، کُہرے کی طرح دبیز ہونے لگی تھی۔ کھانستا ہوا بوڑھا سو گیا تھا، وہ بھی سو چکی تھی، لیکن وہ جاگ رہا تھا۔ اُس کا بھرم ٹوٹ چکا تھا۔ سینے سے لگ کر سونے کا بھید کھل گیا تھا کہ وہ اُسے وسیلہ بنا کر اپنے شہزادے سے ہم آغوش ہوتی ہے۔ یہ سوال پھانس کی طرح ذہن میں چُبھنے اور اذیّت دینے لگا کہ وہ شہزادہ ہے کون؟ اُس نے بندر کی طرح خود ہی زندہ زخم کی پپڑی نوچ لی تھی۔

اُس کی نیند اُس وقت ٹوٹی جب سورج کی نرم کرنیں پتّوں سے راہ نکال کر چہرے پر پڑنے لگی تھیں۔ وہ رات کے کس پہر تک جاگتا رہا، یہ اُسے معلوم نہیں۔

میں نے انگڑائیاں لے کر اطراف کا جائزہ لیا۔ جنگل کب کا جاگ چکا تھا۔ میں درخت سے اُتر کر جھرنے کی جانب جا رہا تھا کہ اچانک کھڑکھڑاہٹ اور پھپھکار سنائی دی۔ میں کھڑا ہو گیا۔ جھاڑی سے چند گز کے فاصلے پر نیولا اُچھلا۔ وہیں پھن پھیلائے مورچہ سنبھالے سانپ نظر آیا۔ مجھے تماش بینی کا شوق بچپن سے ہے۔ پھر بھی صبح صبح یہ لڑائی مجھے ناگوار لگی اور اِس خیال سے کوفت ہونے لگی کہ ہر جگہ جہد للبقا اور برتری کی جنگ جاری ہے۔ یہ دونوں بھی زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ نیولا بھوک مٹا کر اور سانپ جان بچا کر۔ یہ لڑائی سرحدی جھڑپ جیسی ہے، جس میں فتح و شکست طے شدہ نہیں ہوتی۔

میں نے ایک روڑا جھاڑی کی جانب اُچھالا، تب نیولا پھر اُچھلا۔ اب اُس کی نگاہ مجھ پر بھی تھی۔ لیکن سانپ ٹس سے مَس نہیں ہوا۔ میں نے جب دوسرا روڑا نیولے کی جانب اُچھالا، تب وہ مُڑ مُڑ کے مجھے دیکھتا ہوا نشیب میں اُترنے لگا۔ پلک جھپکتے سانپ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں یہ سوچ کر افسردہ ہو گیا کہ عارضی جنگ بندی مسئلے کا حل نہیں۔ جنگ، ذی روح کی جبلّت کا جزو ہے۔ اِسی طرح کی باتیں سوچتا ہوا میں آگے چل پڑا۔

ایک پھل دار درخت پر بندروں کا جُھنڈ اُچھل کود کر اپنی بھوک مٹا رہا تھا۔ گرتے پھلوں کو چوپائے اور گلہریاں کھا رہی تھیں۔ مل بانٹ کر کھانے کا یہ منظر مجھے اچھا لگا۔ اچانک دل کی مینا بولی، ''جنگل سب کو پناہ دیتا اور لکڑ ہارے کو بھی روزی فراہم کرتا ہے۔''

ایک جگہ سُست رو پانی میں جنگل کا عکس دیکھ کر میں اپنا سراپا دیکھنے لگا۔ میں اپنا

حُلیہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ بنکر سے نکالے گئے صدّام حسین کی طرح اُفسردہ چہرہ، دراز زلفیں، بے ترتیب داڑھی مونچھ، سیاہ حلقوں میں گردش کرتیں آنکھیں اور خشک پپڑی زدہ ہونٹ۔ میں نے جلدی سے ہتھیلیوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ ہتھیلی کی لکیریں نمایاں اور سوکھی چمڑیوں میں اُبھری نسوں کا جال سا بچھا تھا۔ مجھے لگا کہ میری صحت نے نادان بچے کی طرح ٹیلے سے نشیب کی جانب دوڑ لگائی ہے۔

مجھے یہ بھی احساس ہوا تھا کہ میں جنگل سے مانوس ہو چکا ہوں یا پھر جنگل نے مجھے قبول کر لیا ہے کہ اب کرب و کسک میں پہلے جیسی شدّت نہیں رہی۔ البتہ مجھے یہ پتا نہیں کہ اب تک زندگی کے کتنے دن خرچ ہوئے، آج کون سا دن اور تاریخ ہے۔

اُس دن نہ جانے کون سا پھل معدے میں منفی اثر ڈالا تھا کہ قے اور دست ہونے لگا تھا۔ پے در پے ہوتے دست نے نڈھال اور قے نے جسم کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ جب مجھ میں ہلنے ڈولنے کی بھی سکت نہ رہی، تب میں جھرنا کنارے نشیب کی جانب پاؤں کر کے فرش پر لیٹ گیا تھا۔

آسودگی اور نقاہت نیند کی سوغات لاتی ہے۔ میں کتنی دیر تک سوتا رہا، مجھے معلوم نہیں۔ نیند ٹوٹی، تب کسی طرح میں نے خود کو سُتھرا کیا اور ڈرتے ہوئے پانی پیا۔ پھر ایک درخت سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ اچانک میری نگاہ کالے چیونٹوں کی رواں قطار پر مرکوز ہو گئی، جو باہمی اشتراک سے ایک مکوڑے کی لاش کو گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ وہ اگر میرے پاس ہوتی، تب میں اُسے یہ منظر دِکھا کر سمجھاتا کہ گھر پریوار بھی باہمی اشتراک اور میل محبت سے چلتا ہے۔ ایثار و اعتماد اور اتصالِ جسم خوشگوار زندگی کو استحکام بخشتے ہیں، جب کہ تم ریشم کے کیڑے کی طرح خود ساختہ حصار میں جینا چاہتی ہو۔

پیٹ بولنے لگا اور تھوڑی دیر بعد پھر دست جاری ہو گیا۔ موت کا یقین ہوتے مجھے گھر پریوار کی یاد آنے اور اپنوں کی فکر ستانے لگی، تب مجھے لگا کہ میں بزدل فراری فوجی کی طرح دربدر بھٹک رہا ہوں۔ پھر مُہاجرت کی زندگی بے معنی اور خود اذیتی سی لگنے لگی۔ سوچ نے بھی عین موقعے پر ٹوٹے گواہ کی طرح پالا بدل لیا۔

مار گزیدہ کی طرح میرا ذہن کام کر رہا تھا۔ شبہات کے بادل چھٹنے لگے اور یقین کا سورج نمودار ہونے لگا۔ مجھے لگا کہ دو پاٹوں کے درمیان پستے معصوم بچوں کا شروع سے ہی بُرا حال ہے۔ وہ بھی نادم ہو کر ٹوٹ چکی ہوگی۔ اُس کی چٹانی ضد برف کی طرح پگھل گئی ہوگی۔ اُس پر رہ رہ کر ہیجانی کیفیت طاری ہوتی ہوگی۔ اُس کے کان اور بھی چوکنے ہو گئے ہوں گے۔ وہ ہواؤں کی دستک پر بھی خود دوڑ کر دروازہ کھولنے جاتی ہوگی۔ علاحدگی اور جدائی کا غم ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ وہ یقیناً میرے سینے سے لگ کر سکون پانے کے لئے مضطرب ہوگی۔

اچانک دل کی مینا بول اُٹھی کہ ''تم بھی تو اکھڑ، ضدّی اور بدزبان ہو۔ ساتویں پسلی کو جبراً سیدھا کرنا چاہتے ہو۔ درگزر، صبر و تحمل، اخلاص و ایثار اور فراخ دلی سے ازدواجی زندگی کو خوش گوار بنا سکتے تھے۔ دوشیزہ کا کورا دل طبق سا ہوتا ہے، جس سے چپک جائے اُسی کے وجود کا حصّہ بن جاتا ہے۔ اگر وہ بدچلن ہوتی، تب وہ اپنے ناکام عشق کا اظہار نہیں کرتی۔ اُس نے تمھیں قبول کر لیا ہے۔ وہ تمھارے بچے کی ماں ہے۔ تم نے غصّے میں کہی باتوں کو گھر چھوڑنے کا جواز بنا لیا۔ تمھارا یہ عمل احمقانہ بلکہ ظالمانہ ہے۔ تم نے کبھی اپنے عمل اور رویّے کا محاسبہ کیا؟ نہیں نہ۔ میں یاد دِلاتی ہوں۔ تم نے مل بیٹھ کر کھانا پینا، ہنسنا بولنا، چوڑی بندی اور انڈر گارمنٹ لانا بند کر دیا۔ مل جل کر تہواروں کی شاپنگ کرنے سے کترانے اور روپے تھما کر جان چھڑانے لگے۔ بیوی بچوں کی ناز برداری چھوڑ دی۔ تقریبات میں تنہا جانے اور ہر بات کو اُلٹا معنی پہنانے لگے۔ تم نے ہی گڈّھے کو کھائی بنا دیا......''

میں کتنی دیر تک مینا کی باتیں سنتا اور نادم ہوتا رہا اور کب آنکھ لگ گئی، مجھے معلوم نہیں۔ میری نیند اُس وقت ٹوٹی، جب مادہ پر قابو پانے کے لئے ایک گرگٹ میرے جسم پر سے دوڑتا ہوا گزرا اور اُسے دبوچ لیا تھا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ میں خود کو ہلکا پھلکا اور چنگا محسوس کرنے لگا۔ پھر میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ ساون کے آوارہ بادل ہم آغوش ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں چمک گرج کے ساتھ تیز بارش شروع ہو گئی، تب میں درخت سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

جھما جھم بارش ہوتی اور جنگل سیراب ہوتا رہا۔ پھر سورج کی کرنیں الوداعی سلام کرنے لگیں۔ پرندے پنکھ پھڑپھڑا کر بسیرا کے لئے اُڑنے لگے، تب گھر واپسی کے لئے میرے قدم بے تاب ہو گئے۔ پھر میں میلہ جاتے بچے کی طرح قدم اُٹھا کر چلنے لگا۔ دل کی مینا چہک کر بولی، ''صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اُسے بھولا نہیں کہتے۔''

●

('چہار سُو'، جلد ۲۶، شمارہ، مئی۔ جون ۲۰۱۷ء، راولپنڈی، پاکستان اور دو ماہی 'گلبن'، لکھنؤ جلد۔ ۴۰، شمارہ۔ ۶، نومبر۔ دسمبر ۲۰۱۷ء، میں شائع)

نوٹ: راقم الحروف نے ۱۸/اپریل ۲۰۱۷ء کو بذریعہ ای میل، مدیر رسالہ 'چہار سُو'، جناب گلزار جاوید کو طبع زاد وغیر مطبوعہ افسانہ 'مہاجر' برائے اشاعت ارسال کیا تھا، جسے موصوف نے ترجیحی بنیاد پر مئی، جون ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شاہد جمیل، گوجرانوالہ کے نام اور پتہ سے شائع کر دیا۔ متواتر گزارش کے باوجود اُنھوں نے معذرت / وضاحت شائع نہیں کی ہے۔ 'مہاجر' گوجرانوالہ کے مشہور و معروف فکشن نگار، جناب شاہد جمیل احمد کا افسانہ نہیں ہے۔

اصول پسند صحافی اور معتبر و ممتاز افسانہ نگار، محترم المقام سیّد ظفر ہاشمی، مدیر 'گلبن'، لکھنؤ نے راقم الحروف کے التماس پر ادارتی نوٹ کے ساتھ نومبر۔ دسمبر ۲۰۱۷ء کے شمارے میں افسانہ 'مہاجر' شائع کر کے اِس کی گھر واپسی میں مدد کی ہے۔ اللہ موصوف کو اور اُن جیسے صحافی کو صحت کے ساتھ سلامت رکھے تا کہ دیانت داری کی روایت قائم رہے، یہی میری دعا ہے۔

یہ خصوصی اطلاع محققین اور بالخصوص اُن قارئین کے لئے ہے، جو افسانہ 'مہاجر' کو رسالہ 'چہار سو' راولپنڈی، پاکستان میں پڑھ چکے ہیں یا پڑھیں گے۔

اپنے پرائے

پٹنہ ریلوے پلیٹ فارم پر بیٹھا ہری نارائن بے حد تھکا اور بھوکا تھا۔ وہ گرم پوریوں کا خواہاں تھا۔ ایک میل ٹرین پلیٹ فارم پر آکر ٹھہری، تب ٹرالی والے نے پوریاں تلنا شروع کیا۔ وہ پوری سبزی خرید کر بینچ پر آبیٹھا۔ اُسے فوراً ٹھگے جانے کا احساس ہوا۔ ٹرالی والے نے دو باسی پوریوں کو کھپا دیا تھا۔ وہ من مار کر رہ گیا۔ اُس نے باسی پوریوں کو روبرو بیٹھے کتّے کے سامنے اُچھال دیا۔ وہ پلک جھپکتے اُنھیں چٹ کر کے بیٹھ گیا۔ اُس نے سوچا کہ یہ بھی بھوکا ہے۔

ہری نارائن نے کسی کتّے کو پہلی بار محبت بھری نظروں سے دیکھا تھا۔ یہ کوئی غیر معمولی پالتو کتا نہیں تھا۔ یہ اُجلا پیدا ہوا ہوگا۔ لیکن اب اِس کا رنگ مَٹ میلا ہو چکا تھا۔ ہولی میں ڈالے گئے رنگ پھیکے پڑ چکے تھے۔ کسی منچلے نے اِس کے کولہے پر پان کی پیک پھینک دی تھی، جس کا رنگ چیخ اور نمایاں تھا۔ اِس کے جسم پر تیل ڈالڈے کا منفی اثر نظر آرہا تھا۔ جگہ جگہ روئیں اُڑے ہوئے تھے۔ وہ بار بار پنجے مار کر جسم کو کھُجلاتا اور بے قابو ہو کر دانتوں سے زخمی چمڑوں کو کچکچانے لگتا۔ نم زخموں پر مکھیاں بھِنبھنا رہی تھیں۔ وہ عاجز ہو کر مکھی کو منہ سے پکڑنے کی کوشش کرتا۔ پلیٹ فارم پر لاوارث بچوں کی بڑھتی تعداد اور جوٹھن کی گھٹتی مقدار کے سبب کم عمری میں ہی اِس کی جوانی ڈھلان پر تھی۔ کان کی جڑوں میں چپکے اُٹھیل جب خون چوسنے لگتے، تب وہ بلبلا کر پنجے سے کانوں کو کھُجلاتا۔ پھر وہ کان پٹپٹانے لگتا۔

ہری نارائن متحیّر تھا کہ صرف دو باسی پوریوں نے اِس کی آنکھوں میں اپنائیت بھر

دی ہے۔

اُسے بچپن کی شرارتوں پر ندامت ہونے لگی۔ وہ سوچنے لگا کہ بچپن میں وہ اکثر کتّوں کو طرح طرح کی اذیتیں دے کر خوش ہوتا تھا۔ کتّے پر نظر پڑتے اُسے نت نئی شرارتیں سوجھنے لگتیں، جنھیں عملی جامہ پہنانے میں اُسے خوب مزہ ملتا تھا۔

بچپن کی شرارتیں اُسے یاد آنے لگیں۔ ایک دن اُس نے ایک سوئے کتّے کی دُم پر تھوڑا سا پٹرول ٹپکا دیا تھا۔ وہ گھبرا کر اُٹھا اور دانتوں سے دُم کھجلانے لگا تھا۔ جب اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، تب وہ پوری قوت سے دوڑنے لگا تھا۔ بے تحاشہ دوڑتے کتّے کو دیکھ کر لوگ سمجھ گئے تھے کہ یہ کارستانی ہریا کی ہے۔ ہولی کے دن اور دیوالی کی رات کتّوں کی شامت آجاتی تھی۔ اذیّت جھیل چکے کتّے بے حد چوکنے رہتے۔ اُن کے دلوں میں اِس قدر دہشت سمائی رہتی کہ جب کبھی وہ جھوٹ موٹ زمین سے پتھر اُٹھا کر کسی کتّے کو مارنے کی اداکاری کرتا، تب وہ بھی چوٹ کھائے کتّے کی طرح ہی کیں، کیں کرتا ہوا تین ٹانگوں سے بھاگتا۔

ہری نارائن کو سابقہ کرتوت پر پشیمانی ہونے لگی۔ اُس نے سوچا کہ کتا فطرتاً حریص ہوتا ہے۔ ہمیشہ اُس کی رال ٹپکتی رہتی ہے اور وہ زمین سونگھتا پھرتا ہے، پھر بھی وہ صابر ہوتا ہے۔ جب کہ بلّی موقع شناس، مطلبی اور بد خصلت ہوتی ہے۔ وہ حق واختیار اور اعتماد کا بے جا استعمال کرتی ہے۔ موقع ملتے وہ اندھے مالک کے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاتی ہے۔

جذبات سے مغلوب ہری نارائن اچانک بینچ سے اُٹھا اور کتّے کے جسم کو سہلانے لگا۔ اُسے اب یقین ہو گیا کہ راہِ وفاداری میں کتا، آدمی سے دو قدم آگے آگے چلتا ہے۔ وہ احسان فراموش اور کینہ پرور نہیں ہوتا۔ دُتکارا کتا بھی پچکارتے کوں، کوں کرتا ہوا پوری قوت سے دُم ہلا کر اظہارِ محبت کرنے لگتا ہے۔ محبت کا لمس پاتے اُس کی آنکھوں میں ممنونیت نمی کی طرح تیرنے لگتی ہے۔

ہری نارائن اعلان سننے کے لئے اُٹھ کر ساؤنڈ بکس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ گاڑی اب ایک گھنٹہ لیٹ سے چل رہی تھی۔ وہ پھر بینچ پر آبیٹھا۔ اچانک اُس کی بے کلی بڑھ گئی۔ وہ فوراً سے پیشتر ممبئی پہنچنا چاہ رہا تھا۔ گھر پریوار سے اُس کا رشتہ ایک بار پھر سے ٹوٹ گیا۔ اُس نے دکھی من کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اب گاؤں گھر میں بچا ہی کیا ہے۔ باپ اور ماں زندہ نہیں۔ ایک بہن تھی وہ بھی چل بسی۔ بچپن کے ساتھی سنگی روزی کمانے پنجاب،

آسام، دلّی اور نہ جانے کہاں کہاں چلے گئے۔ اُسے مردہ ٹھہرا کر بھائیوں نے زمین جائداد کا آپسی بٹوارہ کرلیا۔ چند مُکھی کی وِدھوا ماں نے مرتے سَمے نراش ہو کر بیٹی کا ہاتھ اُس کے دوست نندو کو تھما دیا تھا، جسے وہ ساتھ لے کر لدھیانے چلا گیا۔ گاؤں میں اب ایسا کوئی آکرشن نہیں رہا، جو اُس کے پاؤں کی بیڑی بن جاتا۔

ہری نارائن سوچنے لگا کہ سچ ہے ایک یُگ میں بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ اُسے بھی پریورتن نظر آیا۔ جن، دَھن بے تحاشا بڑھے ہیں۔ لوگوں کے وِچار بدلے اور آپسی پریم گھٹا ہے۔ اب راج نیتی گھر میں بھی کی جانے لگی ہے۔ پنچ، پرمیشور نہیں رہے۔ لوک لاج سماپت ہو رہی ہے۔ لڑکیاں گھر میں بھی سُرکچھت نہیں۔ ابودھ بچی کا بھی بلاتکار ہو رہا ہے۔ اَپہرن ایک بیوپار بن گیا ہے۔ اَدھیکار ہنن کا رُجحان بڑھا ہے۔ خوشحال پَریوار بھی غریبی ریکھا کے نیچے گھُس آئے ہیں۔ راشن کراسن کوپن سے اور اسکول میں بچوں کو مدّھیان بھوجن اور لڑکیوں کو سائیکل ملنے لگی ہے۔ ریڈیو کی جگہ ٹی وی نے لے لی ہے۔ بچے بھی موبائیل فون سے فوٹو کھینچتے، وی ڈی او بناتے، طرح طرح کے فوٹو، فوٹیج دیکھتے اور فارورڈ کرتے ہیں۔ دودھ بوتھوں پر بکنے لگا۔ گنگا نے اپنا مارگ بدل لیا ہے۔ اُس کا پشتینی کچّا گھر بھی دو منزلہ مکان میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ٹریکٹر، تھیریسر اور بیلیرو دروازے کی شان بڑھا رہے ہیں۔ بجلی اور خوشبو پٹنہ میں رہ کر پڑھ رہی ہے۔ گھونگھٹ کاڑھے کھانا پروسنے والی بڑکی بھوجی مکھیا اور چھٹکی سرکاری اسکول کی ماسٹرنی بن گئیں۔ سرکاری یوجناؤں کے لابھ کے لئے آدھار کارڈ کو اَنیواریہ کر دیا گیا ہے۔ لیکن ایک یُگ کے بعد بھی بھائیوں کے من مزاج اور سُبھاؤ میں رتّی برابر بدلاؤ نہیں آیا۔

ہری نارائن گاؤں کی اچھی بُری باتوں سے واقف ہو چکا ہے۔ اُسی کی جدائی کے غم میں ماں مری۔ بھائیوں نے چھل وِدّیا سے بہن کی شادی کی تھی۔ نردوش وینا کو سسرال والوں نے جہیز کی بلی بیدی پر چڑھا کر ہی دَم لیا۔ وہ سات ماہ کی گربھوتی تھی۔ کاش! وہ گھر نہیں لوٹتا۔ کم سے کم ماں اور بہن کے زندہ ہونے کا بھرم تو بنا رہتا۔

اچانک اُس کے ذہن میں تیرہ سالہ ہری نارائن مجسّم و متحرّک ہو گیا۔ گاؤں والوں کی روز روز کی شکایتوں اور دھمکیوں سے تنگ آ کر اُس دن بڑکے بھیّا نے اُس کی جم کر پٹائی کر دی تھی۔ پھر وہ غصّے میں گھر سے فرار ہوا تھا۔

اُس دن مار کھا کر اُس نے یہی سوچا تھا کہ اب اُسے اپنے طور پر جیون جینا ہے۔ بھگوڑے کے ذہن میں منصوبہ ہوتا ہے۔لیکن عمل در آمد اُس کے اختیار میں نہیں ہوتا۔وقت اور حالات اُسے کٹھ پتلی کی طرح نچاتے ہیں۔

اتفاق سے پٹنہ جنکشن پر ممبئ جانے والی گاڑی کھڑی تھی۔وہ اُسی پر سوار ہو گیا تھا۔بڑکے بھیّا کی جیب سے دس روپۓ اور چھٹکی بھوجی کے بکسے سے پچیس روپۓ ملے تھے۔ پینتیس روپۓ میں چھ روپۓ بس کرایہ اور دو روپۓ کھانے پینے پر خرچ ہو گئے تھے۔اُس کی جیب میں اٹھائس روپۓ اور سامنے تاریک مستقبل تھا۔

اچانک چلتی ریل میں ٹکٹ چیکنگ شروع ہو گئی تھی۔اُس کی شکل دیکھتے ہی ٹی ٹی اِی کے ساتھ چل رہے ایک اَدھیر عمر سپاہی نے اُسے بلا ٹکٹ سفر کرتے پکڑ لیا تھا۔دو سو پچاس روپۓ جرمانہ ادا کر کے اگلے اسٹیشن پر اُتر جانے کا فرمان سنتے ہی وہ رونے کلپنے لگا تھا۔جامہ تلاشی میں برآمد اَٹھائس روپۓ چھین کر سپاہی نے اُسے ٹی ٹی اِی کے حوالے کر دیا تھا۔اُس کی منّت وسماجت کو بے اثر ہوتے دیکھ کر ایک بوڑھی عورت کو اُس پر دَیا آ گئی تھی۔وہ جاتے ہوۓ ٹی ٹی اِی سے ملتجی لہجے میں بولی تھی،''ٹی ٹی بابو! روپۓ اِسے لوٹا دیجیۓ،بچہ ہے۔یہ بھوکوں مر جاۓ گا......''

''ٹھیک ہے ماتا جی! اِسے جیل بھیج دیتا ہوں؟ وہاں موپھت میں رہنے کھانے کا بندوبست ہے۔بھوکو نہیں مرے گا بلکہ بَوا موج کرے گا،موج۔'' سپاہی کا لہجہ تُرش اور طنزیہ تھا۔

وہ فوراً بولی،''نہیں! نہیں! وہاں سے تو چور،ڈاکو بن کے نکلے گا۔نیتا بننا سب کے بھاگیہ میں نہیں ہوتا۔اچھا،کچھ ہی روپۓ لوٹا دو۔بیٹا! بڑھیا کی بنتی کی لاج رکھ لو۔اِس کا چہرہ دیکھ کر لگ رہا ہے،یہ کسی پِتا کا مارا ہے......''

ٹی ٹی اِی کے بڑھتے قدم رُکے نہیں۔وہ اَن سنا کر کے اپنے کام میں لگا رہا۔سپاہی ایک نئے ملاّ کو گرفت میں لے کر معاملہ پٹانے لگا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ٹی ٹی اِی دس روپۓ کا ایک نوٹ بوڑھی عورت کی ہتھیلی پر رکھ کے آگے بڑھ گیا،تب اُس نے آنچل کی کھونٹ میں بندھے پیسوں سے گن کر ایک ایک روپۓ کے دس نوٹ نکال کر سیدھا کیا۔پھر دس کے نوٹ کو سب سے نیچے رکھ کر اُسے دیتے ہوۓ بولی،''اِسے رکھ لو۔ہاتھ روک کر کھرچ کرنا۔بیٹا! پردیس میں اپنوں سے بڑھ کر پیسے ہی

کام آتے ہیں۔''

وہ روپئے کو مٹھی میں دبائے کچھ دیر تک بیٹھا رہا۔ پھر وہ اُٹھا اور ٹوائلٹ میں جا گھسا۔ وہاں کسی نے ناجائز تجارتی سامان چھپا رکھے تھے۔ ضروریات سے فارغ ہوکر اُس نے لنگوٹ کو اچھی طرح باندھا۔ پھر روپئے کو اُس میں رکھ کے اُس نے خود کو آئینے میں دیکھا تھا۔ اُسے چہرہ، جھلسے ہوئے ببول کے پیڑ کی طرح اُجاڑ اور آنسو کی لکیریں، مردہ نہر سی لگیں۔ اُس نے پانی کے دو تین چھپاکے منہ پر مار کر دامن سے چہرہ خشک کیا۔ پھر گیلی اُنگلیوں سے اُلجھے بالوں کو سنوارا اور چلّو سے پانی پی کر وہ باہر نکلا، تب اُسے گرم ہوا بھی خوشگوار لگنے لگی تھی۔

اُسے تروتازہ دیکھ کر وہ شفیق عورت مُسکرائی، تب اُسے ماں کی مُسکان یاد آگئی تھی۔ وہ اکثر روٹی دہی کھاتے وقت روٹی کے دونے بنا بنا کر دہی کی کٹوری خالی کر دیتا تھا، تب ماں اِسی طرح مُسکراتے ہوئے خالی کٹوری بھر کے اُس میں تھوڑا سا بھورا بھی ڈال دیتی تھی۔ اُس نے سوچا تھا کہ ماں کا دل گلاب کی پنکھڑی سا نرم ہوتا ہے اور اُس کی ممتا پنکھڑی پر چمکتی دلکش شبنم سی۔ پھر اُس عورت کو کنکھی سے دیکھتے ہوئے اُس نے من میں دھیرے سے پُکارا، ''ماں!''

وہ عورت اُسے دیکھتے ہی کھڑکی سے پرے ہوکر بولی تھی، ''آ بیٹا! یہاں بیٹھ جا۔''

کسی نے آر ایم ایس کی ٹرالی کو راستہ دینے کے لئے جلدی سے اپنا ٹرنک کھینچا، تب ہری نارائن کا جسم سہر اُٹھا۔ وہ فوراً ماضی سے حال میں لوٹ آیا۔

ہری نارائن کی نگاہ الکٹرونک ڈسپلے بورڈ پر مرکوز ہوگئی۔ گاڑی آدھا گھنٹہ اور لیٹ ہوگئی تھی۔ کتا اُس کے قدموں سے لگ کر سویا گیا تھا۔ قطار بند لال چیونٹیاں ایک دوسرے کو میسج پاس کرتی ہوئی اُسی کے تھیلے سے آ جا رہی تھیں۔ اُس نے جلدی سے ڈبّہ نکال کر دیکھا۔ کئی بسکٹ کے کور جھڑ چکے تھے۔ یادوں کی یلغار سے اُس کا سر پھوڑے کی طرح ٹبھکنے لگا تھا۔ چائے کی طلب شدّت اختیار کرنے لگی، تب وہ تھیلا اُٹھا کر ٹی اسٹال کی جانب چل پڑا۔

کتے اپنوں کی بو پا لیتے اور قدموں کی آہٹ پہچان جاتے ہیں۔ سویا کتا نیم وا آنکھوں سے اُسے جاتے ہوئے دیکھ کر اُٹھا۔ پھر انگڑائی لی اور کان پٹپٹا کر اُس کے پیچھے

پیچھے چلنے لگا۔ ہری نارائن نے سالم بچے بسکٹ کو نکال کر ڈبے کو کتے کے سامنے اُلٹ دیا۔ چائے پیتے ہوئے اُس نے سوچا، رشتے بنتے، ٹوٹتے اور ٹوٹ کر پھر جڑ جاتے ہیں۔ کچھ دیر پہلے تک یہ اُس کی نظر میں ایک معمولی آوارہ کتا تھا، لیکن اب یہ اُس کا ہمدم ہے۔ پلک جھپکتے دشمنی، دوستی میں بدل گئی۔ چائے پی کر وہ ٹہلتا ہوا شیڈ سے باہر نکل آیا۔ کتا، محافظ کی طرح ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ایک بینچ پر بیٹھ کر اُس نے کتے کو پچکارا۔ وہ اُچک کر اُوپر آبیٹھا۔ پیار سے اُس کے جسم کو سہلاتے ہوئے وہ بولا، ''دوست! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمھارے رشتے داروں کو بہت ستایا اور اُن پر اَتیا چار کیا ہے۔ بچہ تھا نہ، عقل سمجھ اور اپنے پرائے کی پہچان نہیں تھی......''

لمس سے سرشار کتا سر اُٹھا کر ''کوں، کوں'' کرنے لگا۔ اُسے لگا کہ وہ کہہ رہا ہے، ''کوئی بات نہیں یار! دشمنی کے بعد کی دوستی اَٹوٹ ہوتی ہے۔''

ہری نارائن جذبات سے مغلوب ہو کر اُس کا سر سہلاتے ہوئے بولا، ''چل ہاتھ ملا۔ اب تو میرا جگری دوست ہے۔''

پھر اُس نے کتے کا دایاں پنجہ پکڑ کے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

اچانک نم آنکھوں میں، ہم جماعت صلاح الدّین مجسم و متحرک ہو گیا۔

اُس دن ایک زخمی کتا اُسے دیکھتے ہی تین ٹانگوں سے گرتا پڑتا بھاگا تھا۔ جب وہ بھاگتے کتے پر بھی نشانہ سادھنے لگا تھا، تب صلاح الدّین نے اُس کا ہاتھ پکڑ کے کہا تھا، ''ہری! بے زبان کی بد دعا لگ جاتی ہے۔''

''نہیں لگتی۔'' اُس نے سختی سے انکار کیا تھا۔

''یار! سچ کہتا ہوں لگ جاتی ہے۔'' اُس نے پُر اعتماد لہجے میں کہا تھا۔

''اور میں کہتا ہوں نہیں لگتی، نہیں لگتی۔'' اُس نے پھر تردید کی تھی۔

''ہری! میری اماں سے پوچھ سکتے ہو۔'' وہ بے بس ہو کر بولا تھا۔

''صلّو! میرے بھائیوں کے ہاتھ پیر ٹوٹے؟ نہیں نہ۔ ٹرک سے کچل کر مرے؟ نہیں نہ۔ میری بد دعا لگی؟ نہیں نہ۔ پھر اِن کتّوں کی بد دعا مجھے کیسے لگ سکتی؟'' اُس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

''ہری! میں جانتا ہوں۔ جب کوئی تیری شرارتوں کی شکایت کرنے تیرے گھر جاتا ہے، تب بڑے اور کبھی چھٹکے بھیا تجھے بے رحمی سے مارتے پیٹتے ہیں۔ لیکن اِن کتوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' اُس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''پھر بھی مارتا ہے؟'' اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

''یار! کیا کروں؟ بڑوں کو میں مار نہیں سکتا نہ۔'' اُس کے لہجے میں جلے دل کا دھواں بھرا تھا۔

قدرے توقف کے بعد صلّو نے کہا تھا، ''اب سمجھا! تیرے دل میں غم، غصہ، نفرت اور بے بسی بھری ہے۔ اِسی لئے تو بے زبانوں پر کھیس نکالتا ہے۔ راہ چلتے پودوں کی ٹہنیاں توڑتا، چیونٹی کے گھروں اور بلوں میں پیشاب کرتا اور پتھر مار کر گھونسلے گرا دیتا ہے۔ ہری! تو میرا دوست ہے۔ میں نہیں چاہتا، تجھے بے زبانوں کی آہ لگے۔ بری حرکتوں سے باز آجا! میں اماں سے کہہ کر تیرے لئے بھی دعا منگواؤں گا، پھر دیکھنا! دونوں بھائی تجھے پیار کرنے لگیں گے۔ سچ کہتا ہوں، ماں کی دعائیں فوراً قبول ہوتی ہیں......''

ایک لوکل ٹرین پلیٹ فارم پر آکر رُکی، تب ہری نارائن پھر ماضی سے حال میں لوٹ آیا۔

ہری نارائن کو لگا کہ سچ مچ اُسے بے زبانوں کی بددعا لگی ہے، تب ہی چاہنے والے بچھڑ گئے۔ لیکن اُس کی سوچ نے کروٹ بدلی۔ اُس نے سوچا کہ اگر بددعا لگتی تو ممبئی میں اُسے بشیر ماما ہرگز نہیں ملتے۔

بشیر ماما کی یاد آتے ہری نارائن کے ذہن میں ممبئی کے پہلے سفر کا فوٹیج از خود رواں ہو گیا۔

پلیٹ فارم پر اُتر کے وہ تیز قدموں سے چل کر پارسل گھر کے نزدیک ایک ٹرالی پر جا بیٹھا تھا۔ وہ باہر نکلنے کی ترکیب نکال ہی رہا تھا کہ ایک پولس کو اپنی جانب آتے دیکھ کر وہ اُٹھا اور انجن کی طرف بڑھتا ہی رہا۔ اُس نے سوچا تھا کہ غیر متعینہ منزل کا پتا ٹھکانہ نہیں ہوتا ہے۔ لیکن کھڑے رہنے سے بہتر چلتے رہنا ہے۔ پیدل چلتے چلتے جب اُس کے قدم لڑکھڑانے لگے، تب وہ سڑک کنارے کھڑا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر میں ایک

پولیس والا لپک کر قریب آیا اور سخت لہجے میں پوچھا تھا، ''اوئے! تیرے کو کدھر جانا؟''
اُسے لگا تھا کہ پولیس کی آنکھوں میں نمی کی جگہ شک وشبہات تیرتے رہتے ہیں۔
'پبلک فرینڈلی پولیس' اور 'مے آئی ہلپ یو' انتخابی سلوگن جیسے بے اثر نعرے ہیں۔ اُسے خاموش دیکھ کر وہ تحکمانہ لہجے میں بولا تھا، ''چلو! بڑھو! یہاں رُکنے کا نہیں...... کیا سمجھا؟''

وہ آگے بڑھتا رہا۔ بھوک اور تکان سے نڈھال ہو کر وہ نل سے پانی پی لیتا تھا۔ رات ہوئی تو اُسے پولس والے جگہ جگہ نظر آنے لگے۔ سُستانے اور رات کاٹ لینے کی نیت سے وہ پہلی بار ایک مندر میں داخل ہوا اور شردھالوؤں کے درمیان جا بیٹھا تھا۔ لنکا دھن کی کتھا سنتے ہوئے وہ سمئے کاٹ رہا تھا کہ ایک آدمی آیا اور پوچھ تاچھ کرنے لگا، تب وہ اُٹھا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا تھا۔ کچھ ہی دور تک تیز تیز چلنے سے اُسے اُبکائی آنے لگی، تب وہ سڑک کنارے بیٹھ گیا تھا۔ اُلٹی نہیں ہوئی۔ لیکن پت نکلنے سے منہ کا سواد بگڑ گیا تھا۔ وہ ہمت کر کے اُٹھا اور دھیرے دھیرے چلنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کا سر چکرانے لگا، تب وہ پھر بیٹھ کر سُستانے لگا تھا۔ اچانک اُس کی نظر ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے پر جا پڑی۔ وہ بھٹکتا ہوا اسٹیشن کے قریب آ گیا تھا۔ یہ خوشی اُسے ساون کی پہلی پھوہار سی راحت بخش لگی تھی۔

پھر وہ بے خوف مسافر خانے میں گیا اور سوئے پڑے مسافروں کے درمیان فرش پر لیٹ گیا تھا۔ تھکے جسم کو سکون اور من کو شانتی ملی، تب اُس کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ مسافر خانہ بھگوڑوں اور بے گھروں کو بھی شرن دیتا ہے۔

اُس کی نیند اُس وقت ٹوٹی، جب فرش کی صفائی کے لئے بہائے گئے پانی سے اُس کے کپڑے گیلے ہو گئے تھے۔ سر کے نیچے رکھا تھیلا غائب تھا، تب اُسے ماں سے سنا راجہ ہریش چندر کی بپتا کا واقعہ یاد آ گیا تھا۔

گہری نیند نے تکان کم کر دی تھی۔ لیکن جاگتے بھوک اور پیاس بھی جاگ اُٹھی تھی۔ ہوٹلوں میں کھاتے پیتے لوگوں کو دیکھ کر اُس کا صبر جواب دینے لگا تھا۔ اُس کے جی میں یہ خیال آیا تھا کہ وہ بھکاریوں کی صف میں جا بیٹھے، لیکن وہ ہمت نہیں جٹا پا کا تھا۔ اُسی دن اُسے یہ احساس ہوا تھا کہ بھیک مانگنا بھلے ہی آسان کام لگتا ہو۔ لیکن پہلی بار کسی کے سامنے ہاتھ پسارانا آسان نہیں ہوتا۔

بھوک پیاس نے جسم کی توانائی چوس لی تھی۔ آنکھوں کی روشنی ماند پڑنے لگی اور پاؤں بے قابو ہونے لگے تھے۔

ایک سرکاری نل سے بہتے ہوئے پانی کو دیکھ کر پانی پینے کے لئے دل مچلنے لگا، تب وہ اُلٹی کے خوف کو درکنار کر کے پانی پینے لگا تھا۔ پانی پی کر وہ دو قدم ہی چل پایا تھا کہ اُلٹی شروع ہو گئی، تب وہ زمین پکڑ کر ڈولتے ڈولتے لڑھک گیا تھا۔

وہ دیکھ سن رہا تھا، لیکن وہ بول نہیں پا رہا تھا۔ 'بہار فرنیچر ہاؤس' سے ایک آدمی کئی لڑکوں کے ساتھ دوڑتا ہوا آیا اور اُسے اُٹھا کے دُکان میں لے گیا۔ پھر اُسے صوفے پر لِٹا کر اِسٹینڈ فین کا رُخ اُس کی جانب کر دیا تھا۔

ایک اُدھیڑ راہگیر، جس نے اُسے لانے میں مدد کی تھی، وہ بولا تھا، ''اِسے اسپتال لے جانا پڑے گا......''

''اِس کی ضرورت نہیں۔'' اُسی آدمی نے اعتماد سے کہا تھا۔

منہ پر پانی کا چھینٹا پڑتے وہ ہڑبڑا کر اُٹھنے لگا تھا، تب اُس نے کہا تھا، ''گھبرانے کی بات نہیں ہے، تمھیں کچھ نہیں ہوا۔ چکّر آ گیا تھا۔ اب تم ہاتھ منہ دھو کر کچھ کھا پی لو۔''

پھر اُس نے چلاّ کر کہا، ''رادھے شیام جی! ایک پلیٹ پوری سبزی جلدی سے بھیج دینا۔''

سڑک پار دُکان سے ایک بچہ ناشتہ دے گیا۔ اُس آدمی نے اپنے ہاتھوں سے دو پوری، سبزی اور ایک جلیبی کھلا کر پلیٹ نیچے رکھ دیا۔ پھر دو گھونٹ پانی چھوڑ کر گلاس اُسے پکڑا دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُسے ایک کمرے میں لے جا کر بولا تھا، ''اب تم آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ۔ ہو سکتا ہے سر سنسنائے اور اُلٹی بھی ہو۔ پھر بھی گھبرانے کی بات نہیں۔''

مچھروں کے حملے سے اُس کی نیند ٹوٹ گئی۔ شام ہو چکی تھی۔ وہ واقعات کی کڑیاں ملا رہا تھا کہ اُس نے جھانک کر اُسے دیکھا تھا۔ اُسے بیدار دیکھ کر وہ مسکرایا۔ پھر وہ اُس کے پہلو میں بیٹھ کر بولا، ''بیٹا! اب تم نہا کر لو۔ تن من چنگا ہو جائے گا۔ کپڑے اور صابن باتھ روم میں رکھے ہیں۔''

وہ نہا دھو کر نکلا، تب وہ خود کو ہلکا پھُلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ اُس آدمی کی آنکھوں میں خوشی تیر رہی تھی۔ اُس نے اشارے سے اُسے بُلا کر کہا، ''اِنھیں کھا کر، چائے پی لو......''

وہ کھا پی چکا، تب اُس نے پوچھا تھا،''اب تم سچ سچ بتا دو! گھر سے بھاگ کر آئے ہو نہ؟''
''جی!''
''بہاری ہو؟''
''جی!''
''میں سیتا مڑھی کا اور تم؟''
''مدھیپورا کا۔''
''خدا کا شکر کہ میری نظر تم پر پڑ گئی، ورنہ......''
قدرے توقف کے بعد اُس نے پوچھا تھا،''نام کیا ہے؟''
''ہری نارائن۔ لیکن ماں ہری اور غصّے میں ہریا کہہ کر پُکارتی ہے۔''
اُس نے پاس کھڑے لڑکوں کی جانب اشارے کر کے کہا تھا،''میں اِن سبھوں کا بشیر ماما ہوں اور آج سے تیرا بھی۔''
پھر اُس نے آواز لگائی،''رادھے شیام جی! اب ہم لوگوں کے لئے بھی جلدی سے شام والا ناشتہ بھیجوا دو۔''
سب مل جُل کر ناشتہ کرنے لگے۔ بشیر ماما نے اپنائیت سے کہا تھا،''تو گھر کا بچہ ہے، اپنا اور سگا۔ اِسی لئے کہتا ہوں یہیں رہ جا۔ اگر کمانے آیا ہے، تو میں کام دوں گا۔ گھومنے آیا ہے، تو گھما پھرا کر واپسی کا ٹکٹ کٹوا دوں گا۔ بیٹا! پہاڑ بھی جوالا اُگل کر ٹھنڈا پڑ جاتا۔ ہر غصّے کی معیاد ہوتی ہے۔ اگر غصّے میں ہے، تب تیرا غصّہ بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ پھر گھر چلے جانا۔ مجھے جواب کی جلدی نہیں۔''
پھر وہ پاس کھڑے لڑکوں سے بولے،''اِسے ٹھکانہ اور تم لوگوں کو ایک اور ساتھی مل گیا۔ دینا! تیرے کمرے میں جگہ ہے۔ ایک چوکی اِس کے لئے بھی لگا لو۔''
'بہار فرنیچر ہاؤس' ایک بسیرا بھی ہے، جہاں سہارنپور کا فراری دینا ناتھ، نیپال کا ارجن بہادر، اُڑیسہ کا نندلال سرکار اور ممبئی کے دور دراز علاقوں سے روزگار کی تلاش میں آئے رام سیوک، للن اور گوہر علی رہتا ہے۔ چند بڑے کاریگر روز آتے جاتے ہیں۔ ساتھ رہنے والوں میں وہی مڈل پاس ہے۔ اُسے لکھا پڑھی کے علاوہ بینک کا کام سونپا گیا۔ اُس کی

تنخواہ بھی مقرر کر دی گئی۔ سبھی لڑکوں کی طرح رہنا کھانا اور کپڑے مفت۔

بشیر ماما ایک نیک دل اور محنتی انسان ہیں۔ ایمانداری، عمدہ کاریگری، وقت کی پابندی اور مناسب قیمت کے سبب دکان خوب چلتی ہے۔ وہ من چاہی شرطوں پر سرکاری کام کے آرڈر تک نہیں کرتے۔ جب کبھی وہ اچھے موڈ میں ہوتے، تب وہ لڑکوں کو سبق آموز باتیں بتاتے۔ ایک رات کھانا کھاتے ہوئے اُنھوں نے سمجھایا تھا، ''دھندے میں غلط کام کی شروعات اندھے سرنگ میں اُترنے جیسا ہے۔ میرے گاؤں میں بچے ایک کھیل کھیلتے تھے، جس میں اینٹوں کو ایک قطار میں بالشت بھر کے فاصلے پر کھڑا کر کے پہلی اینٹ پر لات ماری جاتی ہے۔ لات مارتے ایک کے بعد دوسری اینٹ گرتی چلی جاتی ہے۔ ٹھیک ایسا ہی بُرے کام کا آغاز ہے۔ آدمی دلدل پر جا کھڑا ہوتا۔ بیٹا! حلال کی کمائی میں برکت ہے اور دوسروں کے لئے جینے میں انوکھا سکھ ملتا ہے......''

کسی کو پتا نہیں، بشیر ماما کب اور کیوں گھر سے فرار ہوئے تھے؟ اُنھوں نے آج تک اپنا گھر کیوں نہیں بسایا؟ دُکان ہی اُن کا گھر ہے اور بچے اُن کا پریوار ہیں۔ وہ اصول وضع کر کے اُن پر عمل کرتے۔ اُنھیں فضول خرچی اور بخالت دونوں پسند نہیں۔ کھانا بنانے کے برتنوں کی صفائی سبھی مل جل کے کرتے۔ کھانا بنانے اور کھانے کا وقت مقرر ہے۔ پیاز، لہسن چھیلنے اور سلاد چوکھا بنانے کا کام اُنھوں نے اپنے ذمّے لے رکھا ہے۔ ایک بار وہ پیاز چھیلنے لگا تھا، تب وہ پیار سے بولے تھے، ''نہیں! نہیں! لاؤ مجھے دے دو۔ آنکھ ناک سے پانی بہنے لگے گا۔ میں کسی بچے کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔''

سبھی ایک ساتھ مل بیٹھ کر کھاتے۔ جوٹھن اور بچ گئے کھانے کو کتا، بلّی اور پرندوں کو دے دیا جاتا۔ مذہبی فریضہ ادا کرنے کی سب کو آزادی ہے۔

بشیر ماما نے ایک بار سمجھایا تھا، ''آدمی صرف اپنے لئے نہیں کماتا ہے۔ اُس کی روزی میں بہتوں کا حصّہ ہوتا ہے۔ کسی کا حق نہیں مارنا چاہئے۔''

ایک رات اُس کے سپنے میں ماں آئی اور بولی تھی، ''ہم گاؤں جا رہے ہیں۔ تو بھی ساتھ چل ہری۔ وینا کی شادی ہے۔''

وہ ماں سے لپٹ کر روتے ہوئے بولا تھا، ''ہاں! ماں! میں ضرور چلوں گا۔ ابھی کا

ابھی چلتا ہوں۔''

ڈِینا نے بشیر ماما کو جگا دیا تھا۔ اُس کی باتیں سن کر وہ آہستہ سے بولے تھے، ''خاموش! ماں سے مل رہا ہے۔ جی بھر کے مل لینے دو۔''

بے قراری میں اُس کی آنکھیں کھل گئی تھیں، تب بشیر ماما نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا تھا، ''سپنے میں ماں آئی تھی نہ؟''

''بہن بھی ساتھ میں تھی۔ اُس کی شادی ہونے والی ہے......''

ڈِینا نے چیونٹی کاٹ کاٹ کر سب کو جگا دیا تھا۔ سبھی ساتھی اُٹھ اُٹھ کر چلے آئے تھے۔ اچانک بشیر ماما کی آنکھیں چھلک آئیں۔ اُنھوں نے آنسو پیتے ہوئے کہا تھا، ''اکثر اماں سپنے میں مجھ سے بھی ملنے آتی تھی۔ تم لوگ نہیں جانتے۔ میں بچپن سے ہی ضدّی ہوں۔ گھر نہ لوٹنے پر اڑ گیا تھا۔ بہت دنوں بعد معلوم ہوا، اماں اُس کی جدائی کا غم جھیل نہیں پائیں۔ ڈور ٹوٹ گئی۔ پھر......''

قدرے توقف کے بعد وہ بولے، ''ہری! گھر لوٹ جا۔ ماں سے بڑھ کر کوئی سگا نہیں۔ یہ رشتہ خون اور دودھ سے بنا ہے۔ میں سفر کا انتظام کروا دیتا ہوں۔ جی میں آئے، آجانا، نہ آئے تو مت آنا۔ لیکن دو کام میرے مشورے سے کر لینا۔ پہلا یہ کہ اپنا گھر بنا لو۔ اگر پشتینی زمین مل جائے تو اُسی میں۔ نہ ملے، تب تھوڑی زمین خرید کر۔ بنیاد پڑ جائے تو گھر بنتے دیر نہیں لگتی اور چھت ڈھل جائے تو سمجھو گھر تیار۔ بیٹا! پشتینی مکان غیر مزروعہ عام زمین سا ہوتا ہے، جس کے استعمال میں جتنا ہو، وہ اُسی کا۔ گھر اپنا ہو تو بیوی بچے طعنے نہیں دیتے۔ موٹی رقم چکا کر بھی کرائے کا گھر میزبان کے گھر جیسا ہوتا ہے، جس میں سکون و عافیت نہیں ملتی۔ دوسرا یہ کہ شادی کر لینا۔ اَدھیڑ عمر کی شادی خون کے آنسو رُلاتی ہے۔ کل ہی کھاتے سے تیس ہزار روپۓ نکال کر رکھ لینا۔ دس ہزار بہن کی شادی پر خرچ کرنا۔ ضرورت پڑے تو فون کر کے اور روپۓ مانگ لینا۔ بیٹا! تو قسمت والا ہے۔ تیری ماں زندہ ہے۔ بے چین ماں ہی سپنے میں آتی ہے۔ ماں کو میرا اسلام بھی کہنا۔''

پھر وہ ڈینا سے بولے، ''کل ہی اِسے مایا نگری گھما پھرا دو۔ جنم بھومی اور ممتا پاؤں جکڑ لیتی ہیں۔ ہو سکتا ہے ہری لوٹ کر نہ آئے، خدا کرے نہ آئے۔ ماں کے ساتھ

جینے کا مزہ اور ماں کے بغیر جینے کا دکھ میں جانتا ہوں۔"

آنسو روکنے میں ناکام بشیر ماما کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔

جانگ پر سر رکھے سویا کتا بے بس ہو کر کان پٹپٹانے لگا، تب ہری نارائن ایک بار پھر ماضی سے حال میں لوٹ آیا۔

اُس نے کتے کے کان کی جڑوں میں چپکے اُٹھیل کو ناخن سے پکڑ پکڑ کے نکالتے ہوئے سوچا، کاش! اُنچاہے رشتوں کو بھی اِسی طرح نکال پھینکنا آسان ہوتا۔

ہری نارائن کی آنکھیں برساتی ندی کی طرح لبریز ہو گئیں۔ وہ سوچنے لگا کہ واپسی کے اِس سفر میں اُس کے پاس کم سے کم ریل کا ٹکٹ، دو جوڑے کپڑے اور ننکو کا کا سے لئے قرض کے روپیوں میں اب بھی پانچ سو ساٹھ روپئے اُس کی جیب میں پڑے ہیں۔

پھر اُس کے ذہن میں گاؤں کی پنچایت مجسم و متحرک ہو گئی۔ بشیر ماما اور دوستوں کے دیئے تحفے کے علاوہ جب بھائیوں نے سوٹ کیس، سفری بیگ اور کئی سامانوں کو قبضے میں لے کر اپنی پسندیدگی کی مُہر لگا دی، تو وہ سہم گیا تھا۔ لیکن یہ بات اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ نقد روپئے کی واپس مانگنے پر بھائی پنچایت بیٹھا دیں گے۔ پنچوں کے سامنے بھائیوں نے کتنی عجیب دلیل دی تھی کہ اُن کا تنگ کرنا، اُس کے ہت میں تھا۔ گاؤں چھُڑوایا، تب ہی تو آج وہ اتنا امیر آدمی بن کر لوٹا ہے ورنہ گاؤں میں لفندر کا لفندر ہی رہ جاتا۔ ہمارے علاوہ اب اِس کا کوئی اور سگا زندہ نہیں۔ اِس ناطے بھی اِس کی کمائی پر ہمارا ہی حق بنتا ہے۔ بھائی ہونے کے ناطے اِسے بھی وینا کی شادی میں مالی مدد دینی تھی، جسے اِس نے دیا نہیں تھا۔ ہم نے تو صرف دس ہزار روپئے منہا کئے ہیں، جسے یہ بہن کی شادی میں خرچ کرنے کی نیت سے ہی لایا تھا۔ باقی بچے بیس ہزار روپئے۔ وہ گھر سے بھاگتے سمے چرائے پینتیس روپئے کے بدلے ہم نے ضبط کر لیا ہے۔ اگر اُسی دن تھانے میں چوری کی رپٹ لکھوا دیتے تو یہ جیل چلا جاتا۔ پھر اِسے مالدار بننے کا اَوسر ہی نہیں ملتا۔ اُس سمے ہم لوگ چھوٹا بھائی سمجھ کر چُپ رہ گئے تھے۔ پینتیس روپئے کو اگر اُسی سمے بینک میں فکس کروا دیتے تو آج وہ بیس ہزار سے بھی زیادہ ہو گیا ہوتا......

پنچوں کی رائے لے کر بار بار پوچھنے پر بھی جب وہ چپ رہا، تب مکھیا بھوجی نے

فیصلہ سنایا،''پنچ، پرمیشور ہوتا ہے۔ نیائے داتا کی آنکھوں پر پٹّی بندھی ہوتی ہے اور وہ ستہ کا پکچھ دھر ہوتا ہے۔ میں ہریا کی بھوجی ہوں۔ لیکن اِس سمئے مُکھیا کی حیثیت سے فیصلہ سنا رہی ہوں۔ ہریا کی ترقی میں اُس کے بھائیوں کے یوگدان کو نکارا نہیں جاسکتا اور نہ اِنھیں سمبندھی ہونے کے اَدھیکار سے ونچت کیا جاسکتا ہے۔ اِس بار ہریا کو تیس ہزار سے اِدھک کچھ اور نہیں دینا پڑے گا۔ جہاں تک جائداد میں حصّے کی بات ہے، تو اِس نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری ہے۔ اپنے جیوت ہونے کی نہ سوچنا دی اور نہ کبھی اپنا حق جتلایا۔ سرکار بھی سات سال تک لاپتا وِکتی کو مِرت مان لیتی ہے۔ اب تو جگہ زمین کا داخل خارج بھی ہو چکا ہے۔......''

کتا اچانک بینچ سے کود پڑا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر لگ رہی تھی۔ بھیڑ دیکھ کر گھبرایا ہری نارائن جنرل بوگی کی طرف لپکا۔ وہ کسی طرح بوگی میں گھُس ہی گیا۔ اُس کے گھُستے ہی افراتفری مچ گئی۔ کئی لوگ چلاّنے لگے،''ارے، ارے...... کتا گھُسا۔ مارو...... مارو سالے کو...... مارو، مارو......''

ہری نارائن تڑپ کر پیچھے مُڑا۔ ایک آدمی جوتے کی نوک سے اُسی کتّے کو ٹھوکر مار مار کر پلیٹ فارم پر گرا رہا تھا۔ اُس کے جبڑے سے خون بہنے لگا تھا۔ لیکن وہ کسی کو کاٹ نہیں رہا تھا بلکہ مار کھا کر بھی وہ ڈبّے میں گھُسنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کتّے کی محبت اور آدمی کی بے رحمی دیکھ کر ہری نارائن کا غصّہ پھوٹ پڑا۔ اُس آدمی کو طمانچے جڑتے ہوئے وہ چیخا،''بے زبان کو مارتا ہے۔ ارے! یہ انسان نہیں، کتا ہے، کتا۔ وفادار اور جان نچھاور کرنے والا۔ سگے سمبندھیوں سے اچھا اور بھروسے مند۔ دیکھا! اَتیاچار سہہ کر بھی اِس نے بدلہ نہیں لیا۔''

پھر وہ مٹھی لہراتے ہوئے بولا،''اب اگر کسی نے اِسے چھوا بھی تو میں اُس کی جان لے لوں گا......'' ہری نارائن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

موقع ملتے کتا سیٹ کے نیچے دُبک کر بیٹھ گیا، تب باقی لوگ بھی اپنی اپنی سیٹوں پر چُپ چاپ بیٹھے گئے۔

●

(ماہنامہ 'سب رس'، حیدرآباد اور 'نگینہ'، سری نگر، 'سالنامہ'، جلد۔۱، شمارہ۔۴، جون۔اکتوبر ۲۰۱۶ء میں شائع)

نجات

عائشہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہی میڈیکل کی ڈگری حاصل کرے گی۔ شوہر کا یہ حتمی فیصلہ صادقہ کو غیر مناسب لگ رہا تھا۔ عائشہ اُن کی اکلوتی اولاد ہے۔ یہ زمانہ اُس کے نکھرتے حُسن اور سیڑھیاں پھلانگتے شباب کا ہے۔ دوشیزگی کے جذبات واحساسات اور اقتضائے جسم کو وہ بہتر جانتی سمجھتی ہے۔ وہ عہدِ شباب کی پُر خطر وادیوں سے گزر چکی ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ عورت کا وجود بے داغ ململ سا ہوتا ہے، جس پر لگے داغ دھبّے کو چھپانا آسان نہیں۔ اگر کوئی راز کو سینے میں دفن کرلے، تب بھی ندامت اور خوف اُس کے وجود کا حصّہ بن جائے گا۔ پھر خدشات کے گرداب میں پھنسی ازدواجی زندگی نیم جان ہوجائے گی۔ کئی دنوں سے وہ ایسے ہی خیالات سے ذہنی خلجان میں مبتلا تھی۔ اُس کا جی کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ اُسے معلوم ہے کہ دین محمد اولوالعزم انسان ہیں۔ وہ فیصلے سوچ سمجھ کر لیتے اور اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دَم لیتے ہیں۔

اُس کے ذہن میں اچانک یہ خیال در آیا کہ حدّت سے لوہا بھی پانی کی طرح بہنے لگتا ہے، تب وہ شوہر کو ہم خیال کیوں نہیں بنا سکتی؟ اُس نے فی الفور ایک منصوبہ بنایا۔

اُس رات صادقہ کروٹیں بدلنے لگی تھی، تب دین محمد نے پوچھا تھا، ''نیند نہیں آرہی ہے؟''

اُس نے جواب نہ دے کر شوہر کا ہاتھ کھینچ کے بازو پر سر رکھا، پھر وہ پہلو سے لگ کر سوگئی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ جلا دیا۔ گلاب کا مصنوعی خوش نما

پودہ پُرنور ہوگیا۔ گلوں سے پھوٹتی رنگین شعاعوں نے کمرے کو رومان پرور بنادیا۔

گرفت میں آئے دین محمد کی نظر شاخِ گل سے جڑی گھڑی پر جا پڑی۔ گیارہ بج کر سات منٹ ہو رہا تھا۔ اُنھوں نے بیوی کی اضطراری کیفیت دیکھ کر سوچا کہ ماں بچوں سے پَل بھر کی جدائی برداشت نہیں کرسکتی۔ لیکن یہ معاملہ تو لمبی جدائی کا ہے۔ اُن کے دل میں جذبۂ ترحم ترنگ کی طرح پھیلنے لگا۔ اُنھوں نے ایک نظر بیوی پر ڈال کر سوچا کہ عورت کا اعلیٰ ترین روپ 'ماں' ہے اور اُس کی 'ممتا' عطیۂ ربانی۔ خدا نے یوں ہی ماں کے قدموں میں جنّت نہیں رکھا۔ وہ نو ماہ تک اُسے اپنے وجود کا حصّہ بنائے رکھتی اور اپنے خون سے اُسے پروان چڑھاتی ہے۔ وہ دردِ زہ سہہ کر اُسے دنیا میں لاتی اور اُس کی نگہداشت کر کے اُس کے مستقبل کو سنوارتی ہے۔ بچوں کا پہلا مکتب ماں کی گود ہے۔ ماں ہی اپنے بچوں کو مثالی انسان بناتی اور اُسی کی شہہ پا کر بچے تاریک راہوں کے مسافر بن جاتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد دین محمد نے بیوی کے رُخسار سے زُلفیں ہٹا کر اُسے محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ اُنھیں وہ اُڑان سیکھتی چڑیا سی دُبکی سُستاتی لگی۔ سر دبا کر سُلا دینے کے ارادے سے وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ پھر وہ بیوی کے سر کو گود میں رکھ کر محتاط انگلیوں سے سر کی مالش کرنے لگے۔

مالش کرتے ہوئے اُن کے ذہن میں نتھو میاں مجسّم و متحرّک ہوگئے۔ وہ نوجوانی میں بھاگ کر کلکتہ گئے اور وہیں کے ہو رہے تھے۔ پھر والدین کی سُدھ نہیں لی تھی۔ ماں نیک دل اور محنتی تھی۔ اِدھر اُدھر سے روزی کما کر وہ گھر چلاتی رہی۔ لیکن وہ اکلوتی اولاد کی جدائی کا غم زیادہ دنوں تک جھیل نہیں پائی۔ باپ تاڑی اور عورت کا رسیا تھا۔ ایک صبح وہ آم کے باغ میں مردہ پڑا ملا۔ پولیس کے ڈر سے گاؤں والوں نے اُسے فوراً سے پیشتر دفنا دیا۔ یہ بات بہت دنوں تک موضوعِ گفتگو بنی رہی کہ پاسی نے کئی بار بیوی کی دھنائی کی تھی۔ جب وہ باز نہیں آئی، تب اُس نے تاڑی میں زہر ملا دیا تھا۔

ذہن یادوں کو محفوظ رکھتا ہے۔ نتھو میاں اب اِس دنیا میں نہیں رہے۔ لیکن اُن کی باتیں اور یادیں ذہن میں محفوظ ہیں۔

نتھو میاں اَدھیڑ عمر میں کئی روگ لگا کر کلکتے سے گاؤں لوٹے تھے۔ ہاتھ کا ہنر آدمی

کو ہاتھ پسارنے اور بھوکا مرنے نہیں دیتا۔ وہ پشتینی پیشے سے لگ گئے۔ داڑھی بناتے وقت وہ بار بار گالوں پر اُلٹا ہاتھ پھیرتے۔ شُبہ ہوتے وہ فوراً اُسترا تیز کر کے اُس حصّے کی صفائی میں لگ جاتے۔ حجامت بناتے وقت پھرتی سے کئی بار قینچی چلا کر بالوں کو ٹونگتے۔ پھر اُنھیں جھاڑ کر دیکھتے اور کبھی سر گھما پھیرا کر جائزہ لیتے۔ وہ اپنے کام کو پوری لگن اور ایمانداری سے کیا کرتے۔ اُن کی نہ دکان تھی اور نہ وہ راہ گیروں کو اپنی خدمات دیتے تھے۔ مخصوص گھروں میں جا کر وہ خط و حجامت بناتے تھے۔ بچوں کی حجامت میں اُنھیں مہارت تھی۔ اُن کے پاس چھوٹی بڑی رنگ برنگی کنگھیاں اور ایک چھوٹا سا آئینہ بھی تھا، جن سے وہ بچے کو الجھائے رکھتے۔ چہرے اور گردن پر گرے بالوں کو پاؤڈر لگا کر فوراً ہٹا دیتے۔ کھیلتا بچہ جب کبھی اپنی آزادی میں خلل محسوس کرتا، تب وہ اُس کا سر چھوڑ کر طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگتے۔ بچہ اپنے کھیل میں لگ جاتا، تب وہ پھر اپنا کام شروع کر دیتے۔ سمجھدار بچے کو وہ قصّے کہانی سنا کر کام چلاتے۔ فرصت کے وقت وہ گھٹنوں کے درمیان آئینہ پھنسا کر جب اپنی داڑھی مونچھ بنانے لگتے، تب راہ گیر بچے بھی نزدیک جا کر اُنھیں دیکھنے لگتے۔ پچکے گالوں کو وہ کبھی زبان سے ڈھکیل کر اور کبھی ہوا بھر کے نمایاں کرتے۔ مونچھ اور بھنوؤں کے پکّے بالوں کو وہ چُن چُن کر کاٹتے۔ بچوں کو مفت میں مداری کے تماشے جیسا لطف ملتا۔

نتھو میاں خط و حجامت بناتے وقت ابا کو گاؤں بھر کی کچّی پکّی خبریں بھی سناتے تھے۔ وہ طرح طرح کی آوازیں نکالتے ہوئے سر کی مالش کرتے۔ پھر شانوں اور پنجوں کو دَباتے۔ اُن کی باتیں سن کر ابا کبھی ہنستے، مسکراتے اور کبھی کوئی بات پوچھ لیتے تھے۔ اُس وقت اُس کے دل میں یہ للک پیدا ہوتی تھی کہ وہ بھی ابا کے پاس بیٹھ کر اُن کی باتیں سنے، ہنسے اور پوچھے۔ لیکن اماں وہاں جانے نہیں دیتیں۔ ایک بار اُس نے ضد کی تھی، تب اُنھوں نے اُسے سمجھایا تھا کہ چھپ کر یا بڑوں کے درمیان گھس کے گفتگو نہیں سننی چاہیے، گناہ پڑتا ہے۔ اماں نے معصوم ذہن میں گناہ کا ایسا ڈراؤنا ہیولا فٹ کر رکھا تھا کہ وہ سہم گیا تھا۔

دین محمد نے مسکراتے ہوئے سوچا کہ بچپن کا زمانہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ کٹی شاخ میں پھوٹتی کونپلوں کی طرح دل میں خواہشیں پیدا ہوتیں، جنھیں اُمنگ جھولے جھولاتی ہے۔ ایک بار اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ داڑھی مونچھ جلدی سے نکل آئیں۔

اُس نے منصوبہ بھی بنالیا تھا کہ حجامت کے بعد وہ بھی ابّا کی طرح بغلی صاف کرواکے پاؤں کے ناخن کٹوائے گا۔ جب بھی ابّا گھر پر نہیں ہوتے، تب اُسے موقع مل جاتا تھا۔ وہ اماں کے دَم میں لگ جاتا اور اُن سے اجازت لے کر ہی اُن کی جان چھوڑتا تھا۔ وہ ننھّو میاں کو پہلے ہی بتا دیتا تھا کہ ''آج بھی اُس کے سر میں درد ہے۔'' وہ بھی مسکراتے ہوئے کہتے، ''ہمرا چمپی سے بَبوا کے سر دَرد چھو ہو جائی۔'' چمپی کے وقت ہلکی پھلکی چوٹ کے ساتھ کانوں کے نزدیک پیدا ہوتی آوازیں اُسے اچھی لگتیں۔ گردن اور کانوں کے اُوپر چلتے اُسترے کو وہ گالوں پر محسوس کر کے مسرور ہو جاتا تھا۔ گردن جھکائے قینچی کی مترنّم آواز سنتے سنتے وہ اکثر اونگھنے لگتا اور ناک سے رطوبت جاری ہو جاتی تھی، تب وہ اُس کی گنجی کھینچ کر اُسی میں ناک پونچھ دیتے تھے۔

سر کی مالش کرتے کرتے دین محمد کی انگلیاں دُکھنے لگیں، تب اُن کے ذہن میں اماں مجسّم ہو گئیں۔ اُنھیں لگا کہ بچپن کا زمانہ ناکام عشق سا ہوتا ہے، جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ جب بھی اماں کو آنچل سے سر باندھے سوئے دیکھ لیتا، تب وہ اُن کے سر کی مالش کرنے لگتا تھا۔ وہ ہر بار یہی سوچتا تھا کہ آج وہ ننھّو میاں سے بھی اچھی مالش کر کے دِکھائے گا۔ لیکن اماں منٹ دو منٹ میں ہی اُس کا ہاتھ پکڑ کے کہتیں، ''بس! ہو گیا...... تمھارا ہاتھ دُکھنے لگے گا۔''

پھر وہ پہلو میں کھینچ کر اُس کے پنجوں کو آہستہ آہستہ تا دیر دَباتی رہتیں۔

آنکھیں بند کیے سوئی بیوی کو دیکھ کر دین محمد طے نہیں کر پا رہے تھے کہ وہ سو چکی یا جاگ رہی ہے۔ وہ منتظر تھے کہ وہ خود کہے کہ اب سو جایئے۔

مالش سے غنودگی چھانے لگی، تب صادقہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے بکھرے زلفوں کو درست کیا۔ پھر اُلجھے آنچل کو جسم سے پرے کر کے وہ شوہر کے پہلو میں سما گئی۔ دین محمد کو یہ سمجھتے دیر نہیں لگی کہ بیگم کا جسم دروازے پر کھڑا صدا لگاتا سائل ہے، تب وہ شرعی فریضہ ادا کرنے لگے اور دھیرے دھیرے کشکول لبریز ہونے لگا۔

صادقہ جانتی ہے کہ حظ و سرور کا یہ سیلاب، سیرابی کی لذت اور نیند کی سوغات بخشے گا، پھر وہ پُرسکون ہو جائے گی۔ لیکن اُس نے تو شہہ مات کی ایک چال چلی ہے۔

بیگم کی معاونت اور دریادلی پر دین محمد حیران تھے۔ اُنھیں معلوم ہے، 'خود سپردگی' عورت کی فطرت، 'نیم سپردگی' تشنہ لب رکھنے کا منصوبہ اور 'انکار و عدم تعاون' انتقامی کارروائی ہوتی ہے۔

اُڑان سے قبل پَر تولتی چڑیا کی طرح صادقہ کچھ دیر تک لیٹی رہی۔ پھر وہ منصوبے کی بساط پر چال چلتے ہوئے بولی، ''کئی دنوں سے سوچ رہی ہوں، تب اِس نتیجے پر پہنچی کہ بچوں کو ساتھ رکھ کر ہی تعلیم دلوانی چاہئے۔ میں نے بھی تو پٹنے میں رہ کر پڑھا لکھا ہے۔ دن زمانہ بد سے بدتر ہوتا جارہا ہے۔ آپ کو کاروبار سے سر اُٹھا کر دیکھنے کی فرصت نہیں۔ میں نے کئی لڑکیوں کو خراب ہوتے دیکھا ہے۔ بیشتر لڑکیاں گھر سے کلاس اور کوچنگ کے لئے نکلتی اور عاشق کے ساتھ موج مستی کرتی پھرتی ہیں۔ پہچان چھپانے کے لئے ہی حجاب کا چلن عام ہوگیا ہے۔ گھر سے نکلتے وقت لگائے حجاب کو وہ راستے میں تبدیل کر لیتی ہے تاکہ گھر کے افرد بھی پہچان نہ سکیں۔ ویسے بھی جینس ٹاپ میں سب لڑکیاں ایک جیسی دِکھتی ہیں۔ موبائل اور انٹرنیٹ نے تو نئی نسل کو دلدل پر لا کھڑا کیا ہے۔ اب لڑکیاں بھی نشہ کرنے لگی ہیں۔ عاشق جوڑے پتنگ باز کی طرح کھُلے عام پیچ لڑاتے۔ نظر رکھنے کے لئے بچے کا نظروں کے سامنے ہونا لازمی ہے۔ کہیں عائشہ نے بھی کوئی غلط قدم اُٹھالیا تو؟ ...... میں فوراً زہر کھالوں گی۔''

زہر کھانے کی دھمکی پر بھی دین محمد خاموش رہے، تب اُسے شُبہ ہوا۔ وہ سر اُٹھا کے اُنھیں دیکھتی ہوئی بولی، ''آپ تو جاگے ہیں۔ مجھے لگا تھا کہ سوگئے۔''

''بیگم! میں ہمہ تن گوش ہوں۔ ماشاالله! آپ تو جہاں دیدہ ہیں۔ میں آپ کے تجربات و مشاہدات کا قائل ہوگیا۔ لیکن ایک بات سے متفق نہیں۔''

''کس بات سے؟'' اُس نے مضطرب ہوکر پوچھا۔

''ایسی خبریں پڑھنے اور دیکھنے کو مل جاتی ہیں کہ فرار عاشق جوڑے کی شادی تھانے میں کرائی گئی۔ مسلمان لڑکا، کسی غیر مسلم لڑکی کو بھگا لے گیا۔ پھر اِسے لَو جہاد کا معاملہ بنا کر کئی دنوں تک فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکائی گئی۔ یہ بھی پڑھا اور دیکھا ہے کہ عاشق کے ساتھ فرار مسلم لڑکی نے مندر میں شادی رچالی۔ چار ماہ کی حاملہ جب فرار عاشق کے گھر

پہنچی، تب گھر والوں نے اُسے بہو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ فریادی بنی در بدر بھٹک رہی ہے۔ کبھی کوئی ادارہ کسی کی مدد کو اُٹھ کھڑا ہوتا یا پھر معاملہ سیاسی رنگ لے لیتا۔ کبھی کبھار کوئی فریب خوردہ، خودکشی کر لیتی ہے۔ لیکن آج تک کسی ماں نے زہر نہیں کھایا اور غیور باپ بھی زہر کا گھونٹ پی کر زندہ رہتا ہے۔''

وہ قدرے توقف کے بعد بولے، ''مجھے حیرت ہے کہ آپ کو بیٹی پر بھروسہ نہیں۔ بیگم! آپ فکر نہ کریں۔ عائشہ کی پرورش دیندارانہ ماحول میں ہوئی ہے۔ جگہ اور ماحول بدلتے آپ بھی تو صوم وصلوٰۃ کی پابند ہو گئیں۔''

پھر اُنھوں نے کروٹ لے کر گلاس کو ہونٹوں سے لگایا اور تین گھونٹ پانی پی کر وہ بولے، ''بیگم! میں نے سوچ سمجھ کر بیٹی کا نام رکھا ہے۔ آپ کا نام بھی کچھ سوچ کر ہی بدلا ہے۔ سوئیٹی غیر اسلامی نام تھا۔ نام کا اثر سیرت وشخصیت پر پڑتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ عائشہ کوئی غلط قدم نہیں اُٹھائے گی۔ اچھا مالی صرف دیکھ ریکھ کرتا ہے۔ پودے از خود بڑھتے، پھولتے اور......''

صادقہ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا، ''مجھے معلوم ہے، بحث میں آپ سے کوئی جیت نہیں سکتا۔ خدا نے ہی ماں کا دل دلدلی مٹی سے بنایا اور شکّی دماغ عطا کیا ہے۔''

پانی پیتے وقت صادقہ نے خود کو الگ کر لیا تھا۔ اچانک اُس کے دل میں یہ خوف سما گیا کہ اگر وہ سنتی رہی تو اشاروں کنایوں میں آج ہی وہ...... اِس کے آگے وہ کچھ اور سوچ نہیں سکی۔

منصوبے کی ناکامی سے شرمسار صادقہ تھوڑی دیر تک زخمی پرندہ سی پڑی اذیّت جھیلتی رہی۔ پھر اُس نے باتھ روم جاتے ہوئے مُڑ کے شوہر کو دیکھا تھا۔ وہ تھکے مزدور کی طرح آنکھیں بند کرتے سو گئے تھے۔

عورت آب صفت ہوتی ہے۔ پھیلنا، سمٹنا، سمانا اور راہ نکال لینا اُسے بھی آتا ہے۔ وہ ناموافق حالات اور ناپسندیدہ افراد سے بھی سمجھوتہ کر لیتی ہے۔ صادقہ نے بھی اپنے دل و دماغ کو سمجھا بجھا لیا۔

عائشہ کے علی گڑھ جاتے گھر کی رونق اور چہل پہل جاتی رہی۔ کونے کھدرے

میں دَم سادھے چھپی اُداسی گھر آنگن میں پالتو بلّی کی طرح مٹر گشتی کرنے لگی۔ زلیخا کی ماں نے بھی پوچھ پوچھ کر کھانا بنانا چھوڑ دیا۔

اُس دن صادقہ دوپہر کا کھانا کھا کر اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ اچانک اُسے زلیخا یاد آ گئی۔ شادی کے بعد سے ہی اُس نے یہی ڈراما دیکھا تھا کہ وہ اکثر شوہر سے لڑ جھگڑ کر حویلی چلی آتی اور کئی دنوں تک ماں مُرید شوہر اور ظالم ساس کے کرتوت سنا سنا کر وہ اُنھیں جی بھر کے کوستی اور بددعائیں دیتی رہتی۔ اُس کی شادی دین محمد نے ہی اپنے ایک ملازم سے کرائی تھی۔ زلیخا کی نالش پر جب وہ بھولو کو بُلا کر اُس کے سامنے ڈانٹتے پھٹکارتے اور سخت ہدایت دیتے، تب وہ شانت ہوتی۔

طرح طرح کی ڈش تیار کر کے اُنھیں سجا کر پیش کرنا زلیخا کا شوق ہے۔ وہ جب تک حویلی میں رہتی ماں کو کچن کے کاموں سے دور رکھتی۔ دین محمد تعریف کرتے ہوئے کھاتے اور اکثر انعام کا اعلان بھی کرتے رہتے۔ ایک بار زلیخا نے تعریف سن کر کہا تھا، ''کاش! میرے پاس نٹ والا موبائل ہوتا۔''

وہ فوراً بولے تھے کہ ''میں بھولو سے کہوں گا کہ وہ اِس بار شادی کی سال گرہ پر ایک موبائل تحفے میں دے۔''

''تھینک یو!''

پھر وہ جلدی سے بولی تھی، ''تب دیکھئے گا! میں طرح طرح کی چیزیں بنا کر کھلاؤں گی۔'' اُس کا چہرہ گلنار ہو گیا تھا۔

صادقہ کو یہ سمجھتے دیر نہیں لگی تھی کہ اگلے ہی ماہ زلیخا کو ایک مہنگا موبائل مل جائے گا۔

زلیخا کے لباس اور اطوار واندازِ تخاطب سے گھر آیا مہمان تمیز نہیں کر پاتا کہ وہ اِسی گھر کی پشتینی خادمہ کی بیٹی ہے۔ زلیخا ہمیشہ عائشہ کے آگے پیچھے لگی رہتی اور اُس کا ہر کام خوش دلی سے کرتی۔ محنتی، ملنسار، نفاست پسند اور سلیقہ مند ہونے کے باوجود صادقہ کو وہ ایک آنکھ نہ بھاتی۔ وہ اُس پر کڑی نظر رکھتی اور بات بات پر اُسے ڈانٹتی پھٹکارتی رہتی۔ وہ اُسے شوہر کے پاس زیادہ دیر تک ٹکنے نہیں دیتی۔

شکست کھا کر چُپ بیٹھنا عورت کی فطرت نہیں۔ صادقہ نے بھی درپیش مسئلے کا

حل تلاش کر ہی لیا۔ وہ عائشہ کی شادی فوراً سے پیشتر کر دے گی۔ اُس نے لمبی مدّت سے بند پڑے بکسوں اور صندوقوں کو کھنگالنا اور چیزوں کو جہیز کے لئے چھانٹنا شروع کر دیا۔ جب وہ کمر سیدھی کرنے بستر پر جاتی، تب متفرّق خیالات اَن چاہے میسیج کی طرح اُس کے ذہن میں پے در پے آنے لگتے۔

ایک دن صادقہ سوچنے لگی کہ جہیز کا سامان جوڑنا ماں کا کام ہے۔ جہیز میں دیا ایک چمٹہ بھی بیٹی کو آرام دیتا اور ماں کو سکون بخشتا ہے۔ شادی کے وقت جو دے دیا سو دے دیا۔ بعد میں دینے کا وعدہ اکثر پورا نہیں ہوتا۔ رخصتی کے بعد گھر والوں کی نیّت بدل جاتی ہے۔ ماں کو کنواری بیٹی کا چہرہ دِکھائی دینے لگتا ہے۔ ماں اپنا زیور بیٹیوں میں بانٹ کر خوش ہوتی ہے۔ لیکن یہ سکھ اُسے نصیب نہیں ہوگا کہ وہ زیوروں سے لدی پھدی نہیں آئی تھی۔ وہ بھی مانگے کا زیور پہن کر آئی تھی، جسے لوٹتے ہی اُتار لیا گیا تھا۔ پھر بھی وہ خوش ہے کہ خدا نے اللہ نے اُسے ایسا شوہر عطا کیا، جو بیوی پر جان و مال لُٹاتا اور دیئے روپے پیسوں کا حساب نہیں لیتا ہے۔ شادی کی سال گرہ پر وہ قیمتی تحفے دیتا اور عام مردوں کی طرح شکّی نہیں۔ وہ بات بات پر طعنے بھی نہیں دیتا ہے۔

اچانک صادقہ کو شادی میں ملے تحائف کی یاد آ گئی۔ سسرالی رشتے داروں نے اُسے سونے چاندی کے کئی ہلکے بھاری زیورات دیئے تھے۔ اُس کے ذہن میں ولیمہ کا پورا منظر رقص کر گیا۔ اُسے یاد ہے، خالہ زاد بہن عالیہ نے اُس کے روبرو اُنھیں انگوٹھی پہنا کر ایک خوب صورت شہانہ جوڑا اُس کی گود میں رکھتے ہوئے کہا تھا، ''بھابھی! اِسے پہنا کر میں آپ کو سجاؤں گی۔ آپ قسمت والی ہیں۔ ڈھول باجے کے ساتھ شادی اور سہاگ کا جوڑا، ہر لڑکی کے نصیب میں نہیں......''

پھر وہ گفٹ پیکٹ کھول کر 'ڈانسنگ ڈال' کو شوکیس میں رکھتے ہوئے بولی تھی، ''بھابھی! میرا یہ گفٹ ہمیشہ آپ لوگوں کی نظروں کے سامنے رہے گا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں یاد آتی رہوں گی......''

پھر اُس نے 'ڈانسنگ ڈال' کو بجلی سے کنکٹ کر دیا تھا۔ موسیقی کے ساتھ رنگ برنگی شعاعیں پھوٹنے لگیں اور خوش لباس خوبرو حسینہ، روبرو کھڑے نوجوان کی باہوں میں

بانہیں ڈال کر آنکھیں مٹکاتی ہوئی ڈانس کرنے لگی تھی۔ عالیہ نے اُس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا، ”بھابھی! یہ میں نہیں، آپ ہیں۔“

اُس نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا تھا۔ عالیہ کے چہرے پر بھید بھری مسکان رقصاں تھی۔

عالیہ کا تحفہ اُس کے لئے سوہانِ روح بن گیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی نظر بار بار شوپیس پر جا ٹھہرتی۔ اُسے لگتا، عالیہ نے دانستہ ترتیب اُلٹ کر اشارے میں جتلا دیا تھا کہ ”یہ آپ نہیں، میں ہوں۔“

اُسے یاد ہے۔ اُس نے جس دن شو پیس کو الماری میں بند کر دیا تھا۔ اُسی رات اُنھوں نے سمجھایا تھا، ”عالیہ اپنا گفٹ نہیں دیکھے گی تو اُسے صدمہ ہوگا۔“

اُس نے صبح شوپیس کو اُسی جگہ رکھ دیا تھا۔

اتفاق سے کچھ ہی دنوں بعد اچانک اَسّو پھوپھی بیٹی اور نواسی کے ساتھ داماد کو دیکھنے کے بہانے آئیں۔ اُنھیں سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا چاہتی تھیں کہ گھر والوں کو ناک میں دَم کر دینے والی سوئیٹی سسرال میں دودھ کی کلّی کر رہی ہے۔ وہ بزنس ٹور پر تھے۔ اُن سے ملاقات نہ ہونے کا پھوپھی کو سخت ملال ہوا تھا۔

شوپیس دیکھ کر بچی مچلنے لگی، تب اُس نے شوکیس سے نکال کر اُسے پکڑا دیا تھا۔ وہ خوش ہو کر مسلسل ڈانس دیکھتی رہی۔

اَسّو پھوپھی دَمِ رخصت بہت خوش تھیں۔ وہ اُس کی بلائیں لیتی ہوئی بولی تھیں، ”سوئیٹی! ہم لوگ جب نئے مہنگے جوڑے پہن کر گھر لوٹیں گے، تب بھی منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ بیٹی! تو سچ مچ قسمت والی نکلی، گھر بَرا چھال گیا۔ آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔“

رخصت کرتے ہوئے اُس نے بچی سے پوچھا تھا، ”یہ تمھیں پسند ہے؟“

اُس نے شوپیس کو سینے سے چمٹا کر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

تب اُس نے بچی کے رخسار کو شفقت سے تھپتھپا کر کہا تھا، ”اِسے لیتی جاؤ۔“

بچی خوش ہو کر اجازت طلب نظروں سے ماں اور نانی کو دیکھنے لگی تھی۔

اِن کی نظر جیسے ہی شوکیس پر پڑی، اُنھوں نے فوراً جواب طلب کیا، تب اُس نے

جذبات سے عاری لہجے میں کہا تھا، ''آسو پھوپھی، بیٹی اور نواسی کے ساتھ آپ سے ملنے آئیں تھیں۔ بچی اسٹول لگا کر شوپیس نکال رہی تھی کہ وہ گر کر ٹوٹ گیا۔''

وہ فوراً حمام میں چلی گئی تھی اور وہ دیر تک بڑبڑاتے رہے۔

صادقہ اپنی تمامتر مصروفیات کے باوجود موقع نکال کر بیٹی سے باتیں کرتی اور گھما پھیرا کر اُسے دنیا کی اونچ نیچ سمجھاتی رہتی۔

دین محمد بزنس ٹور پر گئے ہوئے تھے۔ عشاء کی نماز پڑھ کر صادقہ نے بیٹی سے لمبی گفتگو کی۔ وقت کاٹے کٹ نہیں رہا تھا۔ اچانک اُسے شوہر کی کہی باتیں یاد آنے لگیں، ''آپ تو جہاں دیدہ ہیں۔ میں آپ کے تجربات و مشاہدات کا قائل ہو گیا...... آپ کا نام بھی کچھ سوچ کر ہی بدلا ہے...... جگہ اور ماحول بدلتے آپ بھی تو صوم وصلوٰۃ کی پابند ہو گئیں......''
یہ جملے اُس کے ذہن وروح میں پھانس کی طرح چُبھ کر پھنسے رہ گئے۔ اکثر عالمِ تنہائی میں یہ جملے ببول کے کانٹے اور اُس کا وجود آبلہ بن جاتا۔ وہ قیاس کے گھوڑے دوڑانے لگتی کہ وہ باخبر ہیں۔ پھر وہ خود ہی تردید کر دیتی کہ وہ میرے ماضی کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ وہ یقین و گمان کی تنی رسّی پر چلتی، لیکن اُس کا پاؤں نہ یقین پر جمتا اور نہ گمان پر ٹھہرتا۔ اُسے لگتا، حالات نے ہاتھوں کو پکڑ کے اُسے گول چکّر دے کر کھڑا کر دیا ہے اور وہ ڈول رہی ہے۔ وہ کسی جانب ایک قدم بھی بڑھا نہیں سکتی۔

اچانک اُسے ابھئے یاد آ گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ ماموں زاد بھائی نہیں ہوتا، تب وہ بے کٹک اور بغیر دستک دیئے اُس کے دل کے آنگن میں آ کھڑا نہیں ہوتا۔ رشتے، ملن کے مواقعے فراہم کرتے اور محبت کی چنگاری کو شعلہ بنا دیتے ہیں۔ ابھئے سچ مچ نِڈر تھا۔ اُسے جب اور جہاں موقع مل جاتا، وہ وہیں بوس و کنار میں لگ جاتا۔ پھر اُس کا جسم و دل بھی باغی ہو جاتا اور وہ اُس کی سانسوں کی تپش سے موم کی گڑیا سی پگھلنے لگتی تھی۔

یادوں کی یلغار سے خوفزدہ ہو کر اُس نے آنکھیں موند لی۔ پھر بھی وہ نیپال کے اُن مقامات کی سیر کرنے لگی، جہاں جہاں وہ ابھئے کے ساتھ گئی تھی۔ لُکّا چھپی کے زمانے میں بھی وہ ہنی مون کی سیر سا لطف لیتا رہا۔ اسٹینڈ میں کیمرے لگا کر وہ فرمائشی پوز میں حسین مناظر اور یادگار لمحوں کی تصویریں کھینچتا اور وی ڈی او بناتا رہتا۔ وہ اُس سے پیسے مانگ مانگ کر

اُسے پانی کی طرح بہاتا تھا۔ شباب کا عالم، موسمِ بہار سا ہوتا ہے، جس میں گل و بھنورے ایک دوسرے پر فدا ہوتے، سب کچھ قوسِ قزح کی طرح خوش رنگ اور زندگی سر سبز مناظر سا جاذبِ نظر لگنے لگتی ہے۔

پاپا اپنے فعل پر نادم تھے۔ اُنھوں نے برسوں قبل جس آگ کے دریا میں چھلانگ لگائی تھی، اُسے وہ عبور نہیں کر پائے۔ تلخ تجربات کے سبب اُنھیں قطعی منظور نہ تھا کہ اب کوئی اور اُن کے نقشِ قدم پر چلے۔ اِسی سبب وہ ابھئے کے ساتھ جب کبھی فرار ہوتی، تب وہ ہفتہ دس دنوں میں ہی اُسے پکڑ لاتے تھے۔ جب وہ پیار سے سمجھا بجھا کے اور مار پیٹ کر تھک گئے، تب اُنھوں نے شادی سے قبل اُسے کمرے میں قید کر دیا تھا۔ ممّا خاموش تماشائی کی طرح سب کچھ دیکھتی، سنتی اور سہتی رہیں۔ میکے اور سسرال میں اُن کی حیثیت صفر ہے۔ وہ اپنے اخلاص، محبّت، درگزر، کام کاج اور خوشامد سے بھی کسی کا دل جیت نہیں پائیں۔ اُن کا حسن وعشق سوہان روح بن گیا۔

شادی کے بعد موقع نکال کر ایک دن ابھئے نے اُس سے کہا تھا، ''جب تمھارا باپ ہندو عورت سے شادی کر سکتا ہے، تب میں آدھا مسلمان سے کیوں نہیں کر سکتا؟...... بتاؤ؟......''

پھر وہ قدرے توقف کے بعد نرم لہجے میں بولا تھا، ''سوئیٹی! میرا منشا گھر واپسی ہے۔ چلو! کسی مندر میں شادی کر کے وی ڈی او وائرل کر دیتے ہیں۔ کئی سنستھائیں ہماری سہایتا کو تیار ہیں۔''

پھر وہ ہاتھ جوڑ کر بولا تھا، ''پھوا نہ سہی تم ہی گھر لوٹ آؤ۔ میں تمھیں پلکوں پر بیٹھا کر رکھوں گا۔ ایک نیتا جی ایک سال تک رہنے، کھانے پینے کی وِوستھا اور بزنس کے لئے ایک لاکھ روپئے دینے کو تیار ہیں۔''

اُس کی چپّی پر اُس نے سخت لہجے میں دھمکی دی تھی، ''فیصلہ جلدی کرنا! سر پھر گیا تو انجام بھیانک ہوگا۔ میں ڈی وی ڈی اور فوٹو پتی دیو کو بھیج دوں گا۔ پھر تمھارے لئے آتم ہتیہ کے علاوہ کوئی وِکلپ نہیں رہ جائے گا۔'' اُس نے خوب قہقہے لگائے تھے۔

اُس کی آنکھوں میں عزم کا شعلہ دیکھ کر وہ گھبرا گئی تھی۔ اُس نے سوچا تھا کہ وہ پیدا

ہوتے ہی مر کیوں نہیں گئی تھی؟ جوانی سچ مچ سونامی سی ہوتی ہے، جس پر قابو پانا آسان نہیں۔ وہ تو تنکے کی طرح بہہ گئی تھی۔ دل میں سمایا خوف اُسی دن سے سائے کی طرح اُس کے وجود کا حصّہ بن گیا۔

احساسِ گناہ اور شوہر کا حسنِ سلوک، ندامت کا نیزہ بن کر اُس کے جگر کو چھلنی کرتا رہتا۔ وہ خوفزدہ اور بے قرار رہنے لگی تھی۔ ایک دن عالمِ بے قراری میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی طرح اُس کے دل میں یہ خیال آیا کہ سوئیٹی شادی کے بعد مر گئی۔ اب وہ صادقہ ہے، جو ایک باوقار سماجی زندگی جی رہی ہے۔

صادقہ نے زندگی کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن اُس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اُنھوں نے میرا نام صادقہ ہی کیوں رکھا؟ آمنہ، حاجرہ، خدیجہ یا فاطمہ بھی تو رکھ سکتے تھے؟ اُسے شُبہ ہوا۔ ہو سکتا ہے، اُنھوں نے مچھلی کے شکاری کی طرح بنسی میں 'صادقہ' لفظ کا چارہ لگا رکھا ہے تا کہ میں خود سچ اُگل دوں۔ وہ پھر ذہنی تمھصے میں پڑ گئی۔

اچانک اُسے لگا کہ وہ پاس ہی کھڑے مسکراتے ہوئے کہہ رہے ہیں، ''آپ کا نام بھی کچھ سوچ کر ہی بدلا ہے۔''

اُس نے فوراً سوئیٹی سے پوچھا، ''صادقہ کو سچ بول دینا چاہیے؟''

سوئیٹی نظریں چُرانے لگی، تب اُس نے خود کو سمجھایا کہ سچ بول کر سولی پر چڑھ جانا دانش مندی نہیں۔ جہاز ڈوبنے سے پہلے کوئی لائف بورڈ کا استعمال نہیں کرتا۔

زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں رہی۔ صبح، شام کے دھندلکے میں سما کر رات کے بطن سے نمودار ہوتا رہا۔

وہ گرمی کا اُمس بھرا دن تھا۔ صادقہ اپنے بستر پر لیٹی اے سی کا لطف لے رہی تھی۔ دین محمد صبح کی گاڑی سے عائشہ کو لانے علی گڑھ گئے تھے۔ وقت کے ٹھہر جانے کا کربناک احساس اور بیٹی سے ملن کی سرخوشی کو وہ دھوپ چھاؤں سا محسوس کر رہی تھی۔ اچانک اُسے لگا کہ وہ ساحل پر بانہیں پھیلائے کھڑی ہے اور عائشہ حدِ نظر سے پرے وہ موج ہے، جو اُسے شرسار کرنے والی ہے۔

صادقہ بستر سے اُٹھ کر بیٹی کے کمرے میں گئی۔ پھر اُنگلی سے اسٹڈی ٹیبل کو چھو کر

دیکھا۔ گرد کی ہلکی سی پرت جمی تھی۔ کل ہی زلیخا نے کمرے کی جم کر صفائی کی تھی۔ وہ کمرے کو اپنے طور پر سجا سنوار کے اپنے کمرے میں لوٹی، تب اُس کی نظر الماری میں جھولتی چابھی پر جا پڑی۔ اُسے لگا کہ وہ بھی بیٹی سے ملنے کے لئے بے قرار ہیں۔ بے تابی میں وہ چابھی نکال کر رکھنا بھول گئے۔ اُس نے چابھی گھما کر دیکھا۔ الماری بند تھی۔ چابھی نکال کر اُس نے اُسے تکیہ کے نیچے رکھ دیا۔ پھر وہ ہاتھ منہ دھونے کے لئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

قدموں کی آہٹ پا کر جانی پہچانی آوارہ بلّی کچن سے بھاگی، تب وہ لپک کر کچن میں گئی۔ دودھ کی دیگچی اُلٹی پڑی تھی۔ جوٹھے برتنوں پر بلّی کے پنجوں کے نشانات تھے۔ چاروں طرف مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ وہ غصّے میں تیز قدموں سے عقبی دروازے تک گئی۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ اُس نے پردے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا۔ زلیخا کا بیٹا غلام محمد ہوسٹل سے آچکا تھا۔ وہ برآمدے میں چوکی پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا اور نانی پنکھا جھلتے ہوئے باتیں کر رہی تھی۔ زلیخا نظر نہیں آئی۔ وہ دروازہ بند کر کے ہاتھ منہ دھو کر اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔

پلنگ پر لیٹے لیٹے صادقہ کے دل میں لاکر کھول کر دیکھنے کی خواہش شدّت اختیار کرنے لگی۔ اچانک وہ اُٹھی اور الماری کی جانب اِس طرح لپکی گویا جلتے چولہے پر دیر سے رکھی دودھ کی دیگچی یاد آگئی ہو۔ اُس نے احساسِ گناہ پر پاؤں رکھ کر لاکر کا پٹ کھول دیا۔ سطح پر اخبار بچھا کر فائلوں اور روپیوں کے بنڈلوں کو سلیقہ سے رکھا گیا تھا۔ متعدّد بینکوں کے کھاتے، چیک بک، چھوٹی بڑی بہت سی کنجیاں، مکان، زمین اور دُکان کے دستاویزات وغیرہ رکھے تھے۔ ایک کونے میں عالیہ کا تحفہ رکھا تھا۔

اُس نے سب سے پہلے عالیہ کا تحفہ نکال کر اُسے بغور دیکھا۔ سُنار نے فنکاری سے انگوٹھی پر اے ڈی ایم لکھ کر دل کے نقشے میں تیر چبھا رکھا تھا، جسے پہلی نظر میں پڑھ پانا آسان نہیں تھا۔ پھر وہ لاکر کا بغور معائینہ کرنے لگی۔ اُسے لگا کہ اخبار کی تہہ میں کوئی چیز رکھی ہے۔ اُس پر ہتھیلی رکھتے اُس کے دل میں دہشت سما گئی۔ اَنھیے مجسّم ہو کر قہقہے لگانے لگا۔

اخبار کا کھلا حصّہ پشت کی جانب تھا۔ اُس نے اخبار کے نیچے پنجہ گھسانے کی کوشش کی تو بوسیدہ اخبار چسکنے لگا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ تمام چیزوں کو نکالے بغیر اُسے نکال پانا ممکن نہیں تھا۔ وہ کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ اتفاقاً اُسے نادر موقع ہاتھ لگا تھا، جسے

وہ گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ اُس نے یہ طے کرلیا کہ آج ہی وہ ذہن و دل میں چبھتے شبے اور خوف کی پھانس کو نکال پھینکے گی۔

اچانک اُسے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ اُس نے لاکر میں رکھی گئیں چیزوں کی جگہ اور ترتیب کو ذہن میں محفوظ کرلیا۔ پھر وہ اُنھیں نکال کر اُسی ترتیب سے پلنگ پر رکھتی گئی۔ آخر میں اُس نے اخبار نکال کر اُسے بستر پر رکھا۔ تہہ کے اندر ایک بوسیدہ اور دوسرا قدرے بوسیدہ بڑا سا لفاف تھا۔

اُس نے پہلے بڑے لفافے کو احتیاط سے کھولا۔ اُس میں اُبھئے کے ساتھ اُس کی تصاویر تھیں، جنھیں وہ دیکھ چکی تھی۔ ڈی وی ڈی بھی دیکھا ہوا تھا۔ پھر اُس نے بوسیدہ لفافے کو کھولا، جس میں رکھی گئی تصویریں آپس میں چپکی ہوئی تھیں۔ وہ تصویروں کو الگ الگ کر کے دیکھنے لگی۔ تصاویر دین محمد کے معاشقے اور ناجائز تعلقات کی گواہ تھیں۔

ایک تصویر میں وہ کندھے پر غلام محمد کو بیٹھائے مسکرا رہے تھے اور پہلو سے لگی زلیخا بیٹے کا ہاتھ پکڑے مغرور نگاہوں سے اُنھیں دیکھ رہی تھی۔

صادقہ نے تمام چیزوں کو رکھ کر مسکراتے ہوئے سوچا کہ اللہ نے کیا خوب جوڑی لگائی ہے، جیسے کو تیسا۔

ذہنی عذاب سے نجات ملتے ہی اُس نے شوہر کو ذہنی عذاب میں مبتلا کرنے کا ایک منصوبہ بنالیا۔

عائشہ کی آمد کی خوشی میں وہ جشن منائے گی، جس میں بھولو، غلام محمد، زلیخا اور اُس کی ماں اور عالیہ کی موجودگی میں وہ غلام محمد سے عائشہ کی شادی کی تجویز پیش کرے گی۔

وہ خوب چھٹپٹائیں گے اور عذر تراشیں گے۔ اُس کا دل ٹھنڈا ہوگا اور وہ اسلامی تعلیمات کا واسطہ دے گی، تب وہ سوچ سمجھ کر نام رکھنا ہی بھول جائیں گے۔

پُرسکون صادقہ حمام میں گئی اور شاور کھول کر اُس کے نیچے جا کھڑی ہوگئی۔

●

('نگینہ'، سری نگر، جلد۔۱، شمارہ۔۴، جون۔اکتوبر ۲۰۱۵ء میں شائع۔)

ایک جنگ اور

سات دنوں کے اندر ایک گھوٹالے کی انکوائری رپورٹ پیش کرنے کا حکم صادر ہوا تو میری پریشانی بڑھ گئی۔ معاملہ حسّاس اور سیاسی نوعیت کا تھا۔ مجھے فکر مند دیکھ کر پی اے صاحب نے کہا، ”سر! بندیشوری شرما گوکل ڈیہہ بلاک آفس جا چکے ہیں۔“

میں نے اُنھیں فوراً طلب کیا۔ شرما جی بولے، ”سر! وَن کرانتی اکسپریس مناسب ٹرین ہے۔ یہ شام پانچ پچپن میں دلّی سے آتی ہے۔ آپ تلکا مانجھی جنکشن پر اُتر کر وہاں سے لوکل ٹرین پکڑ کے چنڈی چلے جایئے گا۔ چنڈی سے گوکل ڈیہہ بیس کیلومیٹر دور ہے۔ ایک بس صبح شام آتی جاتی ہے۔ ٹم ٹم بھی چلتی ہے۔ پہاڑیوں کے درمیان انگریزوں کا بنایا ایک خوبصورت سا بنگلہ ہے، اِسی میں گوکل ڈیہہ پرکھنڈ ہے۔“

کوثر کا غصہ عروج پر تھا۔ سوٹ کیس تیار کرتے ہوئے سرکار کو بددعائیں دے کر بھی جب اُس کا جی ہلکا نہیں ہوا، تب وہ بڑبڑانے لگی، ”جان بوجھ کر پھر جنگل میں بھیجا جا رہا ہے۔ جموں کشمیر الیکشن میں بھی جبراً بھیجا گیا تھا۔ بنئے لڑاکو...... اتنی سمجھ نہیں، سینیر سے لڑنا، دیوار سے سر ٹکرانا ہے۔ کارگر نسخہ، خوشامد۔ تھوڑی سی خوشامد اور کچھ دے لے کر بڑے سے بڑا کام نکالا جا سکتا ہے۔ کوئی ہمیں بتائے، خوشامد کون نہیں کرتا؟ کسے اچھا نہیں لگتا؟ لیکن میری بات سنتا کون ہے؟ منکوحہ ہوں نہ۔ اگر باندی ہوتی تو کام چھوڑنے کا خوف دِلا سکتی......“

بجلی چلی گئی تو حسبِ معمول کوثر کا اعلانِ عام ہوا، ”جو جہاں ہے، وہیں رہے گا۔“

میں بھی اسٹیچو بن گیا کہ اکثر کپ گلاس مجھ سے ہی ٹوٹے ہیں۔

کینڈل جلاتے اُسے نوشے بھائی یاد آ گئے۔ منقطع سلسلہ پھر جڑ گیا۔ اِس بار وہ مجھے سنانے کی غرض سے بولی، ''ایک نوشے بھائی ہیں جو گھر باہر کے طعنے مہنے سن سہہ کر بھی بیوی بچوں کو خوش رکھنے میں لگے رہتے ہیں۔ کتنی چالاکی سے الگ ہوئے۔ سارا الزام گھر والوں پر لگا۔ دو سال کرایے کے مکان میں رہ کر عالی شان مکان بنوا لیا۔ لاڈلی شہلا نے ایک وقت کا کھانا چھوڑا، دوسرے دن کار کی چابی اُس کے حوالے کر دی گئی......''

خلافِ معمول بجلی فوراً آ گئی۔ کوثر چپ ہو گئی اور بیٹیاں آنگن سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ میں احتیاطاً ٹارچ لے جانا چاہتا تھا، جو مجھے نہیں مل رہا تھا۔ میں نے کوثر کی تلاش شروع کی۔ وہ اپنے کمرے میں نظر نہیں آئی۔ باتھ روم کا دروازہ نیم وا تھا۔ کچن سے کھٹ کھٹ کی آواز آ رہی تھی۔ میں قریب گیا۔ کوثر زادِ راہ رکھتے ہوئے خود کلامی کر رہی تھی، ''اُن لوگوں نے تو شرط لگا دی تھی کہ شادی چھوٹی بیٹی سے کریں گے۔ اماں کمزور پڑیں۔ لیکن ابا اڑ گئے تھے...... اپنی اپنی قسمت۔ آپا کم شکل ہو کر بھی بازی مار گئیں۔ سبزی کے لئے بھی چپراسی کو پانچ سو کے نوٹ تھماتی ہیں۔ شادی بیاہ میں قیمتی گفٹ دے کر کس ادا سے کہتی ہیں، نا بابا! مجھ سے یہ نہیں سنا جائے گا کہ ناہید نے بھی سو، دو سو روپے کا لفافہ پکڑا یا ہے......''

اُلٹے پاؤں لوٹتے ہوئے میں نے سوچا کہ بے چاری کو معلوم نہیں، سوچ کی مٹھی میں دکھ اور سکھ دونوں ہوتے ہیں۔ میں جواب دے سکتا تھا، لیکن معاملہ طول پکڑ لیتا۔ پھر دونوں پچھتاتے۔ ایک چپّی ہزار بلا ٹالتی ہے۔ ایسے ہی موقعوں پر میں اکثر خاموشی اختیار کر لیتا ہوں۔ پہلی جھڑپ میں شکست کھائے مرغے کی طرح روبرو نہیں ہوتا۔

میں رات کے سوا گیارہ بجے چنڈی ریلوے اسٹیشن پر اُترا۔ دو چار مسافروں کے ساتھ ڈبّے سے تھوڑی روشنی بھی پلیٹ فارم پر اُتر آئی تھی۔ میں لپک کر اے ایس ایم کے دفتر میں گیا اور اُس سے ویٹنگ روم کھولنے کی گزارش کی۔ وہ میرے سراپے کا جائزہ لے کر بولا، ''سر! آدھی رات تو گزر چکی ہے۔ اچھا ہو گا آپ یہیں آرام کرسی پر لیٹ کر صبح کر لیں۔ بند کمرے میں مچھر زیادہ ہوتا ہے۔''

بات مناسب اور مشورہ معقول تھا۔ میں آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔

''کسی خاص کام سے ہی آئے ہوں گے؟'' اُس نے پوچھا۔

''جی۔'' مختصر سا جواب دے کر میں نے سوالوں کے دریچے بند کر دیئے تھے۔

''میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف کہیے گا۔'' اُس نے کہا۔

میں سفر میں خاموش رہتا اور میل جول نہیں بڑھاتا ہوں۔ اپنائیت، ہمدردی اور تعاون کی پیش کش ہی نشہ خورانی گروہ کے کارگر ہتھیار ہیں۔ سادہ لوح اور ملنسار مسافر اُن کے آسان شکار ہوتے ہیں۔ خبریں دیکھ پڑھ کے حسّاس مسافر اُسی طرح کے خدشے اور خوف سے دوچار رہتے ہیں، جس طرح فرقہ وارانہ فساد کے بعد لوگ ایک دوسرے کی گلی محلوں سے گزرتے وقت۔

میں حالات کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے نوجوان خاندانی لگا۔ وہ بھی مجھے اہم سمجھ رہا ہے۔ میں پلیٹ فارم پر نہیں بلکہ اے ایس ایم دفتر میں ہوں۔ میں نے دل کو سمجھایا کہ خوفزدہ ہونے کی بات نہیں۔ منزل نادیدہ ہو، تب سفر پوچھ پوچھ کر ہی طے کرنا پڑتا ہے اور ضرورت زبان کھولنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ میں نے ملتجی لہجے میں کہا، ''مجھے بلاک آفس جانا ہے۔ بس کے متعلق ضروری جانکاری دے سکیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔''

اُس نے تپاک سے کہا، ''بم بھولے بس، دو کھیپ لگاتی ہے۔ صبح آٹھ بجے آتی اور نو بجے لوٹ جاتی ہے۔ پھر شام پانچ بجے آکر چھ بجے لوٹتی ہے۔ اِس طرح دونوں جانب سے آنے جانے والوں کو صبح اور شام کا وقت مل جاتا ہے۔ یہ وقت ٹرین سے بھی میل کھاتا ہے۔ سڑک بہت خستہ ہے۔ ٹم ٹم والے بس چھوٹنے کے بعد من مانا کرایہ وصولتے ہیں۔ آپ کو بس مل جائے گی۔''

اطمینان نصیب ہوا، تب تھکا جسم گوندھے ہوئے آٹے کی طرح ڈھیلا پڑنے لگا۔ تیسرے پہر نے ماں کی طرح بانہیں پھیلا دیں اور میں اُن میں سما گیا۔

نہ جانے کب سے کھڑی مال گاڑی ایک جھٹکے سے حرکت میں آئی۔ ڈھنمناتے ڈبّوں کی بے ہنگم کرخت آواز میں بریک سے جکڑے چکّے کی سِسکاری بھی شامل تھی۔ میری نیند ٹوٹ گئی۔ اُس نے مُسکرا کر سلام کیا۔ بے ساختہ میرے منہ سے بھی وعلیکم السلام نکل گیا۔ اُس کا چہرہ کنول کی طرح کھل گیا اور مسرّت، ترنگ کی طرح میرے دل میں بھی پھیلنے لگی۔ اُس کی قیافہ شناسی متاثر کن تھی۔

''بہت تھکے تھے، اِسی لئے دانستہ چھوڑ دیا تھا۔ میرا نام اخلاق احمد ہے۔ میں

ایسٹ چمپارن کا رہنے والا ہوں۔" اُس کا لہجہ اپنائیت سے لبریز تھا۔

کف کے اندر گھسی گھڑی نکال کر دیکھنے ہی والا تھا کہ اُس نے کہا، "ابھی وقت ہے، فریش ہولیں۔ ویٹنگ روم کی صفائی کروادی ہے......"

وہ چابھی لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کا شگفتہ چہرہ دیکھ کر میرا عقیدہ اور بھی راسخ ہوگیا کہ آدمی پیدائشی نیک طینت، ملنسار اور معاون ہوتا ہے۔ وہ بڑھے ناخنوں کو تراش لیتا ہے کہ وہ تشدّد و تعدّی کے لئے اُکساتے ہیں۔ نیک جذبے خودرو پودوں کی طرح دل میں اُگتے اور بارآور ہوتے اور مذہبی، علاقائی اور ملکی رشتے دوب کی طرح ذرا سی نمی پا کر لہلہا اُٹھتے ہیں۔

انتظام تازہ تھا۔ فنائل کی بو تیز تھی۔ صابن کی نئی ٹکیہ کے ساتھ شیمپو کا مِنی پاؤچ بھی رکھا تھا۔ جگہ جگہ مکڑیوں کے جالے تھے، جن میں چوکنّی مکڑیاں اور کیڑے مکوڑوں کی جھولتی کھوکھلی لاشیں تھیں۔ چھپکلیاں گھڑیال سی بے خوف پڑی تھیں۔ اینٹ گھسا کر روشندان کو بند کردیا گیا تھا۔ ناکارہ فلش کے اُوپر بنا مینے کا گھونسلہ ویران تھا۔ مستقل بند کھڑکی پر نیم سوختہ آنسو بہائے اُنگلی بھر لمبا کینڈل سر کٹے بت کی طرح ایستادہ تھا۔ رفع حاجت کے دوران منچلوں نے دیوار پر انسان وحیوان کے جنسی اختلاط کی تصاویر بنا کر فحش جملے بھی رقم کردیئے تھے۔ اُن پر چونا پھیرا گیا تھا۔ پھر بھی تصاویر وتحریر نظر آرہی تھیں۔ پلاسٹک کی گھناؤنی بالٹی، موبل کا سَر بریدہ ڈبّہ، ہینڈل ٹوٹا جگ اور کونے میں پیک وکھینی کی غلاظت کے داغ دھبّوں سے شدید کراہت پیدا ہوئی۔ کسی طرح ضروریات سے فارغ ہو کر میں لوٹ آیا۔

اخلاق احمد میرا منتظر تھا۔ اُس نے بغل میں ایک کُرسی لگا رکھی تھی۔ اُس پر بیٹھتے ہی سرکاری کاغذ پر رکھے سوکھے ناشتے کو وہ میری جانب کِھسکا کر بولا، "اماں ڈانٹ ڈپٹ کر رکھوادیتی ہیں۔ بہن کے ہاتھوں کا بنا ہے۔ ابّا کے انتقال کے بعد اماں نے باورچی خانے میں قدم نہیں رکھا۔ لیکن اُن کی ناک بڑی حسّاس ہے۔ کہیں بھی ہوں، ہدایات دیتی رہتی ہیں۔ مسالہ تیار ہوگیا ہے۔ اور بھنو گوشت کو۔ گیس نکال کر کوکر بند کردو، پُلاؤ کی کنّی ختم ہوجائے گی۔ وہ گرم مسالوں کا خوب استعمال کرتی تھیں۔ ایک دن سالن میں مزہ کم ہونے کی شکایت پر اُنھوں نے ابّا سے کہا تھا، لذّت گھی، تیل اور گرم مسالوں سے ہی بڑھائی جاتی ہے۔ مجھے پچیس پچاس گرام کی پڑیوں کو مہینے بھر چلانا پڑتا ہے۔ خدا کی مار پڑے مہنگائی پر۔

بے چارے غریب غُربا تو ڈاکٹر کی سخت ہدایت پر مریض کو دو چار دن پھل دودھ چکھا دیتے ہیں۔''

تصوّر کی بالکونی پر کوثر آ کھڑی ہوئی۔ اُس نے زادِ راہ میں بیسن کا لڈّو اور انڈے کا حلوا بھی دیا ہے کہ اُسے میٹھا پسند ہے۔ وہ سب کی پسند، ناپسند کا خیال رکھتی اور حکمت لگا کر سب کی خواہش پوری کرتی رہتی ہے۔

اُسے گزشتہ رمضان یاد آ گیا۔ بیس تاریخ کو عید پڑ رہی تھی۔ اگر پچیس چھبیس کو پڑ جاتی تو سرکار پیشگی تنخواہ کا اعلان کر سکتی تھی۔ ایک نئے لون کی قسط بھی شروع تھی۔ کام چلاؤ خریداری کی پیشکش پر وہ اپنی قسمت کو کوسنے لگی تھی۔ اگلے سال کی یقین دہانی پر تو وہ بھڑک اُٹھی تھی۔ حالات بگڑتے دیکھ کر وہ گھر سے باہر نکل گیا تھا کہ پیٹھ پیچھے بک بول لینے سے اُس کا جی ہلکا ہو جائے گا۔ وہ کچھ دیر تک دروازے پر کھڑا سوچتا رہا تھا کہ کہاں جائے؟ اُسے معلوم ہے کہ دل بُرا ہو تو شفق سیاہی مائل لگتی، دھبّے میں چاند نظر آتا اور کہیں پناہ نہیں ملتی ہے۔ وہ دَبے پاؤں اندھیرے کمرے میں لوٹ کر بستر پر لیٹ گیا تھا۔ اُسے غیر موجود سمجھ کر وہ بول رہی تھی، ''میں بھی پاگل ہے، چاہتی ہوں کہ وہ نوشے بھائی جیسا بن جائیں۔ ہر انسان کی سوچ الگ اور جینے کا انداز جدا ہوتا ہے۔ کوثر بیگم! کیا یہ کم ہے؟ ایک ایماندار اَفسر کی بیوی کہلاتی اور سماج میں مخصوص عزّت بھی پاتی ہو......''

پھر اُس نے بیٹیوں کو پھٹکارا تھا، ''کیسی ہو تم سب؟ چُپ نہیں کرا سکتی تھی؟ الماس! تم نے بھی پاپا کو نہیں روکا۔''

پھر وہ متفکّر لہجے میں بولی تھی، ''خدا جانے کہاں نکل گئے؟ کب لوٹیں گے؟ کھانا لگانے جا رہی تھی......''

معیادی بخار والے دن بھی اچھے گزرے تھے۔ گھریلو کام کاج ٹھپ۔ بھنورے کی طرح وہ پھیرے لگاتی تھی۔ کبھی پیشانی پر تو کبھی بنیان کے اندر ہاتھ گھسا کر سینے پر رکھے رہتی۔ ایک بار اُس نے بچوں سے نظریں بچا کر تپتے گال پر رخسار رکھ کر کہا تھا، ''توا کی طرح گرم ہے۔''

وہ اُسے بھی دوا اپنے ہاتھوں سے کھلاتی پلاتی ہے۔ پہلے ہاتھ میں پانی بھرا گلاس پکڑا دیتی، پھر وہ منہ میں دوا رکھتے بلند آواز میں کافی اللہ شافی اللہ کا ورد کرنے لگتی ہے۔

اُس کا عقیدہ پکّا ہے کہ دوا میں اثر اور شفا تو اللہ دیتا ہے۔

''آپ نے تو حلوا چکھا ہی نہیں ؟ بہت دنوں کا نہیں ہے۔ دو دن قبل گھر سے آیا ہوں۔ معاف کیجئے گا، میں بھی کیا کیا بتانے لگا۔ نہ جانے کیوں؟ ناشتہ کرتے وقت اکثر مجھے گھر والے یاد آنے لگتے ہیں۔''

اخلاق احمد شرمسار نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا، تب میں ماضی سے حال میں لوٹ آیا۔

حلوے کا ایک ٹکڑا اُٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ پردیسی کے دل میں گھر آباد رہتا ہے اور گزرے ایام عجائب گھر کی نادر چیزوں کی طرح دلکشی نہیں کھوتیں......

بس اسٹینڈ جاتے ہوئے جب میں مُڑ کر اُسے دیکھنے لگتا، تب وہ گرم جوشی سے ہاتھ ہلانے لگتا تھا۔ اپنائیت کا یہ جذبہ مسرور کُن اور سحر انگیز تھا۔

بھیڑ دیکھ کر دل کی دھڑکنیں از خود بڑھ گئیں۔ میں نے ایک پان دُکاندار پوچھا، تب اُس نے بتایا کہ ''بس، بارات لے کر کہیں گئی ہے۔ کل شام نہیں آئی تھی۔ آج ضرور آئے گی۔ جگہ مل جائے اِس کی چنتا کیجئے سریمان!''

مجھے راحت ملی، لیکن جگہ حاصل کرنے کی فکر بڑھ گئی۔ وقت کاٹنے کے لئے میں بس اسٹینڈ کا مشاہدہ کرنے لگا۔ ایک بوڑھی عورت جھولا پکڑے بیٹھی تھی۔ مرغی جھولے سے باہر سر نکال کر منہ کھولے سانس لے رہی تھی۔ ایک ہوٹل کے سامنے دو تین کتے کھانا کھاتے ہوئے لوگوں کو ملتجی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اُن میں ایک زخمی تھا، جس کی گردن کا ناسور رِس رہا تھا۔ وہ بیکل تھا۔ جب وہ کان پٹ پٹاتا، تب دو چار کیڑے گر پڑتے تھے۔ اِسی سبب اُسے کہیں بھی زیادہ دیر تک ٹکنے نہیں دیا جا رہا تھا۔ ایک چائے دُکاندار نے جب اُس کے کولہے پر گرم پانی پھینکا، تب ایک بوڑھے نے بھی لاٹھی دِکھا کر اُسے دُھتکارا، لیکن وہ پھر آ کھڑا ہوا۔ وہ بھوکا تھا۔ ہوٹل والے کی پالتو بلّی ٹہل ٹہل کر جوٹھن کھا رہی تھی۔ گولر کے پیڑ کے نیچے مجمع لگائے ایک سپیرا، سانپ اور نیولے کو لڑنے کے لئے اُکسا رہا تھا۔ دونوں لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن تماش بین لڑائی دیکھنے کے لئے بیتاب تھے۔ مندر کے چبوترے پر کچھ لوگ پیپل کے سائے میں بیٹھے، لیٹے اور کچھ جوا کھیل رہے تھے۔ ایک لڑکا اپنی بکری کو کٹہل کا پتّا کھلا رہا تھا۔ ٹم ٹم میں جتے زخمی مریل گھوڑے گردن سے جھولتے خالی توبڑے

سے نجات پانے کے لئے بار بار سَر جھٹک رہے تھے......

اچانک شور بلند ہوا۔ دھول اُڑاتی، ڈولتی، رینگتی بس کو آتے دیکھ کر مسافروں میں کھلبلی مچ گئی۔ بس رُکتے ہی مسافروں نے بول بم شردھالوؤں سا ہلاّ بول دیا۔ میں گھبرا کر دور جا کھڑا ہوا۔ لیکن بس چھوٹ جانے کا یقین ہوتے میں بھی بھیڑ چیرتا، سوٹ کیس کھینچتا اور تھرمس بچاتا ہوا پشت کی جانب بڑھنے لگا۔ پچھلے چکّے کے اوپر بنے دو سیٹا کے قریب پہنچا تھا کہ ایک زوردار دھکّا کھا کر میں اُسی پر لُوھک گیا۔ سیٹ پر کسی نے ایک گچھا پھینک رکھا تھا۔

ڈرائیور بس کا انجن اسٹارٹ چھوڑ کر کود گیا تھا۔ پھر وہ بہت دیر کے بعد آیا اور زور زور سے اِکسیلیٹر دَبا کر چھوڑنے لگا۔ دھول آمیز ڈیزل کے بدبودار کالے دھوئیں سے بس میں سوار مسافروں کا دَم گھٹنے لگا۔ اُس نے دو چار اور مسافروں کو کیبن میں ایڈجسٹ کر کے شنکر بھگوان کی مورتی کو دیکھا۔ اُن کا چہرہ اُداس اور گرد آلود تھا۔ اُس نے چکٹ صافی سے دھول اُڑا کر باسی مالے کو بدلا۔ اگربتّی جلا کر کھونسا۔ پھر لیمو اور مرچ کی سوکھی لڑی کو نوچ کر تازہ لڑی لٹکا کے شنکر بھگوان کو پرنام کیا۔ شیشے پر چونے سے ۷۸۶ لکھا تھا۔ بجرنگ بلی اور سائیں بابا کی تصویروں سے ہٹا کر کاجول اور شاہ رُخ خان کی تصویر لگائی گئی تھی۔ گیٹ پر لکھا تھا،

لٹک مت، پٹک دوں گی اندر آجا، جگہ دوں گی

اور انجن کے ڈھکّن پر،

میں ہوں مزاجِ گرم، مجھ پر نہ رکھنا پیر نہ کسی سے دوستی نہ کسی سے بیر

پھر بھی کئی لوگ اُس پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔

جب بس رینگنے لگی، تب کسی طرح گردن نکال کر ایک شخص نے مجھ سے کہا، ''سر جی! جرا سا......'' اُس نے کھڑکی کی جانب اشارہ کیا۔

مجھے کا مالک سمجھ کر اُسے گھسنے میں مدد دیتے ہوئے میں نے گھبرا کر سوچا کہ اب دوسرا بھی آتا ہی ہوگا......

بس چلنے لگی تو چکّے میں لگے موٹے گیٹس، لوز اِسپرنگ اور اوور لوڈنگ کے سبب چکّہ، مڈگاڈ سے ٹکرانے لگا۔ رفتار بڑھی تو کھٹ کھٹ کی آواز پیدا کرتا چکّا، ہتھوڑے کی طرح کمر پر ضرب لگانے لگا۔ بس رفتار پکڑتی، تب کھٹ کھٹ کی آواز پتھر توڑتی کریشر مشین کی آواز میں تبدیل ہو جاتی۔ لیکن رفتار کمزور پڑتے کمر پر طبق کوٹے جانے کا احساس ہوتا۔

سیٹ مل جانے کی خوشی کافور ہوگئی۔

بغل میں بیٹھے شخص نے مانگ کر کھینی کھائی اور دودھ پلاتی ایک کم سن عورت کے نیم عریاں پستان کو کئی بار دیکھا۔ چوراہے پر زیرِ تعمیر مندر کے نقاب پوش ہنومان جی کو اُس نے پرنام کیا اور سکّے اُچھال دیئے۔ پھر وہ دس روپے کا رول بنا کر کھڑا ہوا اور اُسے کنڈکٹر کو پکڑا کے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی پالنے میں جھولتے بچّے کی طرح اُس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اُس نے جَماہی لی، جسم کو آڑا ترچھا کر کے سامنے والی سیٹ کے نیچے پاؤں گھسایا۔ پھر کھڑکی اور پُشت سے بنے زاویئے میں سر پھنسا کر اُس نے آنکھیں موند لیں۔ وہ ماں کی چھاتی سے لگے بچّے کی طرح فوراً سو گیا۔ کھینی کے ٹکڑے پھول کر نیم وا ہونٹوں سے پھسلنے لگے تھے۔ اچانک لار کا ایک قطرہ ٹپکا اور بازو پر گر کے لُوھک گیا۔ ہونٹ اور کپڑے سے ہمرشتہ لار کے تار پر جب کبھی کرن پڑتی، تب وہ چمکنے لگتا تھا۔

مسافروں کو اُتارتی اور سوار کرتی ہوئی بس ایک بڑے سے گڈّھے کو پار کرتے وقت بائیں جانب کچھ زیادہ جھک گئی، تب ایک دھماکہ ہوا۔ کھڑے مسافر لُوھک پڑے۔ میں بغل میں سوئے شخص کی آغوش میں جا سمایا۔ لوگ دھڑا دھڑ اُترنے لگے۔ مسافر اپنے اپنے سامان کو لے کر چل پڑے۔ وہ بھی گچھا کندھے پر رکھ کر اُتر گیا۔ کھینی کا ملبہ گریبان کے اندر گھس کر برساتی کیڑے کی طرح ذہنی اذیّت پیدا کرنے لگا، تب میں نے رومال کو دستانے کی طرح پنجے میں پھنسا کر ہاتھ بنیان کے اندر گھسایا۔ پھر چٹکی سے لوندے کو پکڑ کے رومال سے آس پاس کے حصّوں کو پونچھا اور ہاتھ سیٹ کے نیچے لے جا کر رومال چھوڑ دیا۔ مجھے لگا کہ بس کسی باہوبلی نیتا کی ہے یا پھر یہاں کے لوگوں میں احتجاج کی چنگاری بھی نہیں بچی ہے۔

خلاصی اِسکرو ڈرائیور سے چکّے کو ٹھونک بجا کر دیکھتے ہوئے کھیج نکالنے لگا، ''بہنچو! نچنیا اور بینڈ باجے والے کو چھت پر چڑھا دیا تھا...... اسٹپنی بھی گیا...... کھیل کھتم، پیسہ ہجم...... ہاہا ہاہاہا...... جا، بڑھا کے......''

پھر وہ املی کے پیڑ کے نیچے کھڑا ہو کر پسینے پونچھنے لگا۔ ڈرائیور بس سے کود کر اُترا۔ پھر وہ پیشاب کر کے خلاصی کو ساتھ لیتا ہوا کھجور بنّے کی جانب چل پڑا۔

بس خالی ہوگئی، تب میں بھی اُتر گیا۔ وہ شخص میرا منتظر تھا۔ اُس نے لپک کر میرے ہاتھوں سے اردلی کی طرح سوٹ کیس اور تھرمس لیتے ہوئے کہا، ''چلیے سر جی! میں

پہنچادیتا ہوں۔ اوپھس ہی جانا ہے نہ؟''

میں نے مشکور نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا،''ہاں۔''

اُس نے تسلّی کے لئے کہا،''سر جی! جادا دور نہیں، دو کوس سے بھی کم بچا ہے۔ پگڈنڈی سے چلیں گے تو ایک کوس ہی پڑے گا۔''

اُس کا آفر اور حسنِ سلوک مجھے اچھا لگا۔ اُس کے خلاف اُبلتا غصہ از خود جھاگ کی طرح بیٹھنے لگا۔

اُس نے گمچھے کا مُریٹھا بنا کر سر پر رکھا۔ پھر وہ سوٹ کیس کو سر پر اور تھرمس کو بغل میں لٹکا کر سڑک چھوڑ کے پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ اُس کی رفتار تیز تھی، لیکن فاصلہ بڑھ جاتا، تب وہ کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگتا تھا۔ اُس نے ایک چاپاکل کے نزدیک سوٹ کیس اور تھرمس کو صاف ستھری جگہ پر رکھ کے پہلے خوب پانی بہایا، پھر نل کے منہ کو دھویا۔ میں قریب پہنچا، تب اُس نے التجا کی،''سر جی! تھوڑا سا بھی پانی پی لیجئے۔''

اُسے نل سے پانی بہاتے دیکھ کر میرے ذہن میں گاؤں کا مڈل اسکول رقص کر گیا۔ لنچ بریک میں نل پر دھکا دھکی شروع ہو جاتی اور اسی طرح پانی بہایا جاتا تھا۔ بچے ایک دوسرے کو پانی پلاتے تھے۔ جب کوئی شرارتاً آخری چلّو پانی دوستوں پر اُچھال دیتا، تب بھگدڑ مچ جاتی تھی۔ دبّو بچے موقعے کا فائدہ اُٹھا کر پانی پینے لگتے تھے۔ گرمی کے موسم میں نل کے آس پاس برنیاں، مدھومکھیاں اور تتّیا اُڑتی رہتی تھیں۔ پانی پیتے وقت برنی کا پچھلا حصّہ دھونکنی کی طرح پھولتا پچکتا۔ تتّیا گیلی مٹّی سمیٹ کر لوندے بنا کے لے اُڑتی۔

''سر جی! تھرمس کے ڈھکّن میں پانی دوں؟'' مجھے گم صُم کھڑا دیکھ کر اُس نے پوچھا تھا، تب میں گاؤں سے لوٹ آیا۔

میں اوک سے پانی پینے کے لئے نل پر جھک گیا، تب وہ ہینڈل کو اُوپر اُٹھا کر ہلکے ہاتھ سے اُسے نیچے دبانے لگا۔ پانی لوٹے کی دھار کی طرح چلّو میں گرتا۔ احتیاط کے باوجود پانی ناک میں گھس جاتا۔ جوتے، پینٹ کی مُہریاں اور آستین تر ہو گئیں۔ ناک میں جلن ہونے لگی۔ میں پانی پی کر کھڑا ہو گیا، تب اُس نے تسلّی دیتے ہوئے مشورہ دیا،''کوئی بات نہیں، سوکھ جائے گا۔ منہ ہاتھ بھی دھو لیں سر جی!''

جب میں فارغ ہو گیا، تب اُس نے ہاتھ اور منہ دھویا۔ پھر بائیں ہاتھ سے نل کا

منہ بند کیا اور دو چار زوردار ہاتھ مار کے منہ ہتھیلی سے سٹا کر ''سوں، سوں'' کی آواز نکالتے ہوئے اُس نے خوب پانی پیا۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کے پاؤں کو جانگھ تک دھویا۔ آنکھوں پر چھپا کے مارے۔ پھر وہ چہرہ خشک کئے بغیر سامان اُٹھا کر پگڈنڈی پر آ گیا۔

وہ آگے آگے چل رہا تھا۔ آم کے ایک باغ سے گزرتے ہوئے اُس نے بوڑھے رکھوالے کو مخاطب کیا، ''جے شری رام کا کا!... برا مجا ہے۔ دن بھر کھوب آم چوسو..... یے نہیں کہ.....''

بوڑھے نے ایک نظر مجھ پر ڈال کر چوکی کے نیچے رکھے آموں کو دیکھا۔ پھر اُس نے چُن چُن کر دو چار اچھے اور بھچکے آم اُسے دیتے ہوئے کہا، ''لے لو، تم بھی کھالینا۔''

پھر قدرے توقف کے بعد اُس نے پوچھا، ''یے ساہب کون ہیں؟''

گمچھے میں آم باندھتے ہوئے اُس نے کہا، ''برے ساہب ہیں۔ راجدھانی سے آئے ہیں، اوپھس چیکنگ کرنے......''

میں اُس کی قیافہ شناسی پر حیران تھا کہ اُس بوڑھے نے ہاتھ جوڑ کر مجھے ''رام رام'' کہا اور عاجزی سے اجازت طلب کیا، ''ہوکم ہو تو ہجور کے لئے بھی؟''

''نہیں! نہیں......'' میں تیز قدموں سے میں آگے بڑھ گیا۔

''سر جی! برا نیک اور محنتی آدمی ہے۔ اِس نے پیٹ کاٹ کر اکلوتے بیٹے کو پڑھایا لکھایا ہے۔ وہ سول کوٹ میں پیسکار رہے۔ سادی کے بعد ایک دَم بدل گیا سر جی! اُس نے گاؤں سے بھی ناتا رستہ توڑ لیا ہے۔''

میں خاموش رہا، تب وہ بولا، ''کا کا رِگرا بھچکا ہوا آم بانٹ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے، اب کس کے لئے کمانا بچانا۔ ایک پیٹ کے لئے بھگوان نے دو ہاتھ دیئے ہیں۔''

پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولا، ''پیر کے پکے آم کا سواد الگ ہوتا ہے۔ اِسی لئے مانگ لیا، سر جی!''

بی ڈی او کے چیمبر میں داخل ہو کر اُس نے سوٹ کیس اور تھرمس کو ٹیبل پر رکھا۔ پھر وہ صاف ستھری ایک کُرسی کو جھاڑ پونچھ کر بولا، ''بیٹھئے سر جی! برا بابو کو کھوج کر لاتا ہوں۔''

اُس کے نکلنے سے قبل ہی ایک ادھیڑ عمر شخص داخل ہوا اور فرشی سلام ٹھونک کر بولا، ''مجھے پتا ہے، حضور کو بے حد پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ خدا گواہ ہے، بندہ مجبور تھا۔

حاکم کی منجھلی بیٹی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ اُنھیں شہر جانا پڑا ورنہ ریلوے اسٹیشن پر خاکسار کے ساتھ حاکم کو بھی منتظر پاتے۔ بس کی خرابی کا پتہ چلتے میں سواری کے انتظام کے لئے نکلا ہی تھا کہ......''

وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر اُس شخص سے مخاطب ہوا، ''چل ہریا! حاکم والے کمرے میں۔ تیری قسمت پر مجھے رشک آرہا ہے۔ تجھے حضور کی خدمت کا موقع مل گیا۔''

کمرہ عمدہ اور آراستہ تھا۔ ضروریات کی تقریباً تمام چیزیں موجود تھیں۔

میں نے اُس شخص سے کہا، ''سب سے پہلے میں غسل کروں گا۔''

اجازت طلب انداز میں ہاتھ جوڑ کر ہریا جانے لگا، تب میں نے پچاس روپے کا ایک نوٹ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، ''اِسے رکھ لو۔ بچوں کے لئے کچھ لیتے جانا۔''

بڑا بابو لپک کر میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا، 'اِس کی یہ مجال کہ محنتانہ وصولے۔ حضور کی خدمت تو ہم سب پر فرض ہے...... اور یہ تو بلا نوکری آفس کے ہی ٹکڑوں پر ایک بڑے کنبے کو پال رہا ہے۔''

پھر وہ اُسے گھورتے ہوئے بولا، ''کھڑا کیوں ہے؟''

ہریا چابی والے کھلونے کی طرح چل پڑا، تب بڑا بابو کو کچھ یاد آیا۔ وہ لپک کر برآمدے میں گیا اور جاتے ہوئے ہریا کو روک کر وہ دَبی زبان میں حکم صادر کرنے لگا، ''تھوڑی دیر میں ایک پھیرا لگا جانا، خاص کام ہے...... اور کل ذرا صبح سویرے چہرہ دِکھانا۔''

بڑا بابو تیز قدموں سے لوٹ کر ملتجی لہجے میں بولا، 'گیلے کپڑے حمام میں ہی چھوڑ دیجئے گا۔ انشاءاللہ حضور کو کسی چیز کے لئے باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

وہ اجازت لے کر کمرے سے نکل گیا۔ پھر اُس کی پھٹکار سنائی دینے لگی، ''سورین! ......سورین! ابے کہاں مر گیا؟ کام چور، نوکری مستقل ہوتے ہی چال ڈھال بدل گئی۔ کل تک میرے پیچھے پیچھے چلتا تھا اور آج مجھے دوڑانے لگا......''

اب وہ ہدایات دے رہا تھا، ''تیری ڈیوٹی آج رات نو بجے تک اور صبح پانچ بجے سے...... بڑے صاحب کو ہر حال میں خوش رکھنا ہے، نہیں تو......'' اُس نے دھمکی دی تھی۔

مجھے غسل کی جلدی تھی۔ میں حمام میں گھس گیا۔ تین بار صابن لگا کر غسل کرنے پر بھی کراہت سینے سے چپکی رہی۔

دن بھر آگ اُگلنے والا سورج میدان چھوڑ چکا تھا۔ پرندے بسیرے کے لئے لوٹ رہے تھے۔ لوٹتے مویشیوں کے گلے میں بندھے گھنگھروؤں کی مدھم آواز میں گھنٹی کی آواز تیز تھی۔ ایک بچہ بھینس کی پیٹھ پر بیٹھا بانسری بجانے میں مگن تھا۔ ایک ہاتھی جھومتا ہوا جارہا تھا۔ اُس کی پیٹھ پر ٹہنیاں لدی تھیں۔ مہاوت بار بار اُس کے کانوں پر لات مار رہا تھا۔ اَشوک کے پیڑ پر گوریا ئیں شور مچارہی تھیں۔ پہاڑوں کی ہریالی سیاہی مائل ہونے لگی تھی۔ غسل نے بھوک کی شدّت بڑھادی تھی۔ پُرکشش مناظر کے باوجود میں کمرے میں لوٹ آیا۔

مجھے ناشتہ کرتے ہوئے دیکھ کر بڑا بابو چکرا گیا۔ وہ بیٹھ کر میرے گھٹنے پر سر رکھ کے بولا، ''حضور! حاکم ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اگر خطا ہوگئی ہے، تو بندہ دست بستہ معافی کا طلب گار ہے۔ رحم کیجئے بندہ پرور! رحم......رحم......''

اُس کی اداکاری پر مجھے غصّہ آ گیا۔ میں نے سخت لہجے میں کہا، ''یہ کیا؟ پاؤں چھوڑیئے۔''

وہ فوراً ہاتھ جوڑے کھڑا ہوگیا۔ اُس پر لرزہ طاری تھا۔ میں نے تُرش لہجے میں پوچھا، ''کیا نام ہے؟''

''حضور! غلام کا نام تورا ما اوتار ہے۔ لیکن سبھی بڑا بابو کہتے ہیں۔''

''اچھا! تو آپ ہی بڑا بابو کے عہدے پر فائز ہیں؟''

''جی نہیں۔ فی الحال پر بھاری ہوں۔''

''اصل عہدہ؟''

''یو ڈی سی۔''

''یہاں کتنے دنوں سے ہیں؟''

''فقط دس برسوں سے۔''

''کبھی ٹرانسفر نہیں ہوا؟''

''کئی بار ہوا حضور!''

''پھر لوٹ آئے؟''

''نہیں حضور! جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔''

''یعنی؟''

''حاکم لوگ ہی اِسٹے آرڈر لے آتے ہیں۔''

''آپ حاکم کے من مطابق کام کرتے ہوں گے؟''

''اِس میں تو کوئی شک نہیں۔''

''اُردو خوب بولتے ہیں۔ میں تو سمجھا تھا......''

وہ لہک کر بولا، ''حضور! فیض آبادی ہوں نہ۔ اَجداد فارسی اور اُردو کے عالم تھے۔ میری تعلیم بھی مکتب سے شروع ہوئی۔ افسوس! میرے بچے اُردو سے بھی نابلد رہ گئے۔''

''زیادہ افسوس نہ کیجئے۔ آج اُردو کی روٹی کھانے والوں کے بچے بھی اُردو سے نابلد ہیں۔'' میرا لہجہ طنزیہ تھا۔

''فیض آبادی صاحب! تب تو شعروادب سے بھی شغف رکھتے ہی ہوں گے؟''

''جی حضور! بے روزگاری کے زمانے میں خادم فیض آبادی کے نام سے شاعری کرتا تھا۔ مقامی اخبار میں چند کلام شائع بھی ہوئے تھے۔ لیکن نوکری میں آتے ہی فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہوگیا۔ حضور! اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی حماقت نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ خاکسار، کرم کو ہی دَھرم سمجھتا اور وفاداری کو جزوِ ایمان۔ اکبر الہٰ آبادی میرے آئیڈیل ہیں۔ اُن کے ایک شعر نے ہی میری زندگی کا رُخ بدل دیا۔''

''مجھے بھی تو وہ شعر سنایئے۔ ہوسکتا ہے میری زندگی میں بھی کوئی انقلاب آجائے۔'' میرا لہجہ استہزائیہ تھا۔

''ملاحظہ کیجئے حضور!

جو افسر کہے جھٹ کیجئے ؎ نہ اِف کیجئے نہ بَٹ کیجئے

اُسے بیسن کا لڈو پکڑاتے ہوئے میں نے کہا،

نابابا، نہ، مت کیجئے اب اِسے چکھ لیجئے

پھر میں نے سخت ہدایتی لہجے میں کہا، ''بڑا بابو! کان کھول کر سن لیں دورانِ تفتیش میں اپنا کھانا کھاتا ہوں۔ یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ آپ آفس کے روحِ رواں اور بے حد سمجھدار ''پر بھاری بڑا بابو'' ہیں۔ اُمید ہے انکوائری میں ضروری تعاون کریں گے۔ سمجھ گئے؟''

لڈو بڑا بابو کے گلے میں پھنس گیا تھا، جسے وہ بمشکل حلق کے نیچے اُتار کر بولا، ''حضور! عشائیہ کا انتظام خاکسار نے اپنے طور پر کیا ہے......''

''کہہ دیا نا۔'' میں نے ناگواری ظاہر کی۔
''دو چار قسم کے آم ہیں، اجازت ہو تو صرف وہی......'' وہ ہمت جٹا کر کے بولا۔
''آپ نہیں مانیں گے؟'' مجھے غصّہ آنے لگا۔
مجھے لگا کہ یہ چالاک ماہی گیر ہے۔ جال خوب گھما کر پھینکتا ہے۔ یہ چھوٹی مچھلیوں کو بھی نہیں چھوڑتا ہوگا......
اچانک اُس نے لہک کر پوچھا، ''حضور! اب چائے پیش کروں؟''
''کیجئے۔'' جان چھوڑانے کے لئے میں نے کہہ دیا۔
''بہت، بہت شکریہ حضور! پلک جھپکتے میں حاضر ہوتا ہوں۔'' وہ خوش ہوکر کمرے سے نکل گیا۔
چائے پی کر میں اپنے کام میں لگ گیا۔ متعلقہ کلرک اور بی ڈی او دانستہ غائب تھے۔ مجھے لگا، بڑا بابو تڑپ کا پتّا ہے۔ میں نے حکمتِ عملی تبدیل کر دی۔
بڑا بابو نے عشائیہ کا عمدہ انتظام و اہتمام کیا تھا۔ سلیقے سے ڈائننگ ٹیبل سجایا گیا تھا۔ میں نے رسماً کہا، ''بڑا بابو! آخر آپ نہیں مانے......''
''حضور! خاں صاحب کے آنسو نے مجھے......'' وہ چُپ ہو گیا۔
''خاں صاحب کے آنسو؟ میں سمجھا نہیں؟''
''حضور! خاں صاحب نے بیوی بچوں کی مدد لے کر بڑی محبت و عقیدت سے کھانا تیار کیا تھا۔ جب میں نے دسترخوان لگانے سے اُنھیں منع کیا، تب اُن کے آنسو رواں ہو گئے۔ اُنھیں آنسو بہاتے دیکھ کر بیوی بچے بھی سِسکنے بلکنے لگے کہ اُن کی محنت اَکارت گئی۔ حضور! اُن کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں گئی۔ داد و بخشش کی تمنا خودرو پودوں کی طرح دل میں اُگتی ہے۔ حضور! جو سزا تجویز کریں، بندہ کو سرافگندہ پائیں گے......''
وہ اقبالیہ ملزم کی طرح سر جھکا کر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔
پھر وہ بولا، ''گستاخی معاف! بزرگوں سے سنا ہے، ہر رزق پر کھانے والا کا نام لکھا ہوتا ہے۔ حضور دانشور ہیں۔ کفرانِ نعمت......''
دانستہ پیادے سے شہہ مات کھا گیا۔ ساتھ دینے کی پیشکش کو یہ کہہ کر وہ ٹال گیا کہ ''میری یہ مجال کہ حضور کی ہمسری کروں؟ ذرّہ، آفتاب نہیں ہو سکتا اور نہ میں حاکم کی

جگہ لے سکتا۔ لیکن حکم عدولی نہ ہو اس لئے صرف ساتھ بیٹھنے کا شرف حاصل کر لیتا ہوں جناب!''

وہ پہلو میں بیٹھ کر کبھی التجا اور کبھی ضد کر کے مجھے کھلانے لگا۔

بڑا بابو حجام کی طرح باتیں کرنے لگا۔ وہ مجھ پر نفسیاتی دباؤ بنانے لگا۔ بی ڈی او کی مدح سرائی کرتے ہوئے وہ بولا، ''حاکم مشہور مذہبی رہنما اور سماج سیوک شری گنیش ترپاٹھی کا بیٹا ہیں۔ وہ بھی مذہبی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے ہیں۔ وہ کئی مہا یگہ کرا چکے ہیں۔ اُن کے خُسر بھارت سرکار میں کابینہ وزیر کے پی ایس ہیں۔ حضور! حاکم کو کاسٹ لائن پر تنگ کیا جا رہا ہے......''

میری خاموشی سے شہہ پا کر وہ بولنے لگا، ''حضور! کون نہیں جانتا کہ منصوبوں کے عمل درآمد کا بھی ایک منصوبہ ہوتا ہے۔ وِدھایک فنڈ سے ہونے والے کاموں میں مانیہ منتری جی اور وِدھایک جی کی اِچھاؤں کا پالن کرنا پڑتا ہے۔ ویکاس کاریوں میں لگے لوگوں کے سر ہی بدنامی آتی ہے۔ کوئلے کے کان سے نکلا مزدور ہو یا انجینیر، دونوں کے چہرے سیاہی مائل ہوتے۔ چلّو کے ڈر سے لنگوٹ نہیں پھینکا جاتا۔ فرض نبھانے والے سرفروش ہوتے ہیں۔ گھوٹالے کا لیبل چسپاں کر دینا اور جن ہت یاچکا دائر کرنا تو اب ایک فیشن بن گیا ہے۔ حضور! یہ دباؤ کی راج نیتی ہے۔ یعنی اُنھیں بھی کچھ چاہئے۔ کس سے چھپا ہے؟ اُفسر کے اوپر اُفسر اور اُس کے اوپر بھی بیٹھا ہے۔ سب ایک دوسرے پر نظر رکھتے ہیں۔ حضور جہاندیدہ ہیں۔ آفتاب کو چراغ دِکھانے کی حماقت میں نہیں کر سکتا......''

پھر وہ ایک طشتری اُٹھا کر حلوا پیش کرتے ہوئے بولا، ''اِسے ضرور چکھئے۔ یہ پانچ سطحی شاہی حلوا ہے۔ ہر سطح میں الگ الگ میوے کا مزہ۔ اِس کا نسخہ خاں صاحب کو وراثت میں ملا ہے۔ جس نے بھی اِسے چکھا ہے، وہ اِس کا رسیا ہو گیا ہے جناب!''

بغل میں کھڑے خاں صاحب سے اُس نے کہا، ''خاں صاحب! کل ہی سب سامان منگوا لیجئے اور کم سے کم دو کیلو اِسپیشل کا بھی اِسپیشل حلوا ہماری شہزادیوں کے لئے بھی بنایئے۔''

بڑا بابو کی چرب زبانی نے حلوے کا ذائقہ بڑھا دیا تھا۔ معمولی میٹھائی پر بھی طبق لگا ہو، تو عیب ڈھنک جاتا ہے اور چکھنے والا بدمزہ کہنے کی حماقت نہیں کرتا۔

کرسی سے اُٹھتے ہوئے میں نے کہا، ''خاں صاحب! جب میں کہوں گا، تب حلوا تیار کیجئے گا۔ نہ جانے مجھے کب تک ٹھہرنا پڑے۔''

ہاتھ دھوتے وقت بڑا بابو کندھے پر تولیہ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ خلال پیش کر کے اُس نے کہا، ''مانیہ منتری جی کی نگرانی میں مانیہ وِدھایک جی نے انکوائری رپورٹ تیار کروائی ہے۔ چہل قدمی کے بعد حضور کے ملاحظے کے لئے پیش کروں گا۔''

''اب چلیں۔'' میرا لہجہ خشک اور ناگواری سے پُر تھا۔

''جی حضور!'' وہ سٹپٹا کر بولا۔

چہل قدمی کرتے ہوئے میں نے چودھویں کے چاند کو دیکھا۔ وہ مجھے کوثر کے چہرے کی طرح شگفتہ و دلکش لگا۔ مجھے لگا کہ بھوکے کو ہی چاند، روٹی جیسا دِکھائی دیتا ہوگا۔ مندر کی سیڑھیاں چڑھتے وقت احساس ہوا کہ پیدل چلنے سے جانگھ چڑھ گئے ہیں۔ دو تین خوشگوار ڈکار کے بعد میں نے سوچا کہ واپسی کے دن خانسامے کو سو روپے بخشش دوں گا اور بڑا بابو کی نظر بچا کر ہریا کی جیب میں پچاس روپے ڈال دوں گا۔ اُس نے بُرے وقت میں مدد کی ہے۔ دونوں خوش ہو جائیں گے۔ کوثر ناحق میرے کھانے پینے کی فکر کرتی ہوگی۔

بڑا بابو بس اسٹینڈ کے ایجنٹ کی طرح فی الفور حساب بے باق کرنا چاہتا تھا۔ میری بے فکری سے خوفزدہ ہو کر اُس نے پوچھا، ''حضور! کاغذات لے کر آ جاؤں؟''

رات رانی کا پودہ اپنی خوشبو اِسپرے کر رہا تھا۔ چاندنی رات میں بیلا کی نیم خندہ کلیاں مکھانے جیسی دِکھائی دے رہی تھیں۔ میں تھوڑی دیر اور دل و دماغ کو معطر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بڑا بابو ٹارچ جلائے میرے قدم بڑھانے کا منتظر تھا۔ بادلِ ناخواستہ مندر کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے میں نے کہا، ''چلئے! چلتا ہوں۔''

وہ چاندنی رات میں بھی ٹارچ جلا کر راستہ دِکھاتا ہوا گائڈ کی طرح چل رہا تھا۔

بڑا بابو فوراً سے پیشتر آ دھمکا۔ وہ ایک خوبصورت بریف کیس اور ایک گفٹ پیک کو ٹیبل پر رکھ کر بولا، ''حضور! متعلقہ کلرک کی بہن کی شادی ہے۔ وہ چھٹی پر ہے۔ حضور کو ذرّہ برابر بھی زحمت نہ ہو اور مغز پاشی نہ کرنی پڑے اِسی لئے انکوائری رپورٹ کی فائنل کاپی ٹائپ کروا کر حاکم رکھ گئے ہیں......''

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے تُرش لہجے میں کہا، ''ویری اسمارٹ!

آپ کے حاکم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں؟ میں دستخط ثبت کرنے آیا ہوں؟''

وہ میرے غصّے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا، ''حضور! ایسی کوئی بات نہیں۔ حاکم نے ضروری کاغذات کی نقل بھی منسلک کروادی ہے اور سخت ہدایت دے کر گئے ہیں کہ اگر ایک آدھ رد و بدل لاحق ہو جائے تو میں اُس حصّے کو فوراً ٹائپ کروادوں...... صرف اِس بات کا دھیان رکھنا ہے کہ اِس سے......''

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا، ''واہ! بہت خوب! عنایت۔ شکریہ......''

پھر پیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا، ''اور یہ کیا ہے؟''

''حضور! یہ ایک روبوٹ ہے۔ بے بی ٹوائے۔ میڈ اِن انڈیا۔ یہ نغمے سنا کر گفٹ دیتا ہے۔ دلّی کے پالیکا بازار میں حاکم کو یہ بے حد بھا گیا تھا۔''

میں نے ترش لہجے میں پوچھا، ''اِسے کیوں لائے ہیں؟''

''حضور! حاکم اکثر کچھ نہ کچھ لاتے اور بانٹتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن اِسے وہ خاص طور پر لائے ہیں۔ اُنھیں معلوم ہے کہ حضور کی تین شہزادیاں ہیں۔ یہ چھوٹی شہزادی کے لئے ہے۔ گفٹ دینا حاکم کی پُرانی عادت ہے۔''

پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولا، ''حضور! مجھے معلوم ہے، مذہبِ اسلام میں بھی تحفے لینا دینا جائز ہے......''

ڈبّہ سے روبوٹ نکال کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ بولا، ''وقت کافی ہو چکا ہے۔ حضور نے لمبا سفر طے کیا اور کڑی دھوپ میں پیدل بھی چلے ہیں۔ یقیناً تھک گئے ہوں گے۔ مالش، تکان دور کرتی اور چمپی سے سکون مل جاتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ فوراً کمرے سے نکل گیا۔

میں نے بریف کیس کھول کر دیکھا۔ انکوائری رپورٹ اُوپر ہی رکھی تھی۔ وہ صفحہ مُسکرا رہا تھا، جو فقط میرے دستخط کا منتظر تھا۔ مجھے طیش آنے لگا۔ لیکن ضبط و تحمل سے کام لے کر میں نے رپورٹ کو پڑھا اور منسلک کاغذات پر تحقیقی نگاہ ڈالی۔ انکوائری رپورٹ سلیقے سے تیار کروائی گئی تھی۔ مبینہ گھوٹالے کو حزبِ مخالف کی سازش ثابت کیا گیا تھا۔ اخبار میں لپٹی ہوئی کوئی چیز رکھی تھی۔ میں نے اُسے کھول کر دیکھا۔ مخملی ڈبّے میں چاندی کا منقش قلم اور دوسرے میں نگینہ جڑے زیوروں کا ایک خوبصورت سیٹ تھا۔ ناک کی کیل میں جڑا ہیرے کا نگ جگمگایا اور تراشیدہ زیوروں سے نور پھوٹنے لگا۔ میں نے بریف کیس بند کر کے روبوٹ

اُٹھالیا۔

روبوٹ کی شکل کالے دیو جیسی تھی۔ میں اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اُس کے زیرِ ناف ایک آلہ تھا، جسے چھوتے ہی وہ متحرک ہوگیا۔ اُس کی آنکھوں سے رنگ برنگی شعاعیں نکلنے لگیں۔ پھر لب ہلے اور مترنم آواز سنائی دی،

''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا''
ہم ہیں چیل کوئے اور یہ گھونسلہ ہمارا
صدیوں سے لُٹ رہا، پھر بھی ہرا بھرا ہے
گنگا بہہ رہی ہے اور تو پیاسا کھڑا ہے
''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا''

نغمہ ختم ہوتے روبوٹ نے دایاں ہاتھ جیب میں ڈال کے ایک ہزار روپے کا نوٹ نکال وہ پیش کرنے لگا۔ میں نے نوٹ پکڑلیا، تب وہ فرشی سلام ٹھونک کر قہقہے لگاتے ہوئے ساکت ہوگیا۔ نوٹ اصلی تھا۔ میرا تجسس بڑھنے لگا، تب میں تھوڑی تھوڑی دیر پر آلے کو چھودیتا۔ روبوٹ متحرک ہوتا اور طے شدہ عمل دہرا کر ساکت ہوجاتا۔

اچانک روبوٹ کے قہقہے میں پائل کی کھنک شامل ہوگئی۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ خوبصورت جوڑے میں سجی سنوری ایک کم سِن حسینہ کھڑی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں تیل کی شیشی اور آنکھوں میں مہمان نوازی کی چاہت تھی۔ میں گھبرا گیا۔ مجھے لگا کہ غسل کرتے وقت حمام میں اچانک کوئی گھس آیا۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا، ''کون ہو تم؟''

''لچھو سرکار!''

''اِس وقت کیوں آئی ہو؟''

''مالس کرے لا......''

''مالش کی ضرورت تمھارے بڑا ابوکو ہے۔ نکلو کمرے سے......''

غیر متوقع پھٹکار سے بدحواس ہوکر وہ گرتی پڑتی ہوئی کمرے سے نکل بھاگی۔

صبح میں نے بڑا ابو کو رِپورٹ رکھ کے سبھی چیزیں لوٹا دیں۔ اُس کی آنکھوں میں خوف یا شکست کا نشان نہیں تھا۔

بقیہ دن بہت بُرے گذرے۔ بڑا ابو کا ہر جواب ''بیٹی نہ بیٹا'' جیسا ذو معنی ہوتا۔

میں نے کھانے پینے کے انتظام کے لئے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اب اُس کی دلچسپی و مستعدی ختم ہو چکی تھی۔ چار بار بُلانے پر وہ ایک بار حاضر ہوتا۔ خاموشی اور لاعلمی سے وہ ہزار بلا ٹال دیا کرتا۔

مہر بند انکوائری رپورٹ پیش کر کے میں کئی دنوں تک چوکنا رہا۔ چیمبر میں آنے والے اسٹاف کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا۔ میں حیران تھا۔ کسی نے مجھ سے نہ روودادِ سفر سننا چاہا اور نہ ہی انکوائری کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔

بیوی بچوں کو روودادِ سفر سناتے ہوئے میں نے دانستہ لچھو کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کراماتی روبوٹ کی کہانی سن کر اَلماس مچل گئی، تب کوثر ٹھنڈی آہیں بھر کر بولی تھی، ''آپ بڑے بے درد انسان ہیں۔ ننھی پری کے لئے بھی نہیں سوچا۔ قیمت ادا کر کے تو روبوٹ لے سکتے تھے۔ میں اُس میں دس دس کے نوٹ بھر دیتی۔ میرا دل اُس وقت بہت دکھتا ہے، جب آپا کے بچے ریموٹ سے ہوائی جہاز اُڑاتے اور میرے بچے حسرت سے اُڑتا ہوا جہاز دیکھتے ہیں۔ ہاتھ آیا ایک موقع نکل گیا۔ اَلماس آپا کے بچوں کو روبوٹ دِکھا کر اُس کے دیئے روپیوں سے سب کو آئس کریم تو کِھلا سکتی......''

پھر وہ قدرے توقف کے بعد وہ بولی، ''بچپن کے سکھ اور جوانی کے عیش ہی تو بڑھاپے میں یاد آتے اور سکون بخشتے ہیں۔ لیکن میری بیٹیوں کی قسمت میں تو اماوس کی سیاہ رات اور بھادو کی کڑکتی بجلیاں ہیں......'' کوثر کے چہرے پر کرب نمایاں ہو گیا اور چہرہ تمتمانے لگا تھا۔

اچانک اُس کا تجسس بیدار ہو گیا تھا۔ اُس نے پوچھا، ''ہاں! یے نہیں بتایا کہ زیوروں کا سیٹ بھاری بھرکم تھا یا ہوا ہوائی؟ میں نے اُنھیں نہیں دیکھا ہے، پھر بھی میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ سیٹ وزنی اور اُن میں جڑا نگینہ بھی اصلی ہوگا۔ پھنسا ہوا آدمی اپنی جان چھڑانا چاہتا ہے۔ وہ ناراض کر کے بڑی آفت کیوں مول لے گا؟ آپ نے ہی بتایا تھا کہ ایک ہزار کے نوٹ اصلی تھے۔''

''یہ سب جان کر کیا فائدہ؟'' میرا لہجہ تُرش تھا۔

لہجے کی تُرشی کو نظر انداز کر کے وہ بولی، ''آپ کی جگہ اگر میں ہوتی تو گفٹ لے کر بھی اپنی رپورٹ پیش کرتی۔ بڑا بابو کیا بگاڑ لیتا؟ آئندہ کے لئے سب کو سبق بھی مل جاتا......''

چولہے پر اُبل کر گرے دودھ کی مہک ملتے ہی کوثر دوڑتی ہوئی کچن میں چلی گئی تھی۔ پھر بات آئی گئی اور پُرانی ہوگئی۔

چند دنوں کے بعد ایک صبح معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے صدف نے سوال داغا، ''پاپا! آپ نے تو کہا تھا کہ سرکار کو صحیح انکوائری رپورٹ سونپی ہے۔ کئی سفید پوش بھی بے نقاب ہوں گے اور کچھ لوگوں کو سزا ضرور ملے گی؟''

''ہاں! کہا تو تھا......''

وہ نظریں چراتی ہوئی بولی، ''لیکن پاپا......''

''بات کیا ہے؟ صاف صاف بولو۔'' میں نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''سب کو کلین چٹ مل گئی ہے، وہ بھی آپ ہی کی رپورٹ پر......''

سُرخی پر انگلی رکھ کر اُس نے مجھے اخبار پکڑا دیا۔

پہلے صفحے پر خبر شائع کرائی گئی تھی۔ مانیہ منتری جی نے پریس کانفرنس میں انکوائری رپورٹ کی نقل بھی تقسیم کروائی تھی۔ میں ششدر رہ گیا۔ قدرے توقف کے بعد میں نے کہا، ''لگتا ہے بڑا بابو والی رپورٹ کو ہی میرے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے، ورنہ......''

کوثر نے فوراً طنز کا گولہ پھینکا، ''نکل گیا نہ اصول اور ایمانداری کا جنازہ؟ چہ، چہ ......نہ خدا ملا، نہ وصالِ صنم......''

''لیکن میں بھی چُپ نہیں بیٹھوں گا......'' میرا لہجہ پُرعزم تھا۔

''ہاں! مجھے معلوم ہے، ایک جنگ اور......''

دوسرا گولہ پھینک کر وہ کمرے میں چلی گئی اور میں خبر کا باریکی سے مطالعہ کرنے لگا۔

●

(بعنوان 'جنگجو' ماہنامہ 'سب رس'، حیدرآباد میں اور ترمیم و تنسیخ کے بعد کتابی سلسلہ 'ثالث'، مونگیر، 'فکشن نمبر'، جلد۔۳، شمارہ۔۹۔۱۰ اکتوبر ۲۰۱۶ء میں شائع۔)

تہی دست

بے نظیر کو دفن کر کے بیشتر اصحاب قبرستان سے ہی جا چکے تھے۔ کچھ لوگ گھر تک آئے اور اجازت لے کر لوٹ گئے۔ چند رشتے دار کرسیوں پر بیٹھے نوٹ بندی کے اثرات پر گفتگو کر رہے تھے۔ شجاع الدین والد کے ساتھ کتراتا نظریں چُراتا گھر میں داخل ہوا اور سیدھے اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔

آنگن میں بیٹھیں چند عورتیں محوِ گفتگو تھیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ قیاس آرائیاں۔ سبھی معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتی تھیں۔ جنید کی اماں خجل تھیں کہ اُن کے ہاتھ نیم پختہ ثبوت بھی نہیں لگا تھا۔

سالم بہو کو اپنی گزشتہ تذلیل کا بدلہ چکانے کا موقع ہاتھ لگ گیا۔ وہ استہزائیہ لہجے میں بولی، ''جنید کی امّا! آج تو آپ بھی پھِس۔''

وہ خشمگیں نگاہوں سے اُسے گھورتے ہوئے بولیں، ''چُپ رہو! ابھی تم اِس قابل نہیں ہوئی کہ بڑوں کے درمیان بیٹھو، بولو۔ تلے اوپر بچے جن کر کوئی خود کو بھلے ہی تجربہ کار کہہ لے، لیکن ہوتی نہیں۔ میں نے دھوپ میں بال سفید نہیں کیا ہے۔ بچی! میں اُڑتی چڑیا کے پَر گنتی ہوں۔ کیوں اُتاولی ہو رہی ہو؟ ابھی میں نے ہاتھ نہیں کھینچا......''

بات کا رُخ بدلتے دیکھ کر سنجیدہ بیگم بولیں، ''فرقان کے ابا کہہ رہے تھے، میکے والوں نے بڑھ چڑھ کر پیسے کو پانی کی طرح بہایا ہے۔''

''زچہ بچہ کی موت کیسے ہوئی یہ بھی بتایا ہی ہوگا؟'' ماہ پارا نے پوچھا۔

سنجیدہ بیگم اَبرو کو کمان سا بنا کر بولیں، ''ہاں، زیادہ خون نکلنے سے مری ہے۔

آپریشن میں کوئی نس کٹ گئی تھی۔ چڑھایا خون تین چار گھنٹے میں بہہ نکلتا اور بچہ دو گھنٹے میں ہی چٹ پٹ ہو گیا تھا۔ ایک تو وہ اُٹھ ماسو تھا اُس پر دل میں سُراخ...... نہ بچے کو ماں کا دودھ نصیب ہوا اور نہ ماں، بیٹے کو دیکھ پائی۔''

جنید کی اماں بولیں، ''مجھے تو معاشقے کی بو مل رہی ہے۔ بھلا چنگا، گبرو، عاشق علی کا عین شادی کے دن مرنا اور نیم پاکر قبرستان کو چھوڑ کر مُراد پور قبرستان میں اِس کا دفنایا جانا مجھے ہضم نہیں ہو رہا ہے۔''

تلّے اُوپر بچے جننے کا طعنہ سنتے سنتے سالم بہو عاجز آ چکی تھی۔ وہ بیٹی کو چھاتی سے لگائے یہ سوچنے لگی، کسی کو کیا پتا کہ وہ تلّے اُوپر بچے جننے کے لئے مجبور کی جاتی ہے۔ اُسے خود ہر بار جان گنوانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اِس بار تو وہ مرتے مرتے بچی ہے۔ خیراتی (سرکاری) اسپتال کی ڈاکٹرنی نے اُنھیں سمجھایا اور مجھے یوٹرس کینسر کا خوف دِلایا تھا تو وہ باہر نکلتے دانت پیس کر بولے تھے، ''چڑیل! میں تیری چال سمجھ گیا۔ ڈاکٹرنی سے کہلواتی ہے۔ بڑے لوگ کیا جانیں پیڑ پرائی، جن کے عیش موج کے سو سادھن۔ ہم مزدورں کا یہی ایک منورنجن ہے۔ تھکا جسم اور تھک کر راحت پاتا ہے۔''

جب کبھی وہ آنا کانی کرتی، تب وہ گالیاں بکتا لات گھونسے چلانے لگتا ہے۔ ہڈّی تُڑوانے سے بہتر ہے، پُلیا سی بن جانا تا کہ وہ ریل انجن سا سیٹی بجاتا دندناتا گزر جائے۔

سنجیدہ بیگم نے فخریہ لہجے میں کہا، ''مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ اِسے عاشق علی کے بائیں پہلو میں دفنایا گیا ہے۔''

سالم بہو کے خیالوں کی کڑی ٹوٹ گئی، تب وہ غور سے باتیں سننے لگی۔

ماہ پارا فیصلہ کُن لہجے میں بولی، ''تب تو جنید کی اما کا شک یقین میں بدل گیا۔''

سنجیدہ بیگم قدرے لہک کر بولیں، ''وہ بچے کو بھی دیکھ چکے ہیں۔ ہٹا کٹا گورا چٹا تھا۔''

''شکل صورت کس سے ملتی جلتی تھی، یہ بھی بتایا ہوگا؟'' جنید کی اماں نے فوراً پوچھا۔

''یہ پوچھنا تو بھول گئی خالہ!'' سنجیدہ بیگم کفِ افسوس ملنے لگیں۔

''ایک فُرقان بھائی ہیں، جو رتّی رتّی بات بیوی کو بتاتے اور ایک یہ ہیں کہ گھما پھیرا کر بھی ٹوہ لینا چاہوں تو ہڈّے کی طرح کاٹنے دوڑتے۔ بیوی کو پیر کی جوتی سمجھتے۔ اُس وقت بھی حکم چلاتے ہیں، جس وقت مرد گِھگھیاتا اور منّتیں کرتے تھکتا نہیں۔ کاش! میں

بھی موٹی رقم اور ٹرک بھر جہیز لے کر آئی ہوتی۔" ماہ پارا کا رشک بے قابو ہو کر منہ سے کود پڑا۔

سنجیدہ بیگم کی تیوری چڑھ گئی۔ وہ ناک بھوں چڑھا کر بولیں، "کیا میں جہیز کے بل پر بیاہی گئی ہوں؟ نہیں! یہ سچ نہیں ہے اور یہ بھی افواہ ہے کہ میں عمر میں اُن سے بڑی ہوں...... سچ یہ ہے کہ میں نے تین خوبصورت بیٹے جن کر اُن کا دل جیت لیا ہے اور شادی کے بعد ہی گھر کی حالت سدھری ہے۔ وہ کلرک سے اَفسر بنے اور زمین خرید کر مکان بنوایا۔ بس، وہ قائل ہو گئے کہ یہ سب میری قسمت سے ہوا۔"

"اُن کی اماں کا کیا خیال ہے؟" ماہ پارا نے مٹھی بھر نمک چھڑکا۔

سنجیدہ بیگم بُرا سا منہ بنا کر بولیں، "بڑھیا ایک نمبر کی جلن کٹی ہے۔ پانچ بیٹیوں پر ایک بیٹا جنا ہے۔ اِسی لئے وہ کہتی ہے، بیٹے طوطا چشم ہوتے، شادی ہوتے نظر پھیر لیتے، لیکن بیٹیاں بُرے وقت میں کام آتی ہیں...... وہ اکثر سر میں تیل مالش کے بہانے بیٹے کے پہلو میں بیٹھی اِدھر اُدھر کی گپیں ہانکتی اور میرے خلاف کان بھرتی رہتی ہے۔ بے چاری کو پتا نہیں، بیٹا ہر بات مجھے بتا دیتا ہے......"

جنید کی اماں قطع کلام کرتے ہوئے بولیں، "میری ایک رشتے دار اُسی اسپتال میں ہفتوں سے بھرتی ہے۔ میں کل مزاج پُرسی کے بہانے جاؤں گی۔ ہوسکتا ہے کوئی پختہ ثبوت یا سُراغ ہاتھ لگ جائے......"

اِسی سال حج کر کے لوٹیں سبکدوش ڈپٹی کلکٹر نور جہاں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ کمرے سے نکل کر بولیں، "میت والے گھر کو بھی چوپال بنا دیا ہے تم لوگوں نے۔ کیوں دوسروں کے گھر آنگن میں تاکتی جھانکتی اور ٹوہ لیتی پھرتی ہو؟ معلوم نہیں کہ غیبت کرنا، مرے بھائی کے گوشت کھانے جیسا ہے......"

پھٹکار سنتے سب کو اپنے اپنے گھر کے کاموں کی یاد آ گئی اور محفل از خود برخاست ہو گئی۔ پھر ہوا، آنگن میں پڑے جوٹھے کاغذی کپ اور گلاسوں سے کھیلنے لگی۔

چالیسواں کے بعد شجاع الدین کے لئے کئی رشتے آئے۔ لیکن والدہ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میرے لعل پر پہاڑ سا غم ٹوٹا ہے۔ گرم توے کو بھی ٹھنڈا ہونے میں وقت لگتا ہے۔ ماں ہوں نہ، میں جلے پر نمک نہیں چھڑک سکتی۔ پھر بار آئے گا، تب میں اُس کا دل ٹٹولوں گی۔

دمّام واپسی کے سفر میں تہی دست شجاع الدین کے ذہن میں یادیں، ساون کی

گھٹاؤں کی طرح چھانے لگیں۔ اُس نے آنکھیں موندلی۔ پھر بھی گزرے ایام مجسّم و متحرّک ہوگئے۔ اُسے لگا کہ وہ سوچ نہیں رہا ہے بلکہ لیزر شو میں گزشتہ واقعات کو دیکھ رہا ہے۔

ڈاکٹر مریم کے چیمبر سے نکل کر اُس نے لاش حاصل کر کے اُسے گھر بھیج دیا تھا۔ پھر وہ سیدھے قبرستان گیا تھا۔ گورکَن کو ہدایت دے کر وہ تجہیز و تکفین کا سامان لیے گھر پہنچا تو ابّا، امّی کمرے میں بیٹھے دَبی زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ وہ ٹھٹھک کر دروازے پر کھڑا ہوگیا تھا۔ ابّا سمجھا رہے تھے، ''دفن کے بعد بجّو ہمیں سب کچھ بتا دے گا۔''

''پہلے کیوں نہیں؟'' اُنھوں نے بھڑک کر پوچھا تھا۔

''کیا تم یہ چاہو گی کہ میّت پڑی رہے؟ لوگ کانا پھوسی کریں اور طرح طرح کی افواہ اُڑائیں؟'' اُنھوں نے سمجھایا تھا۔

''میں نے ایسا کب کہا؟ بس! مجھے اعتراض ہے مُراد پور قبرستان میں عاشق علی کے پہلو میں دفن پر۔ لوگوں کو خواہ مخواہ باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔ گھما پھیرا کر پوچھیں گے اور کیچڑ اُچھالیں گے۔ سماج کھانا، کپڑا، مکان اور تحفظ نہیں دیتا، پھر بھی اُسے حق حاصل ہے سوال پوچھنے کا، راز جاننے اور حقہ پانی بند کرنے کا۔ لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے جواز جاننا ضروری ہے۔'' اُنھوں نیدلیل پیش کی تھی۔

امّی کی باتوں کو دلیل کی قینچی سے کترنا آسان نہیں تھا۔ ابّا نے فوراً آزمودہ حربہ، اپنی قسم کا استعمال کر دیا تھا۔ امّی کی ضد جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی اور لاش کی بے حُرمتی نہیں ہوئی۔

اذیّت دہ یادوں سے نجات پانے کے لئے شجاالدین نے پردے سرکا کے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ہر سو تاریکی کا سامراج تھا اور خاموش فضا میں نقب لگاتی اِنجن کی آواز۔

نیند آنکھوں سے غائب تھی اور سفر لمبا۔ وہ خوشگوار ماضی میں پناہ تلاش کرنے لگا۔ اچانک اُس کے ذہن میں بچپن مجسّم ہوگیا۔ وہ اکثر نسیم بھائی کے ساتھ آبی پرندوں کے شکار پر جاتا تھا۔ کشتی کی سیر میں اُسے بڑا لطف ملتا۔ اُس کے ذہن میں ایک شکار کا فوٹیج رواں ہوگیا۔

اُس دن نشانہ سادھنے سے قبل اچانک پرندے اُڑ گئے تھے۔ نسیم بھائی خشمگیں نگاہوں سے اُسے گھورتے ہوئے بولے تھے، ''یہ کیا؟ پانی سے ہاتھ نکالوں۔ تمھاری وجہ سے شکار اُڑ گیا۔''

وہ اکثر اپنی ناکامی کا سہرا فوراً کسی کے سر باندھ دیتے۔ پانی سے ہاتھ نکال کر اُس نے اُوپر دیکھا تھا۔ اُسے لگا تھا کہ پرندے شکرگزار نظروں سے اُسے ہی دیکھ رہے

ہیں۔ پھر اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ کشتی اضافی لہریں پیدا نہیں کر رہی تھی، تب وہ افسردہ ہو گیا تھا۔ کشتی پر نیم دراز ہو کر پانی میں لہریں پیدا کر کے اُنھیں دیکھنا اُسے اچھا لگتا ہے۔ کبھی کبھار کوئی مچھلی ہتھیلی سے ٹکرا جاتی یا پھر اُنگلی کو چارہ سمجھ کر ٹھوکر مارنے لگتی۔

وہ سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ ملّاح لگّی کو کشتی پر رکھ کر بے آواز چپّو مار رہا تھا۔ کشتی جل کمبھی کے درمیان پہنچی، تب وہ انھیں پکڑ پکڑ کے کھینچنے لگا تھا۔ وہ کشتی کو اُسی طرح آگے سرکا رہا تھا، جس طرح چوڑی ہارن سخت کلائی میں چھوٹے سائز کی چوڑیاں سرکاتی ہے۔

شکم سیر پرندوں کا ایک جھنڈ لُنڈ مُنڈ درخت پر بیٹھا تھا۔ اُن میں کچھ پَروں پر روغن مل کر خود کو سنوار رہے تھے۔ چند بازو میں منہ ڈالے سوئے ہوئے اور دو چار پھُنگی پر محتاط بیٹھے تھے۔ نسیم بھائی چیتے کی طرح شکار سے قریب تر ہو رہے تھے اور وہ اللہ سے اُن کی خیر کی دعائیں مانگتے مانگتے پرندوں کو بے آواز ہدایت دینے لگا تھا، ''ہش، ہش، اُڑ جا...... اُڑ جا...... ہش، ہش......'' لبلبی دَبانے سے قبل پہرے دار چڑیا نے مخصوص آواز نکالی، پھر بھی پرندے اُڑ گئے۔ نسیم بھائی نے غول پر دَنادَن دو فائر کیا۔ فائرنگ کی آواز سنتے آس پاس کے پرندے بھی اُڑ گئے تھے۔

محتاط پرندوں نے جگہ بدل لی اور خوفزدہ اُڑتے رہے۔ بہت دیر تک ہم لوگ مارے مارے پھرے۔ بھوک پیاس شدّت اختیار کرنے لگی تھی۔ کھانے کا وقت بھی نکلا جا رہا تھا، پھر بھی کسی نے کھانے پینے کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ نسیم بھائی کے اجداد جاگیر دار تھے۔ وراثت میں اُنھیں جاگیر داری نہیں بلکہ جاگیر دارانہ سوچ، شوق اور غصّہ کچھ زیادہ ہی مل گیا تھا۔

ایک کم عمر کارندے کو پرندوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ اُس نے پھُسپھُسا کر اشارے سے نسیم بھائی کو دِکھایا تھا۔ وہ مسرور تھا کہ مالک خوش ہو کر اُسے بھی ایک شکار دیں گے۔ چڑیا، شکاری کشتی دیکھ کر اُڑی تھیں۔ پھر بھی اُن کا حکم صادر ہوا تھا، ''کود و ناؤ سے اور تیر کر گھر جاؤ۔''

وہ سہما ہوا رحم طلب نظروں سے اُنھیں دیکھنے لگا تھا، تب اُنھوں نے ملّاح کو تحکمانہ لہجے میں کہا تھا، ''اِسے ندی میں پھینک دو۔''

اُس نے گھبرا کر مینڈک کی طرح چھلانگ لگائی تھی۔ کشتی پلٹتے پلٹتے بچی، تب نسیم بھائی نے اُس پر بندوق تان لی تھی۔ نشانے کی زد میں خود کو دیکھ کر وہ جان بچانے کے لئے بار بار ڈُبکی لگانے اور جلدی جلدی ہاتھ پاؤں مارنے لگا تھا۔ نسیم بھائی کو ہنستے ہوئے دیکھ کر ہم لوگ بھی ہنسنے لگے تھے۔ تناؤ کی گانٹھ ڈھیلی پڑتے اُس نے نسیم بھائی کے سامنے جلدی سے

دستر خوان لگا دیا تھا۔

واپسی کا سفر خاموشی بھرا تھا۔ کارندے سہمے ہوئے تھے کہ وہ اپنی ناکامی کی بھڑاس کسی پر بھی نکال سکتے تھے۔

گھر پہنچتے نسیم بھائی نے مرغا پکڑنے کا فرمان جاری کیا تھا۔ شکاری دَستے کو اُس مہم میں لگایا گیا تھا۔ دن کے وقت مرغا پکڑنا آسان نہیں ہوتا۔ دو بار اُسے پنجہ مار کر مرغا فرار ہوا، تب اُنھوں نے خشمگیں نگاہوں سے اُسے گھورتے ہوئے وہاں ایک تیز طرار لڑکے کو تعینات کر دیا تھا۔ مرغیاں بھی اِدھر اُدھر بھاگتی ہوئی ''کٹ کٹ کٹاس'' کی صدائیں بلند کرنے لگی تھیں۔ پالتو کتّے اور چند تماش بین بھی دھڑ پکڑ اُبھیان میں از خود شامل ہو گئے تھے۔ اُس رات پانچ مرغے اپنی جان گنوا کر دستر خوان کی زینت بنے تھے۔

کھانا کھاتے ہوئے اُس کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ کسی کو نرغے میں لے کر خوش ہونا، اُس پر تشدّد کرنا یا پھر تشدّد کے شکار کا وی ڈی او بنا کر اُسے وائرل کرنا حیوانی جبلّت کی تسکین ہے۔ اِسی سبب صوبائی، ملکی و عالمی سطح پر جاری ظلم و تشدّد، موب لنچنگ اور نسل کشی کے وائرل فوٹیج کو لوگ دیکھتے اور شیئر کرتے ہیں۔

اِیر ہوسٹس کے اعلان سے شجاع الدین، ماضی کی وادی سے لوٹ آیا۔ اُس نے ایک ہم سفر جوڑے کو دیکھا۔ دوشیزہ کا حسن و شباب دلکش تھا، لیکن مرد عمر میں بڑا اور کم شکل تھا۔ وہ اُس کے کندھے پر سر رکھے سو رہی تھی۔ زیوروں میں جڑے نگوں سے نور پھوٹ رہا تھا۔ اَدھ کھلے گریبان سے اُس کے حسن کا غرور جھانک رہا تھا۔ اُس نے سوچا کہ عورت، سمندر سی اَتھاہ ہوتی اور سینے میں بہت کچھ چھپائے رکھتی ہے۔

اُسے بے نظیر یاد آ گئی، جس کا حسن توبہ شکن تھا اور وجود گلاب کی پنکھڑی پر ٹھہری پُر نور شبنم سی۔ اُس کی بولتی سحر آگیں آنکھیں، نازک و متناسب جسم، قربان ہونے کی تمنا جگاتے ہلالی اَبرو، پیاس بجھا کر بھی تشنہ لبی بخشنے والے گداز ہونٹ اور خفیف مسکان سے ڈمپل بنا کر گفتگو کرنے کی دلکش و مخصوص ادا کہ جی چاہے، وقت تھم جائے اور گفتگو کا وقفہ ترنگ کی طرح دائرہ بڑھاتا رہے۔

شدّتِ جذبات سے مغلوب ہو کر شجاع الدین نے آنکھیں موند لی، تب اُسے لگا کہ تلخ یادوں کی تپتی ریت پر اُسے اِیر ڈراپ کرایا گیا ہے، پھر بھی وہ بادِ صرصر کو جھیلتا ہوا چل رہا ہے۔

ابا کو وراثت میں شرافت اور خستہ حال پشتینی مکان ملا تھا۔ اُس وقت پرائمری

اسکول ٹیچر کی زندگی ٹم ٹم سوار کی طرح ہچکولے کھاتے، ضرب بچاتے اور توازن برقرار رکھتے گزرتی تھی۔ اُنھیں ریٹائرمنٹ بینی فٹ کل جمع پانچ لاکھ چودہ ہزار روپئے ملے تھے۔ ایک لاکھ قرض کی ادائیگی میں ختم ہوگیا۔ موقعے کا فائدہ اُٹھا کر امّی نے دَباؤ بنا کر مینو (منیرہ) کے لئے ایک لاکھ باون ہزار کے زیورات خرید لئے اور صغرا پھوپھی نے بیٹی کی شادی کا دعوت نامہ دے کر ایک لاکھ بطور قرض حسن مانگ لی تھی۔

ابّا کی اُداسی، مہنگائی کی طرح روز بروز بڑھنے اور خاموشی، موسمِ سرما کے سائے سا طویل ہونے لگی تھی۔ وہ راہ چلتے ہوئے نہ جانے کون سا حساب انگلیوں پر جوڑتے ہوئے بُدبُداتے۔ امّی کو بیٹیوں کی شادی کی فکر شدّت سے ستانے لگی تھی اور وہ ابّا کا ہاتھ بٹانے کے لئے بی اے کی ڈگری سنبھالے نوکری کی تلاش میں دن بھر دفاتر کے چکّر کاٹنے لگا تھا۔

کفیل عید کی چھٹی میں دمام سے گھر آیا ہوا تھا۔ وہ اُس کا ہم جماعت تھا۔ گھریلو حالات کے سبب وہ کالج میں داخلہ نہیں لے سکا تھا۔ وہ اُمید لے کر اُس سے ملنے گیا تھا۔ اُس کی روداد سن کر اُس نے کہا تھا، ”تم ارجنٹ پاسپورٹ بنوالو۔ میری کمپنی میں ہلپر کی جگہ خالی ہے۔ میں اکثر ایک دو ویزا ساتھ لاتا ہوں۔ اِس بار معراج بابو (بہنوئی) کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔ تم بھی چلو۔ اللہ بڑا رزّاق ہے۔ پڑھے لکھے ہو، جلد ہی سُپر وائزر بن جاؤ گے۔“

وہ پاسپورٹ بنوانے مشہور ایجنٹ بھیم سے ملا تھا۔ وہ آدمی بڑا پروفشنل اور اُونچی پہنچ والا تھا۔ اُس نے بیبا کی سے جعلی ڈگری اور ڈپلوما کا بھی آفر دیا تھا۔ اُس کا آفر اُس نے قبول نہیں کیا تھا کہ اعلیٰ نسلی وراثت آدمی کو غربت میں بھی باندھ کر رکھتی ہے۔ اگر چہ وہ بھی کئی لوگوں کو جانتا ہے، جو سیفٹی آفیسر، مکینک اور پلمبر بنے موٹی رقم کما رہے ہیں۔

اللہ نے ہجرت میں برکت چھپا رکھی ہے۔ سچ مچ اچھے دن آگئے کہ یہ ایک سیاسی جملہ ثابت نہیں ہوا بلکہ وہ تین سال میں سُپر وائزر بنا اور سات سال میں گھر کی حالت بدل گئی۔ مکان کی شکل وصورت بدلی۔ چھت پر ایک ہال اور دو کمرے بنے، آرائش وزیبائش کے سامان خریدے گئے اور مینو کی شادی دھوم دھام سے ہوئی۔

مینو کی شادی کے بعد اُس کے لئے رشتوں کی جھڑی سی لگ گئی تھی۔ لیکن امّی چاہتی تھیں کہ زینو (ظہیرہ) کے بعد ہی اُس کی شادی ہو اور ابّا کا خیال تھا کہ رشتے آرہے ہیں اور وہ بھی دو ماہ کی چھٹی پر آیا ہوا ہے۔ اِس لئے بہتر ہے کہ ایک بیٹی گئی تو دوسری لے آئیں۔

اُمید کا سورج طلوع وغروب ہوتا رہا۔ دَباؤ میں امّی نے کئی لڑکیوں کو دیکھا۔ لیکن اُنھیں ایک بھی پسند نہیں آئی۔ چھٹی ختم ہوگئی اور وہ نامراد اِس عزم کے ساتھ لوٹا تھا کہ زینو کی شادی سے قبل وہ گھر نہیں جائے گا۔

ایک دن بینک میں اُس کی ملاقات کفیل سے ہوگئی۔ وہ بھی منی ٹرانسفر کرنے آیا تھا۔ واپسی میں اُس نے کہا تھا، ''یار! بہت ہوگیا اوور ٹائم، خوب کما چکے، اب شادی کرلو۔ ورنہ میری طرح پچتاؤ گے۔ گھر کی حالت سدھارتے، بہنوں کی شادیاں اور بھائی، بہنوئی کو سیٹ کرتے آدھی عمر کٹ گئی۔ اب میں تنہا لیٹ میرج کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔''

''یار! میں بھی تمھاری طرح ہی سعادت مند بیٹا ہوں۔ زینو کی شادی کے بعد یا پھر ایک ساتھ ہی ممکن ہے۔'' اُس کا کرب لہجے میں گھلا ملا تھا۔

وہ قہقہے لگاتا ہوا اُس کی پیٹھ پر دَھول جما کر بولا تھا، ''یار! ہم لوگ کماؤ پوت ہیں۔ گھر والوں کے لئے نوٹوں سے بھرا، اے ٹی ایم۔ اُس کی شادی بھی اُس وقت طے کی گئی تھی، جب لوگوں نے گھر والوں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ سعادت مندی بڑی قیمت وصولتی ہے یار!'' وہ اُس کا کندھا تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا تھا۔

اُس رات تکان کے باوجود اُسے گہری نیند نہیں آئی تھی۔ کڑوا سچ نہ جانے کب تک پپر منٹ کی طرح ذہن میں سنسناتا رہا۔

اتفاق سے چند ماہ بعد ہی ایک ارجنٹ رشتہ کا آفر آیا تھا۔ لڑکی کے والد نے ابّا کی موجودگی میں بیٹی دِکھایا تھا۔ مینو اور امّی خاموش رہیں۔ ابّا کو یہ رشتہ معقول لگا۔ اُنھوں نے فی الفور اپنی رضامندی کا اعلان کر دیا تھا۔ امّی کسمسا کر رہ گئی تھیں۔ زینو نے فون پر اُسے پوری روداد سنائی تھی۔

ابّا نے واٹس ایپ پر شادی کی طے شدہ تاریخ اور دو ماہ کی چھٹی لے کر گھر آنے کی ہدایت کے ساتھ لڑکی کا فوٹو اور دو منٹ کا وی ڈی او فوٹیج مینو سے سینڈ کروایا تھا۔

اُس کی شادی بھی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ شبِ زفاف میں بے نظیر کو دیکھ کر وہ قائل ہوگیا تھا کہ وہ سچ مچ بے نظیر ہے اور صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ حسن کے سحر، جسم کی طلب اور شدّتِ جذبات سے مغلوب ہو کر وہ اُس کے قُرب وجسم سے محظوظ ولطف اندوز ہونے لگا تھا۔ لیکن وہ قیدی چڑیا کی طرح وحشت زدہ تھی اور وہ یہ سمجھ کر نہال تھا کہ یہ دوشیزگی کی حیا اور پہلی مِلن کا

حجاب ہے۔ یہ اَن چھوئی اُس کلی سی ہے، جو ہوا کے لمس سے بھی کانپنے لگتی ہے۔ لاجونتی کی طرح سمٹنے اور جسم چُرانے کی ادا نے اُسے بے قابو کر دیا تھا۔ وہ اَمرلتا کی طرح چھانے لگا تھا، تب اُس نے خفیف مزاحمت کے بعد آنکھوں پر بازو رکھ کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ کئی دنوں تک اُسے اپنی عجلت پر ہنسی آتی رہی اور پہلے ہی شاٹ پر رَن آؤٹ ہونے کا شدید ملال بھی ہوتا رہا۔

دو ماہ کا عرصہ، دو پل سا گزر گیا تھا۔ واپس آ کر اُس نے اِس خیال سے اوور ٹائم کا وقفہ بڑھا دیا کہ امّی کی اُداسی اور خدشہ جلد از جلد ختم ہو جائے۔

اِس بار صرف ابّا اُسے اِیرپورٹ تک چھوڑنے آئے تھے۔ وہ اُس کے کندے پر ہاتھ رکھے چل رہے تھے۔ شفیق لمس پا کر اُس کا جی چاہنے لگا تھا کہ وہ اُن کے سینے سے لگ کر اُس بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے، جس کا محبوب کھلونا گم ہو گیا ہو۔ آخری حد پر پہنچ کر اُس نے کہا تھا، ''ابّا! میں سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں۔''

وہ اُسے سینے سے لگا کر پیٹھ سہلاتے ہوئے بولے تھے، ''نہیں بچّو! اب کسی کو کچھ بھی نہیں جاننا۔ تم بھی اپنا دل چھوٹا مت کرو۔ بیٹا! وقت ہر زخم بھر دیتا ہے۔ بیوی کے بغیر جوانی کاٹی جا سکتی ہے، بڑھاپا نہیں۔ جب اور جہاں بے نظیر کا بدل مل جائے، تم اُسے جیون ساتھی بنا لینا۔ نہ جانے میری پسند کو کس کی نظر لگ گئی......''

پھر وہ بازو پکڑے اُسے جی بھر کے دیکھنے لگے تھے۔ جب آنکھیں نمناک ہونے لگیں، تب وہ اُس کی پیشانی کا بوسہ لے کر ''اللہ حافظ'' کہہ کر تیزی سے مُڑ گئے تھے۔ وہ بھی نم آنکھوں سے اُنھیں دیکھتا رہا۔ لیکن اُنھوں نے پلٹ کر اُسے نہیں دیکھا تھا۔

اچانک ہم سفر حسینہ بیدار ہو گئی۔ پھر اُس نے توبہ شکن انگڑائی لے کر اُس شخص کے رخسار پر بوسے ثبت کر کے کہا، ''مائی ڈیر! کتنا سوتا ہے؟''

شجاالدین ماضی سے لوٹ کر اُسے دیکھنے لگا، تب اُس نے نمائشی ادا سے اُس کا سر سینے پر رکھ کر آنکھیں موند لی۔ اُسے لگا کہ اِس کا پیار اور سمرپن بھی چھلاوا ہو سکتا ہے۔

پردۂ ذہن پر دسلائڈ از خود بدل گیا، تب شجاالدین کی آنکھوں میں بے نظیر کی بے بسی اور پژمردہ چہرہ رقص کرنے لگا۔

آئی سی یو میں آنکھیں موندے پڑی بے نظیر پلکوں کو اُس وقت وا کرتی، جب کوئی شناسا آواز اُس کی سماعت سے ٹکراتی یا پھر وہ کسی کا شفیق لمس محسوس کرتی۔ اُسے جب کبھی

لگتا کہ وہ اُس سے کچھ کہنا چاہتی ہے، تب وہ جھک کر اُس کے ہونٹوں سے کان سٹا کر کہتا، ''بولو نہ! بے نظیر! میں سن رہا ہوں......''

وہ پوری قوت لگاتی، تب اُس کے لب پھڑ پھڑاتے۔ وہ اُس کے منہ سے نکلتی ہواؤں میں تحلیل الفاظ کو لپکنے اور ہونٹوں کی جنبش کو ذہن میں محفوظ کرنے لگتا۔ عدم ترسیل سے دکھی ہو کر وہ آنکھیں موند لیتی۔ پھر آنسوؤں کا ریلا بہہ نکلتا۔ آنسو پونچھ کر وہ آنسو پیتا ہوا باہر نکل آتا اور گرفت میں آئے مبہم و بے ربط الفاظ کو چُن چُن کر وہ جملے بناتا، اُنھیں معنی پہناتا پھر ہونٹوں کی جنبش سے اُنھیں میچ کرانے لگتا۔

اُس رات اُس کی ہتھیلی کو گرفت میں لے کر اُس نے پوچھا تھا، ''بے نظیر! تم یہی کہنا چاہتی ہو نہ کہ تم میری ساتویں پسلی نہیں ہو؟''

اُس کے چہرے پر مسرّت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اُس نے جلدی جلدی دو بار ہتھیلی دَبا کر آنکھیں موند لی تھی۔

اُس کا ذہن مفلوج ہو گیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا اور دَھم سے بینچ پر جا بیٹھا تھا۔

تیسرے پہر ایک نرس نے اُسے جگا کر کہا تھا، ''آپ میرے ساتھ چلیں۔''

وہ اُسے ڈاکٹر مریم کے چیمبر میں چھوڑ کر نکل گئی تھی۔ ڈاکٹر ایک رپورٹ کا بغور معائینہ کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ رپورٹ کو پرے رکھ کر بولی، ''میں آپ کو آف دَ رکارڈ یہ جانکاری دے رہی ہوں کہ آپ کی وائف نے سوسائڈل اِسٹیپ لیا ہے۔ اُس نے ٹانکا توڑ کر خون بہا دیا۔ شی اِز نو مور۔''

شجاع الدین چیخ پڑا، ''نہیں!......''

ہوائی جہاز کے عملے ہائی الرٹ پوزیشن میں آ گئے۔ سوتے اونگھتے ہم سفر گھبرا کر اُسے وحشت زدہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ اِیر ہوسٹس نے جلدی سے پانی کا بوتل کھول کر اُسے پکڑا دیا۔ وہ حسینہ بھی اُسے مشکوک نگاہوں سے گھورنے لگی۔

شرمسار شجاع الدین کا دل کچوٹنے لگا۔ وہ کفِ افسوس ملنے لگا کہ اُسے ابا کو یہ بات بتا دینی چاہئے تھی کہ بے نظیر اور عاشق علی کا عشق مثالی ہے اور وہ بھی رقیب نہیں۔

شجاع الدین نے گھڑی دیکھ کر اندازہ لگایا کہ آدھا سفر باقی ہے۔ ●

(مشاق احمد نوری نے اِسے پڑھ کر 'زبان و ادب' پٹنہ، جلد۔۱۸، شمارہ۔۱۰، اکتوبر ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شائع کیا۔)

تحفہ

وہ اِس طرح کھا رہا تھا جیسے ماں، بچے کو کھِلاتے ہوئے خود بھی کھاتی ہے۔ اچانک ایک خوبصورت تتلی کمرے میں داخل ہوئی اور چکّر لگا کر ٹیوب لائٹ کے نزدیک جا بیٹھی۔ پھر وہ دھیرے دھیرے پنکھ کھولنے بند کرنے لگی۔ ٹیوب لائٹ کی پھٹّی میں دُبکی چھپکلی دَبے پاؤں تتلی کی جانب بڑھنے لگی۔ اُس کا وار خالی گیا۔ اُس کی گرفت میں آیا پنکھ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا، جِسے کھا کر اُس نے زبان سے منہ صاف کرلیا۔ اِس بار تتلی دوری بنا کر بیٹھی۔ چھپکلی سُرعت سے اُس کے بہت قریب پہنچ کر ٹھہری گئی۔ پھر وہ چیتے کی طرح فاصلے کو کم کرنے لگی۔ روشندان میں بنائے گھونسلے میں چوزے رہ رہ کر ''چیں، چیں'' کررہے تھے۔ اچانک گوریا اُڑی اور چونچ میں تتلی دَبائے گھونسلے میں لوٹ گئی۔ چوزے فاتح ماں کا ''چوں، چوں'' کر کے استقبال کرنے لگے۔ وہ پھر اُڑی اور دیوار کے ایک کونے سے جا ٹکرائی۔ اِس بار وہ چونچ میں مکڑی دَبائے گھونسلے میں لوٹی۔ لیکن اُس کے تن سے ایک نرم پنکھ جدا ہوگیا تھا، جو اَکمن کے پھاہے کی طرح اُڑتا ہوا قورمے کے پیالے میں گرنے ہی والا تھا کہ میں نے پھونک ماردی۔

میری پھونک پر وہ خیالوں کی وادی سے لوٹ آیا۔ خفت مٹانے کے لئے اُس نے تندوری چکن کا ایک بڑا سا ٹکڑا میری پلیٹ میں رکھ کر سلاد کی طشتری میری جانب کھسکا دی۔ پھر وہ مٹی کی پیالی میں جمائی فرنی کو اُٹھا کر شہادت کی اُنگلی سے کھانے لگا۔

ڈائننگ ٹیبل پر فرنی کی خالی پیالی رکھ کر وہ اُٹھ گیا، تب ساتھ کھانے کا لطف جاتا رہا۔ مجھے ہوٹل کا کھانا، ہوٹل میں ہی اچھا لگتا ہے۔ مُفلِسا ڈیرہ بے غلاف تکیے سا بے رونق

ہوتا ہے، جہاں ہمہ وقت مہیب سناٹا کُہرے کی طرح چھایا رہتا ہے۔ اچانک مجھے امّی کی کہی باتیں یاد آ گئیں، ''قسمت والے کو ہی بیوی شریف، محبتی، سلیقہ مند اور مہمان نواز ملتی ہے، جو مکان کو گھر بنا دیتی ہے۔ گھر سجا سنورا رہتا ہے، جسے بچے اور مہمان گلزار بناتے ہیں۔ شوہر کا مان بڑھانے کے لئے وہ ضیافت کو یادگار بنا دیتی ہے۔

فرنی کھاتے ہوئے میں نے سوچا کہ شادی بیاہ میں فرنی کی جگہ آئس کریم اور ماقوتی نے لے لی ہے۔ بعض مسلم ہوٹلوں نے ہی فرنی اور کھیر کے چلن کو جاری رکھا ہے۔ میں بھی جلدی سے فرنی کھا کر ڈائننگ ٹیبل سے اُٹھ گیا۔

وہ ڈائننگ ہال میں ہی چہل قدمی کر کے صوفے پر میرے پہلو میں آ بیٹھا اور سگریٹ پیش کر کے لائیٹر کی لو میرے سامنے کر دی۔ اُس نے دو لمبے کش لگا کر سُرخ حصّے کو بغور دیکھا۔ نہ جانے وہ کس خیال کے زیرِ اثر اُٹھا، سامنے والی کھڑکی تک گیا اور نیم وا پردے کو پرے کر دیا۔ اندر گھس آئیں بیلوں کو اُس نے سلاخوں سے باہر کر کے ڈور کو ایک جھٹکے سے کھینچ دیا۔ پردے کے دونوں سرے بچھڑے دوست کی طرح ہم آغوش ہو گئے۔ دو اُنگلیوں کے درمیان دَبا دھواں کی منحنی لکیر بناتا سگریٹ کا مُردہ حصّہ سیلابی کٹاؤ کی زد میں آئے مٹّی کے تودے کی طرح ڈھیہ گیا، تب اُس نے سُرخ حصّے کو دیکھا اور ایک لمبا کش لگا کر دھوئیں کے چھلّے بناتا ہوا میرے قریب آیا۔ پھر کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ بولا، ''یار! کوئی نہیں جانتا۔ اُسے بھی معلوم نہیں کہ پونم کی اُس رات کے واقعے کا میں تنہا چشم دید گواہ ہوں......''

اُس نے ایشٹرے میں سگریٹ کی گردن مڑور دی۔ میں نے بھی جلدی جلدی دو تین کش لگا کر سگریٹ کو بجھاتے ہوئے کہا، ''اب میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''ابھی آیا۔'' یہ کہہ کر وہ خواب گاہ میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوٹ کر ڈائننگ ٹیبل سے جوٹھے برتنوں کو بیرے کی طرح سمیٹنے لگا۔ جب وہ برتنوں کو لے کر کچن میں گیا، تب میں بھی نقرئی ڈبّوں اور پولی بیگ کو لیتا ہوا کچن میں رکھے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ کچن کی حالت ابتر تھی۔ چینی اور پتّی کے ڈبّے اَدھ کھلے پڑے تھے۔ ٹی پورٹ پر رکھے چائے چھنّے میں پڑی پتّی خشک ہو چکی تھی اور سنک میں پہلے کے بھی جوٹھے برتن پڑے تھے۔ مجھے کوفت ہونے لگی، تب میں لوٹ آیا۔

وہ کچن سے لوٹ کر سیدھے کھڑکی تک گیا اور پردے کی ڈور کھینچ دی۔ بیلیں پھر اندر آگئیں۔ چاند کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ آسمان پر ستاروں کی حکمرانی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ خلا کو تا دیر گھورتا رہا۔

پھر وہ تھوڑی دیر بعد میرے پہلو میں آبیٹھا اور میری ران پر ڈھول جما کر بولا،

''یار! بعض دوشیزائیں بڑی چالاک ہوتی ہیں، جب کہ بیشتر معصوم و نادان۔ یہ واقعہ اُس وقت کا ہے، جب کھوجی پترکاروں میں میرے نام کی دھوم تھی۔ میں بھی جاسوسوں کی طرح حصولِ مقصد میں لگا رہتا تھا۔

اُس رات جے پی چوک پر میرے علاوہ سبھی مسافر اُتر گئے، تب آٹو رکشا والے نے آگے چلنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ گیارہ بج رہا تھا۔ دوسری سواری ملنے کی اُمید کم تھی۔ تقریباً ایک کیلومیٹر کا فاصلہ بچا تھا۔ میں پیدل ہی گھر لوٹ رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک موہوم انسانی ہیولا نظر آیا جو اُمبیڈکر لین سے نکل کر تیز قدموں سے سڑک پار کر کے نو آباد علاقے کی جانب جا رہا تھا۔ پھر دس پندرہ گز کا محتاط فاصلہ بنائے دوسرا سایہ اُس کا تعاقب کرتا ہوا مجھے نظر آیا۔ میری جاسوسی رگ پھڑک اُٹھی تھی۔

اُسی راستے میں آگے چل کر ایک بہت پرانا تالاب ہے۔ تقریباً دس پندرہ سال قبل ملازمت پیشہ چند بنگالیوں نے دانش مندی سے کالی باڑی سوسائٹی قائم کر کے تالاب سے مُتصل زمین کا ایک بڑا حصہ کوڑی کے بھاؤ خرید لیا تھا۔ سوسائٹی نے رہائشی مکان کی تعمیر کے ساتھ تالاب کنارے ایک عالی شان کالی مندر کی تعمیر بھی کروائی تھی۔ مندر سے تقریباً ہزار میٹر کے فاصلے پر وقف کردہ ایک وسیع قبرستان ہے، جو کھجور کے پیڑوں کی کثرت کے سبب کھجور بنا قبرستان کہلاتا ہے۔ تمام پیڑوں میں نیم کے چھتنار درخت کی حیثیت ممتاز ہے۔ اِسی کے نیچے نمازِ جنازہ ادا کی جاتی ہے۔ جب بنگالیوں نے کالونی بسالی، تب مسلمان متحریک ہوئے اور اُنھوں نے بھی قبرستان سے کچھ دور ہٹ کر آزاد نگر کالونی بسائی اور......''

تاریخی وجغرافیائی تفصیل سے اُکتا کر میں اچانک اُٹھ کھڑا ہوا، تب وہ خاموش ہو گیا۔ پھر قدرے توقف کے بعد اُس نے پوچھا، ''بس ہو گیا؟ نہیں سنو گے؟''

''یار! مجھے کالی مندر اور کھجور بنا قبرستان سے کیا لینا دینا۔ میری دلچسپی کا مرکز فقط

وہ حسینہ ہے، جس کا واقعہ سننے میں آیا ہوں۔"

"دراصل میں تمھیں بتانا چاہتا تھا کہ بنگالی دوراندیش، متحد اور مادری زبان کے محافظ ہوتے ہیں۔ مشہور کالی کنسر سنستھان، کالی آئی کیئر سینٹر اور بنگال ٹائیگر اخبار اُسی مندر کی آمدنی اور ٹیلنٹ ڈونیشن سے چل رہے ہیں۔ دوسری طرف بیشتر متولّی وقف کی جائداد کو باہوبلیوں سے اَونے پونے بیچ دیتے یا پھر ڈولپمنٹ کے نام پر بااثر اور رسوخ دار افراد تجارت کرنے لگتے ہیں۔ سروے کرو تو معلوم ہوگا کہ مسلمان اور ہندو دونوں مل جل کر قبضہ جمائے بے شرمی سے اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔ شہر میں جتنے موٹر گیراج ہیں اُن میں بیشتر وقف کی زمین پر چل رہے ہیں۔ قاضی سرائے چوک کی جامع مسجد کے کٹڑے کا کرایہ آج بھی دس روپیہ ہے۔ سنّی اور شیعہ وقف بورڈ کے حکّام نے ذاتی مفاد میں آمدنی بڑھانے اور روزگار فراہم کرنے کے نام پر حصار بندی کے ساتھ ساتھ مارکیٹ بنا کر قبرستانوں کی شناخت ہی ختم کردی ہے......"

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا، "ہر شخص کو اپنے کرتوت کی سزا ملتی ہے۔ یہاں نہیں، تو وہاں ملے گی۔ یار! اب تم جلدی سے واقعے کو مکمل کرو۔"

"ہاں! میں کیا کہہ رہا تھا؟" اُس نے خود کلامی کی۔

وہ سُنائی باتوں کو ازسرِ نو سُنانا شروع نہ کردے، اِسی خوف سے میں نے کہا، "کالی مندر اور کھجور بنا قبرستان کی تفصیل تم سُنا چکے ہو۔ میں بتاتا ہوں۔ ایک انسانی ہیولا کو سڑک پار کرتے ہوئے اور دوسرے کو اُس کا تعاقب کرتے ہوئے تم نے دیکھا تھا۔ اِس کے بعد کیا ہوا، یہ بتاؤ۔"

وہ جھلّا کر بولا، "ٹھیک ہے جب تمھیں فرصت ہوگی، تب میں سناؤں گا۔"

میں نے فوراً التجا کی، "نہیں یار! آج ہی سنادو۔ آدھی اَدھوری باتیں ٹنشن پیدا کرتی ہیں۔ مجھے نیند نہیں آئے گی۔ ہاں! وہ سایہ اور اُس کا تعاقب کرنے والا کہاں گیا؟" میں نے سرا پکڑایا۔

"دونوں آبادی سے دور، آزادنگر کے ایک زیرِ تعمیر مکان میں گھسے تھے۔"

"اُس کے بعد کیا ہوا؟" میں نے بے تابانہ پوچھا۔

''وہ سب کچھ، جو وہم وگمان سے پرے تھا......''

''یعنی؟'' میری نگاہیں اُس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

''پہلے سائے نے سیاہ چادر اُتار کر فرش پر رکھا۔ چاندنی رات میں وہ تراشیدہ ہیرے کی طرح دَمکنے لگی تھی۔ اُس کی سانسیں ناہموار تھیں۔''

''اور دوسرا کون تھا؟'' تجسس مجھ سے دو قدم آگے آگے چل رہا تھا۔

''وہ ایک خوب رو گٹھیلا نوجوان تھا۔ اُس نے اپنی چادر بچھا کر کہا تھا، آؤ! یہاں بیٹھ جاؤ۔''

وہ اُس کے قریب جا بیٹھی، تب وہ پانی کا بوتل اُسے پیش کرتے ہوئے بولا،

''تھوڑا سا پی لو۔''

اُس نے گھونٹ گھونٹ پانی پی کر پوچھا، ''کسی نے اِدھر آتے ہوئے ہمیں دیکھا تو نہیں؟''

''نہیں۔'' اُس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''اگر کسی کی نظر پڑ جاتی تو؟ تم نے اِس وقت یہاں ملنے کی بچکانہ ضد کی ہے......''

وہ قطع کلام کرتے ہوئے تنک کر بولا، ''کیوں نہ کرتا؟''

''مسٹر پریمی! پریم تیاگ اور بلیدان مانگتا ہے۔'' وہ اُس کی ناک پکڑ کے ہلاتے ہوئے بولی۔

''لیکن میں آئیڈیل لَور نہیں۔'' اُس کا لہجہ سخت تھا۔

''کیا تم مجھ سے سچا پریم نہیں کرتے؟'' اُس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''کرتا ہوں، لیکن......'' وہ نظریں چرانے لگا۔

''لیکن کیا؟'' اُس نے تشویشناک لہجے میں پوچھا۔

''تمھارے خوب صورت جسم کو میں کسی اور کے حوالے نہیں کر سکتا۔''

''ہم لوگوں نے تو ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔'' وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

''تمھارا بھائی پریم شترو ہے۔'' اُس کا آکروش چہرے پر نمودار ہو گیا تھا۔

''صرف اُن کا قصور نہیں۔ تمھارے گھر والے بھی تو راضی نہیں۔ یار! سماج ہمیشہ

دھرم، جات پات اور امیری غریبی کی دیوار کھڑی کرتا رہا ہے اور عاشقوں نے بھی بلیدان دیا ہے۔ ہم بھی کیوں نہ اِسے بھاگیہ کا لکھا سویکار کر لیں......"

اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا تھا، "کیوں سویکار کر لیں؟ میں اُن پریمیوں میں نہیں، جو پریم کا دان کرتے......"

"سمجھتے کیوں نہیں؟ مجبوری ہے۔" اُس نے گال تھپتھپا کر اُسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"تم سمجھتی ہو کہ میں براتیوں کا سواگت ستکار کروں گا؟ دولھے راجا کو سینے سے لگا کر مبارکباد پیش کروں گا؟" اُس کا لہجہ تُرش اور استہزائیہ تھا۔

لڑکی کچھ دیر تک خاموش رہی۔ پھر اُس نے اچانک پوچھا، "اچھا بتاؤ! تمھیں میرا کون سا انگ پسند ہے؟"

"رسیلے ہونٹ......" اُس نے مسکرا کر کہا۔

"لو، چوم لو۔"

"بولتی آنکھیں......"

"لو، اِنھیں بھی چوم لو۔"

"گالوں کے ڈمپل، کانوں میں ڈولتی بالیاں، صراحی دار گردن......اور......اور یہ۔" اُس نے سوئیٹ ہوم میں شوکیس کے سامنے کھڑے حریص بچے کی طرح چھو کر بتایا۔

"آج سب کو جی بھر کے چوم لو۔" اُس نے گریبان کے بٹن کھول دیئے۔

پھر چاہت کی بوندا باندی، بارش میں تبدیل ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چاند کو دیکھتے ہوئے بولی، "آج میں پہلی اور آخری بار تمھاری ہر خواہش پوری کر دوں گی۔ جی بھر کے مجھے دیکھ لو، جتنا چاہو چوم لو......اور......اور چاہو تو......"

پھر وہ فرش پر لیٹ گئی۔ نوجوان بھی اُس کی بغل میں لیٹ گیا۔ دونوں کا سر ایک دوسرے کی بانھوں پر تھا۔ ہوا دَبے پاؤں چل رہی تھی۔ فضا پُر سکوت تھی۔ جھینگر دَم بخود، چاند ہکا بکا اور خوفزدہ سا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فلسفیانہ لہجے میں بولی، "اِن لمحوں کو پریم پھل سمجھنا کہ اب میں اُس شخص کی بیوی بن جاؤں گی اور تم میرے لئے پرایے پُرش ہو جاؤ گے......"

وہ حسن کے سحر کا شکار ہو چکا تھا۔ اُس کی اُنگلیاں خوش فعلیوں میں مگن تھیں اور اِس کا جسم بے قابو ہو کر گوندھے ہوئے آٹے کی طرح ڈھیلا اور نرم پڑنے لگا تھا۔ وقت، مٹھی سے ریت کی طرح پھسلا جا رہا تھا۔

طویل خاموشی سے اُکتا کر وہ بولی، ''جوالا اُگل کر دھرتی بھی شانت ہو جاتی ہے۔ جانو! زخم چاہے جتنا گہرا ہو، وقت کا مرہم اُسے بھر دیتا ہے۔ آج نہیں تو کل تم بھی اپنا گھر بسا ہی لوگے اور ہمارا پریم اَتیت کا حصّہ بن کر موسم کی طرح دستک دیتا رہے گا......''

اچانک ایک ٹٹہری ٹِٹکار لگاتی ہوئی ہمارے اوپر سے گزر گئی تھی۔ وہ سہم کر اُس کے سینے میں سما گئی، تب وہ اُس کے لب و رخسار پر بوسے ثبت کر کے بولا تھا، ''لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ نہ میں پَر پُرش کہلاؤں گا اور نہ تم کسی کی بیوی بن پاؤ گی......'' اُس کا لہجہ اُس کے عزم و ارادے کا غمّاز تھا۔

پھر وہ بھوکے شیر کی طرح منہ مارنے لگا تھا۔

عجلت پسندی اور مشینی عمل سے اُوب کر وہ خاموشی توڑتے ہوئے بولی، ''دیکھو نہ! چاند ہمیں ایک ٹک دیکھ رہا ہے...... مجھے شرم آ رہی ہے......''

''اب ہمیں کسی کی پرواہ نہیں......'' اُس کا لہجہ سفاک تھا۔

سانجھ سے پہلے کشتی کو گھاٹ لگانے والے مانجھی کی طرح وہ مسلسل چپّو چلا رہا تھا۔

''اور تم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے؟'' میرا لہجہ سخت ناگوار تھا۔

''نہیں یار! میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں، لیکن......''

''لیکن کیا؟'' میں نے فوراً پوچھا۔

''یار! کانوں سے سب کچھ دِکھائی دے رہا تھا۔ کیف و سرور سے لبریز سِسکیوں کو تال دیتی اُس کے بوسوں کی آواز، مجھے بھی مشتعل کرنے لگی تھی۔'' اُس نے اقبالی ملزم کی طرح سچ قبول لیا۔

وہ خاموش رہا، تب میں نے پوچھا، ''فارغ ہو کر دونوں چلے گئے ہوں گے؟''

میرے استفسار پر وہ ماضی سے لوٹتے ہوئے بولا، ''نہیں! جب وہ کپڑے درست کر کے واپسی کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی، تب اُس نے ہاتھ پکڑ کے اُسے بیٹھا لیا تھا۔

میں نے بھی آنکھیں کھول دی تھیں۔ مجھے لڑکی کے چہرے پر خفت و شرمساری اور نوجوان کی آنکھوں میں بگولے اُڑتے نظر آئے تھے۔''

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے بے تابانہ پوچھا۔

وہ نوجوان کے رخسار کو دونوں ہتھیلیوں سے پکڑ کے ہونٹ اور پیشانی پر طویل بوسے ثبت کر کے بولی، ''جب کبھی دیکھنے اور باتیں کرنے کی خواہش ہو گی، تب ہم چودھویں کے چاند میں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے ہوئے باتیں کریں گے۔ یہ ہمارا دوست اور ہمارے پریم اور مِلن کا ساکچھی بھی ہے۔''

''لیکن اب ایسا موقع نہیں آئے گا......''

پھر اُس نے خوفناک قہقہے لگا کر جیب سے کاغذ اور قلم نکال کر اُسے دیتے ہوئے کہا، ''میں نے پہلے ہی دستخط کر دیا ہے، اب تم بھی کر دو......''

''یہ کیا ہے؟'' اُس نے مشکوک نگاہوں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''مائی ڈیر! یہ جوائنٹ کمپوزڈ سوسائیڈل نوٹ ہے۔'' اُس کا لہجہ بے حد سفاک تھا۔

اُس نے موبائل ٹارچ جلا دیا۔ سوسائیڈل نوٹ پڑھ کر وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ اُسے پس و پیش میں گرفتار دیکھ کر اُس نے ریوالور اُس کی کنپٹی سے سٹا کر کہا، ''یاد نہیں؟ تم نے ہی کہا تھا، جئیں گے ساتھ، مریں گے ساتھ۔ بے وفا! شادی کی خوشی میں اپنا ہی کیا وعدہ بھول گئی؟ لیکن مجھے یاد ہے......''

اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا، ''یہ ریوالور کہاں سے لائے؟''

''پریم شترو، تمھارے انسپکٹر بھائی کا ہے......'' وہ بے فکری سے بولا۔

وہ تڑپ کر بولی، ''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ یار! یہ سَروس ریوالور ہے۔''

''کیوں اُسے سزا نہیں ملنی چاہیے؟ اُسی کے کارن آج یہ نوبت آئی ہے۔''

لڑکی نے چپّی سادھ لی تھی۔ لڑکے کی نگاہیں دنگائی کی طرح اُس کے چہرے پر مرکوز تھیں اور وہ اُس کے چہرے پر عیاں خوف و دہشت سے محظوظ ہو رہا تھا۔

قدرے توقف کے بعد وہ بولی، ''اچھا چلو! ہمارے بعد جو ہو گا اِس سے ہمیں کیا لینا دینا۔ شریر نے شریر کا بھوگ لگا ہی لیا ہے۔ کوئی چاہ کر بھی آتما کو جدا نہیں کر پائے گا۔

یار! مشکل یہ ہے کہ میں تمھیں نہ گولی مار سکتی اور نہ تڑپتا ہوا دیکھ سکتی ہوں۔ تمھیں مردہ دیکھ کر اگر میں موت سے ڈر گئی، تب میں جیتے جی مر جاؤں گی، خود کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گی۔ تمھاری دیوانگی نے میری آنکھیں کھول دیں۔ یہ لو مٹی، بھر دو میری مانگ، میں سہاگن مرنا چاہتی ہوں۔ ریوالور سٹا کر مجھے گولی مارنا تا کہ کوئی بچا نہ پائے۔ ہم مر کر اَمر پریمی کہلائیں گے۔ ریوالور رکھ کر ٹھیک سے روشنی دِکھاؤ کہ دستخط کروں۔" اُس کا لہجہ بے حد جذباتی تھا۔

اُس نے جیسے ہی ریوالور زمین پر رکھا، وہ اُسے اُٹھا کر اُس کی پیشانی سے سٹا کے بولی، "پاگل پریمی! تم سچ مچ مرنا چاہتے ہو؟، تو مرو۔ لیکن میں جینا چاہتی ہوں......"

میں نے گھبرا کر پوچھا، "پھر کیا ہوا؟ اُس نے گولی ماردی؟"

"ہاں۔"

"اور تم نے اُسے بچانے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ تمھاری نگاہ میں یہ واردات ایک بڑی خبر تھی۔ یار! لوک تنتر کے چوتھے کھمبے میں دیمک لگ گئی ہے اور اب تو انصاف کے لئے عدلیہ کو بھی عوام سے فریاد کرنی پڑ رہی ہے۔"

"میرا منشا ہرگز یہ نہیں تھا۔ وہ لڑکی بڑی چالاک اور شاطر تھی۔ اُس نے گفتگو میں وقت ضائع نہیں کیا۔ اُس نے فوراً اُسے پیشتر ریوالور کو پیشانی سے سٹا کر گولی ماردی تھی۔"

"اور تم اُسے گھر تک چھوڑنے گئے ہو گے؟" میرا لہجہ تُرش اور طنزیہ تھا۔

"نہیں، گولی مار کر وہ بدحواس ہو گئی تھی۔ ریوالور، سوسائیڈل نوٹ اور اُس کا موبائل لے کر وہ بھاگتی ہوئی نکل گئی، تب میں نے اُس کی نبض دیکھی تھی۔ وہ مر چکا تھا اور اُس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ لیکن میں نے اُنھیں بند نہیں کیا۔"

"کیوں؟" میرا لہجہ پُر تجسس تھا۔

"کیونکہ وہ چاند پر ٹکٹکی جمائے تھیں۔ قلم اور پانی کے بوتل کو میں اُٹھا لایا تھا کہ اُس پر اُس کی اُنگلیوں کے بھی نشانات ثبت ہو گئے ہوں گے۔"

میں نے تمسخرانہ لہجے میں پوچھا، "اخبار میں اُس کی خودکشی کی خبر چھپی ہو گی؟"

"نہیں! نامعلوم شخص کے خلاف قتل کا ایف آئی آر درج کیا گیا تھا۔"

"قاتل کی شناخت ہوئی؟" میں نے فوراً پوچھا۔

''پوسٹ مارٹم رپورٹ نے بھید کھول دی تھی۔ پولیس آج بھی قاتل حسینہ کی تلاش میں ہے۔''

اُس نے چپّی سادھ لی اور میں درودیوار کو دیکھنے لگا۔ کمرے میں خاموشی کی دُھند دبیز ہونے لگی، تب وہ اُٹھ کر کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا اور میں کھڑکی کی سلاخوں کو پکڑ کے روشن وکم ضوستاروں کو دیکھنے لگا۔ تجسس کھولتے دودھ کی طرح بار بار اُبال کھانے لگا، تب میں نے ملتجی لہجے میں پوچھا، ''یار! صرف یہ بتادو کہ تمھیں وہ لڑکی پھر کبھی نظر آئی؟''

''ہاں! اِس واقعے کے تقریباً تین سال بعد میں نے اُسے ایک وجیہ نوجوان کے ساتھ بڑلا نیشنل مال میں دیکھا تھا۔ نوجوان کی گود میں ایک پیارا سا بچہ ہمک رہا تھا اور وہ ایک خاص ادا سے ایک ہی کپ سے بچے اور نوجوان کو آئس کریم کھلاتے ہوئے خود بھی کھا رہی تھی۔''

وہ میرے قریب چلا آیا اور سلاخوں کو پکڑ کے آسمان دیکھنے لگا۔ مجھے لگا کہ وہ دوسرے گواہ کو تلاش کر رہا ہے۔

اچانک وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا، ''بچہ خوش ہو کر تالیاں بجاتا، کبھی ماں کی زلفیں نوچتا اور کبھی نوجوان کے رخسار پر اچانک تھپڑ جڑ دیتا تھا۔ وہ تھپڑ کھا کر نہال ہو جاتا اور اُس کے دست و رخسار کے بوسے لینے لگتا تھا۔''

قدرے توقف کے بعد اُس نے اَفسردہ لہجے میں کہا، ''بے چارہ! کوّے کی طرح کسی اور کے بچے کو اپنا ہی سمجھ کر پال رہا ہے۔''

میں نے مضطرب ہو کر پوچھا، ''تم اتنے یقین سے کیسے کہہ رہے ہو؟''

''یار! بچہ اُس کے عاشق کا ہم شکل ہے۔ قاتل حسینہ نے شوہر کو خوبصورت تحفہ پیش کیا ہے۔''

یہ کہہ کے وہ مُڑا اور ڈبّے سے سگریٹ نکال کے ہونٹوں سے لگا کر اُسے سلگانے لگا۔

●

(ماہنامہ 'سب رس'، حیدر آباد، جلد۔ ۷۸، شمارہ۔ ۸، اگست ۲۰۱۶ء، اور دو ماہی 'گلبن'، لکھنؤ، جلد۔ ۳۰، شمارہ۔ ۴۰، جنوری۔ اپریل ۲۰۱۷ء میں شائع۔)

تھو، تھو

شوہر کے انتقال کے بعد صوفیہ بیگم کی بولتی آنکھیں، مصنوعی دیدے جیسی خشک و بے رونق ہو گئیں۔ ہونٹوں پر تالے لگ گئے اور اُن کی چپّی شام کے دُھندلکے کی طرح گہری ہونے لگی۔ وہ اپنے کمرے میں محصور ہو کر بستر سے چپک سی گئیں۔ پلنگ پر بیٹھی، نیم دراز یا پھر آنکھوں پر بازوں رکھے وہ زیادہ تر سوئی رہتیں۔

اُن کا کھانا بیٹے سے لگوا کر نازیہ بے فکر ہو جاتی۔

گڈّو پلنگ پر کھانا لگا کر کہتا، ''دادی! کھانا کھالو، ممّی بولی ہے۔''

صوفیہ بیگم نیم وا آنکھوں سے پوتے کو دیکھنے لگتیں، تب وہ حسبِ ہدایت پوچھتا، ''دادی! کچھ اور لینا ہے؟'' پھر وہ اجازت مانگتا، ''اب جاؤں؟''

وہ فوراً اثبات میں سر گھما دیتیں۔ گڈّو دوڑتا ہوا کمرے سے نکل بھاگتا، تب وہ اُٹھ کر کھانا میز پر رکھ کے بستر پر لوٹ آتیں۔

حسینہ بوا برتن اُٹھانے آتی، تب وہ ایک دو لقمہ کھا لینے کے لئے اُن سے خوب رگو گرواتی۔ منّت کو بے اثر ہوتے دیکھ کر وہ ملول ہو جاتی۔ پھر وہ پلیٹ اُٹھا کر، سر جھکائے کمرے سے نکل جاتی۔

تدفین کے دوسرے دن کلکتے سے رضیہ بیگم شوہر کے ساتھ آئیں۔

رضیہ بیگم نے کچھ ہی دیر بعد بہو سے کہا، ''دُلہن! تمھیں کچھ خبر بھی ہے؟ باجی نے دانا پانی چھوڑ رکھا ہے۔''

''لیکن میں تو اُن کا ناشتہ کھانا وقت پر لگوادیتی ہوں۔اب اگر وہ......''

وہ قطع کلام کرتے ہوئے بولیں، ''مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔تم بیٹے سے کھانا لگوادیتی ہو اور حسینہ بوا اُسے اُٹھا کر لے آتی ہے۔''

''خالہ! آپ تو جانتی ہیں! بہت ضدّی ہیں۔ بیٹے کی بات بھی نہیں مانتیں۔ دیکھ رہی ہیں نہ؟ سب کا کھانا پینا حرام کر رہی ہیں۔اب آپ ہی کوئی اُپائے سوجھائیے کہ اُن کی چپّی ٹوٹے اور وہ کھانا پینا شروع کر دیں۔'' نازیہ کا لہجہ شکایتی اور التجائی بھی تھا۔

''دُلہن! مول سے سود پیارا ہوتا ہے۔ایسا کرو، جیسا میں کہتی ہوں۔ گڈّو کو سِکھا پڑھا کر کھانا لے کے بھیجو، پھر دیکھ لینا! باجی تنکے کی طرح ٹوٹ جائیں گی۔'' اُنھوں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

اِس بار گڈّو کھانا لگا کر بولا، ''دادی! کھانا کھالو نہ، مجھے بہوت بھوک لگی ہے۔ آپ جب تک نہیں کھاؤ گی ممّی مجھے کھانے کو نہیں دیں گی۔آپ نہیں کھا رہی ہو نہ، اِسی لئے چھوٹی دادی اور پاپا بھی بھوکے ہیں۔''

صوفیہ بیگم بے قرار ہو کر اُٹھ بیٹھیں۔اُن کا دل کچوٹنے لگا۔ وہ خود کلامی کرنے لگیں، ''جنّتی! مجھے تنہا، بے سہارا چھوڑ کر چل دیئے! خود تو سب کچھ سے آزاد ہو گئے۔''

پھر وہ آہیں بھر کے زیرِ لب بولیں، ''سوچا تھا کہ تمھارے کھندھے پر چڑھ کے دنیا سے رخصت ہوؤں گی......زندوں کو غذا اور غم کھانا اور آنسو پینا ہی پڑتا ہے......''

''دادی! مجھے بہوت بھوک لگی ہے۔ سچّی! جلدی سے کھاؤ نہ۔'' گڈّو اُکتا کر بولا۔

پوتے کی فریاد پر وہ چونکیں۔ پھر وہ ایک نوالہ اُس کے منہ میں ڈال کر دوسرا لقمہ بھاری من سے منہ میں رکھ کے بولیں، ''جاؤ! پاپا کے ساتھ تم بھی کھالو۔ممّی سے کہنا، کلکتے والی دادی اور دادا کے لئے آملیٹ بھی بنادے۔''

''دادی نے کھانا کھالیا۔'' کی صدائیں بلند کرتا ہوا گڈّو کمرے سے دوڑتا ہوا نکلا اور رضیہ بیگم سے جا ٹکرایا۔

وہ پردے کی اوٹ میں کھڑی بہن کو دیکھ سن رہی تھیں۔ وہ جلدی سے نم آنکھوں کو خشک کر کے بلند آواز میں بولیں۔ ''دُلہن! میں باجی کے کمرے میں جا رہی ہوں۔ میرا ناشتہ

بھی اِسی کمرے میں بھجوا دو۔''

صوفیہ بیگم جلدی سے جگہ بناتی ہوئی بولیں، ''اِسی میں کھاؤنہ۔''

اِس ایک جملے نے رضیہ بیگم کو بچپن میں لا کھڑا کیا۔ پھر وہ ماضی کی سیر کرنے لگیں۔ باجی اُسے اپنے ساتھ کھلاتی پلاتی اور ساتھ ہی سلاتی تھیں۔ وہ لقمے بنا کر پہلے اُس کے منہ میں ڈالتیں، پھر اپنے منہ میں۔ اللہ جانے اُنھیں کیسے پتا چل جاتا تھا کہ وہ کب پانی پینا چاہتی تھی اور کب اُس کا پیٹ بھر جاتا تھا۔ وہ اُسے نہلا دُھلا کر لباس پہناتیں۔ پھر زلفیں سنوار کے چوٹی کو رنگین رِبن سے کس کے باندھتی تھیں۔ ایک بار وہ درد سے بلبلا اُٹھی تھی، تب وہ بولی تھیں، ''رووٴ مت! میں جتنا کس کر باندھوں گی اتنی ہی تیزی سے زلفیں بڑھیں گی۔''

بچپن نے درِ دوشیزگی پر دستک نہیں دی تھی۔ پھر بھی اُس کی زلف رسا کمر تک جا پہنچی تھی، تب اُس کا دل مچلنے لگا تھا کہ موٹی موٹی دو چوٹیاں بنوا کر وہ پڑھنے جایا کرے۔ اُس نے کئی بار باجی سے ٹھنک ٹھنک کر التجا کی تھی، لیکن وہ اَن سنا کر کے ایک ہی چوٹی بناتیں۔

آخر ایک دن اُس نے پوچھ ہی لیا تھا، ''باجی! تم مانگ نہیں نکالتی اور ہمیشہ ایک ہی چوٹی کیوں بناتی ہو؟''

''ابھی تم سمجھ نہیں پاؤ گی۔'' اُنھوں نے مختصر سا جواب دیا تھا۔

''میں سمجھ پاؤں گی باجی!......تم کو میری قسم بتاؤ نہ!'' اُبلتے دودھ کی طرح اُبھان مارتے تجسس کو وہ فی الفور مطمئن کرنا چاہتی تھی۔

''بات بات پر قسم کھانا اور قسم دے کر کسی کو مجبور کرنا اچھی بات نہیں رضو!'' وہ بھڑک کے بولی تھیں۔

''جاؤ! مت بتاؤ! غلطی سے ہی سہی، لیکن میری جان کی بازی تو لگ ہی چکی ہے نہ۔'' اُس نے چالاکی سے چہرے پر اَفسردگی کا نقاب ڈال لیا تھا۔

باجی نرم پڑ گئی تھیں۔ پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولیں، ''عورت کی دراز زلفیں اور نمایاں چھاتیاں مردوں کا مرکزِ نگاہ بن جاتی ہیں۔ اِسی لئے اِنھیں ڈھک چھپا کر رکھنے کا شرعی حکم ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ حاسدوں کی نگاہِ بد کا شکار ہو کر زلفیں تیزی سے جھڑنے لگتی ہیں۔''

صوفیہ بیگم لقمے کو بہن کے ہونٹوں سے سٹا کر بولیں، ''رضو! منہ کھولو نہ! کہاں کھو گئی؟''

وہ جھینپتے ہوئے بولیں، ''باجی! بچپن کھڑا مسکرانے لگا تھا۔ اللہ! کتنے دنوں بعد ہم ساتھ کھا پی رہے ہیں۔''

پھر وہ لقمے کو چبا کر بولیں، ''باجی! لڑکی دھان کے بچڑے (پودے) سا ہوتی ہے۔ لگائی کہیں اور، بوئی کہیں اور جاتی......''

وہ قطع کلام کرتے ہوئے بولیں، ''رضو! اگر بچڑے کو اُسی کھیت میں چھوڑ دیا جائے، تب وہ بالشت بھر رہ جائیں گے اور ٹھیک سے پھول پھل بھی نہیں پائیں گے۔ لڑکی کو بھی اِسی لئے رخصت کیا جاتا ہے کہ وہ اپنا گھر سنسار بسائے اور دودھوں نہائیں پوتوں پھلے۔''

گفتگو، ساون کی بارش سی، اَفسردگی اور ذہنی عذاب کو بہا کر لے گئی۔

باتیں کرتے ہوئے دونوں ناشتہ کر رہی تھیں کہ گڈو رضیہ بیگم کا ناشتہ لے آیا، تب صوفیہ بیگم نے پوتے کے منہ میں پھر ایک بڑا سا لقمہ ڈال کر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں، ''جاؤ! پاپا اور دادا کے ساتھ تم بھی کھالو۔''

صوفیہ بیگم تادیر لقمے کو چباتیں پھر اُسے پانی کے سہارے حلق کے نیچے اُتار لیتیں۔ دو چار لقمے کھا کر اُنھوں نے ہاتھ روک لیا تھا۔ پھر وہ آملیٹ، کبھی روٹی اور کبھی سبزی پلیٹ میں رکھ کے بہن کو اور کھانے لئے مجبور کرنے لگیں۔ جب اُنھوں نے بہن کا ہاتھ پکڑ لیا، تب وہ بولیں، ''لاؤ! اب میں تمھیں کوا، مینا اور بلی کا حصہ بنا کر کھلاتی ہوں۔''

''باجی! اب میں نانی پوتے والی ہو گئی ہوں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولیں۔

صوفیہ بیگم ٹھڈی پکڑ کے شفقت بھرے لہجے میں بولیں، ''رضو! بڑوں کی نظروں میں بچے کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔''

خونی رشتے آڑے وقت پر شریانوں میں اُنس ومحبت کی لہریں دوڑا کر بھرپور توانائی پیدا کر دیتے ہیں۔ گھر میں قدم رکھتے ہی رضیہ بیگم نے بہن کی چپّی اور بھوک ہڑتال ختم کرادی۔

صوفیہ بیگم کا سر چکرّانے لگا، تب وہ نحیف مریضہ کی طرح بستر پکڑ کے لیٹ گئیں۔ رضیہ بیگم ہلکے ہاتھوں سے بہن کے بالوں میں تیل ملانے لگیں۔

اُس دن کے بعد پھر کبھی کسی کو کچھ کہنے سننے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ دونوں بہنیں ایک ساتھ کھانے پینے لگیں۔

شاذیہ کا شوہر عاطف کینیڈا میں ڈاکٹر ہے۔ اُس نے چھوٹے بھائی سے کہا تھا کہ وہ بھابھی اور بچوں کو ساتھ لے کر جائے اور ساتھ ہی لیتا چلا آئے۔ اُسے فرصت نہیں تھی۔ اِسی سبب بیٹی حیدر آباد سے نہیں آسکی۔

چالیسواں کی تقریب میں رضیہ بیگم شوہر کے ساتھ پھر آئیں۔ بچوں کا امتحان چل رہا تھا۔ بہو بیٹے، بچوں کا کیریر خراب کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اُماں نے بیٹے کے وعدے کو سچ مان لیا تھا کہ وہ امتحان ختم ہوتے ہی خالہ سے ملنے بال بچوں کے ساتھ جائے گا۔ بزرگ ہمیشہ سے ہی نے بند مٹھی کا بھرم قائم رکھتے رہے ہیں۔

ایک دن دوپہر میں کھا پی کر دونوں بہنیں لیٹی تھیں۔ صوفیہ بیگم کروٹ لے کر بولیں، ''رضو! اللہ نے سوگ منانے کی مدّت تین دن اور بیوی کے لئے چار ماہ دس دن مقرر کی ہے۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ باقی ماندہ عمر بے سہارا، غمزدہ اور تنہا کبوتری سی ملول رہتی ہوگی۔''

''ہاں باجی! یہ سچ ہے۔ اللہ بڑھاپے میں ایک سے دوسرے کو جدا نہ کرے۔ مجھے تو ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی ہے کہ اگر میں مرگئی، تب اِن کی تابعداری کون کرے گا؟ میں ہوں کہ پکے کھانے سے کاڑھ کر اِنھیں وقت پر کھلا پلا دیتی ہوں۔ اُتر ن پتر ن دھوتی اور بی پی، شوگر کی دوا کھانے کے لئے سر پر سوار رہتی ہوں۔ چائے پانی کی فرمائش پوری کرتی اور کبھی کبھار کوئی اِن سے ملنے جلنے چلا آتا ہے، تب کسی طرح گھر کی عزّت بھی بچا لیتی ہوں۔''

پھر وہ قدرے توقف کے بعد افسردہ لہجے میں بولیں، ''بیٹے، بہو اور پوتی پوتے کا زیادہ تر وقت، موبائل پر چونچ مارتے کٹتا ہے...... باجی! اِس موبائل نے تو رشتے کو کمرے کی دیوار و در سا بنا دیا ہے۔ رہیں ساتھ ساتھ اور الگ الگ بھی......''

صوفیہ بیگم قطع کلام کرتے ہوئے بولیں، ''رضو! مرد سوئی سا اور عورت دھاگے سی ہوتی ہے، جو کنبے کو جوڑتی رہتی ہے، لیکن ایک کے بغیر دوسرا از خود ناکارہ ہو جاتا ہے۔ ایک بات اور ہے، بڑھاپے میں میاں بیوی کی محبت، تپ تپا کر کندن سا ہو جاتی ہے۔''

پھر وہ بیٹھ کے آنچل پھیلا کر دعائیں مانگنے لگیں، ''یا اللہ! محتاجی کی زندگی نہ

دینا۔ مولیٰ! مرتے دم تک ہاتھ پاؤں چلتا رہے۔"

اچانک ضبط کا باندھ ٹوٹ گیا اور اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ریلا بہہ نکلا۔ رضیہ بیگم آنچل سے بہن کے آنسو خشک کرتے ہوئے بولیں، "باجی! آنسو بچا کر رکھو! نوشے بھائی کی یادیں تا عمر رُلاتی رہیں گی۔ اللہ اُن کی مغفرت فرمائے اور اُنھیں جنّت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین! ثم آمین!"

اچانک ماحول غمناک اور فضا سوگوار ہو گئی۔ خاموشی، تھوڑی دیر تک شکم سیر آبی پرندے کی طرح بازو پھیلائے رہی۔

صوفیہ بیگم قدرے توقف کے بعد بولیں، "رضو! آج میں تم سے دل کی بات کہتی ہوں۔ مجھے تو یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ میں نے اُن کی اور اُن کے علم وادب کی قدر نہیں کی، اُن کی محبت کو سمجھ نہیں پائی، بچوں کی ناز برداریوں میں لگی رہی اور ساتھ کھانا سونا بھی ترک کر دیا تھا۔"

"باجی! میں نے کھانا بنانا کھلانا اور ساتھ کھانا سونا ترک نہیں کیا۔ جوانی سے اچھا بڑھاپے کا ساتھ سونا ہے۔ ایک دوسرے کا دکھ، سکھ سن کے اور بانٹ کر جینا اچھا لگتا ہے......"

اُسی وقت گڈّو موبائل فون لئے دوڑتا ہوا آیا اور اُسے دادی کو پکڑاتے ہوئے بولا، "دادی! پھوپھی کا فون ہے۔"

شاذیہ سڑک جام میں پھنسی ہوئی تھی۔ ماں بیٹی کی گفتگو طویل تر ہونے لگی، تب رضیہ بیگم آہستہ سے اُٹھ کر شوہر کا حال چال لینے کمرے سے نکل گئیں۔

چالیسواں کے دن غم کی رِدا میں لپٹی صوفیہ بیگم بستر پر پڑی تھیں۔ نور محمد ماں کے کمرے کو آراستہ کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ منّت وسماجت کر کے اور خالہ سے کہلوا کر اُس نے ماں کو غسل کرنے کے لئے راضی کر ہی لیا تھا۔ وہ غسل کرنے کے لئے چلی گئیں، تب اُس نے حسینہ بوا اور شاذیہ سے اپنی نگرانی میں جلدی جلدی کمرے کی صفائی کروائی، پلنگ پر نئی اُجلی چادر بچھوائی، تکیے کا غلاف، دروازے اور کھڑکیوں کے پردے بدلوائے اور میز کو صاف ستھرا کروا کے دروازے پر پاؤں پوچھ رکھوایا۔

وہ جانتا ہے کہ عورتیں امّی سے ملنے اِسی کمرے میں آئیں گی۔ کمرے کی ابتر حالت دیکھ کر اُنھیں چہ می گوئیوں کا موقع مل جائے گا۔ بیشتر عورتیں پُرسہ دینے کے بہانے گھریلو

معاملات کی ٹوہ لیتی اور حقیر باتوں کو بھی غیر معمولی اہمیت دے کر ذلیل کرنے لگتی ہیں۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی صوفیہ بیگم ٹھٹھک گئیں۔ اُنھوں نے جلدی سے دروازہ بند کیا۔ پھر نئی چادر کو اُٹھا کے تہہ کیا اور تکیے سے غلاف اُتار کر اُسے چادر کی تہہ میں ڈالتے ہوئے نظریں دوڑائیں۔ چُھپا کر رکھی گئی چادر، غلاف اور پردے مل گئے۔ تلاشِ بسیار کے بعد شوہر کی اُترنیں بھی مل گئیں۔ پھر چند منٹوں میں ہی سبھی اپنی اپنی جگہ پر نظر آنے لگے۔ آخر میں اُنھوں نے اُترنوں کو تھوڑی دیر تک سینے سے لگا کر ہر ایک کو تقریباً اُسی انداز سے پھینکا، جس طرح مرحوم کپڑے تبدیل کرتے وقت پھینکا کرتے تھے۔ کمرے کی صورت حسبِ سابق ہوگئی۔

بند کمرے پر نظر پڑتے نور محمد مضطرب ہوگیا۔ ''امّی جان! امّی جان!'' پُکارتے ہوئے وہ بے تابانہ دروازے پر دستک دینے لگا۔ گھر کے سبھی افراد یکجا ہوگئے۔ امّی! امّی پُکارتی شاذیہ آہٹ نہ پا کر زور زور سے رونے لگی۔ ماں کو روتے دیکھ کر گود میں سہمی بیٹی بھی رونے لگی۔ رضیہ بیگم قسم پر قسم دینے لگیں۔ خالو ابّا اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا واسطہ دینے لگے۔ برتن مانجھتی حسینہ بوا بھی دوڑ کر آ کھڑی ہوئی۔ گُم صُم کھڑے گڈو کو ٹہوکے لگا کر نور محمد بولا، ''بیٹا! تم بھی دادی! دادی پُکارو نہ۔''

تھوڑی دیر کے بعد کھٹکے کھلنے کی آواز ملی۔ دروازہ کھلتے ہی سبھی بے تابانہ کمرے میں جا گھسے۔ صوفیہ بیگم گُم صُم کھڑی تھیں۔ اُنھیں صحیح سلامت دیکھ کر نور محمد اُن سے لپٹ کر سِسکتے ہوئے بولا، ''امّی! امّی...... نہیں! نہیں! آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں......''

صوفیہ بیگم سینے سے لگے اکلوتے بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگیں۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

نور محمد کے ہوش ٹھکانے ہوئے، تب اُس نے متحیّر لہجے میں پوچھا، ''یہ کیا امّی؟ آپ نے پھر سے میلی داغدار چادر بچھا دی۔ غلاف اور پردے بھی بدل ڈالے۔ امّی! آپ سے ملنے عورتیں اِسی کمرے میں آئیں گی۔ اِسی لئے میں نے کمرہ صاف ستھرا کروایا ہے۔''

گُم صُم کھڑی صوفیہ بیگم پلنگ پر جا بیٹھیں اور چادر کے داغ دھبّوں پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ پھر وہ تکیے کو سینے سے لگا کر لیٹ گئیں۔

نور محمد کو یہ سمجھتے دیر نہیں لگی کہ ذرا سا داغ لگ جانے پر آسمان سر پر اُٹھا لینے والی

امّی نے ابا کے لگائے داغ دھبّوں سے ایک جذباتی رشتہ جوڑ لیا ہے اور اب وہ ابا کے تکیے کو سینے سے لگا کر اُن کالمس محسوس کر رہی ہیں۔

نور محمد کا اشارہ پا کر سبھی کمرے سے نکل گئے، تب وہ ماں کے پہلو میں بیٹھ کر اُن کے گیلے بالوں میں اُنگلیاں ڈال کے دھیرے دھیرے پنجہ چلاتے ہوئے سوچنے لگا کہ ظاہری طور پر ابا سے بیزار رہنے والی امّی در حقیقت ابا کی عاشق نکلیں۔

نور محمد کے ذہن میں ماضی تاک جھانک کرنے لگا۔ اُسے پے در پے باتیں یاد آنے لگیں۔ امّی جتنی صفائی پسند ہیں، ابا اتنے ہی صفائی کے تئیں لاپروا تھے۔ رفع حاجت کے بعد بائیں ہتھیلی میں صابن پھسلاتے ہوئے، پانی گراتے رہنے کو امّی، صرف ایک بار کی صفائی مانتی ہیں۔ اُن کا ماننا ہے کہ خوب اچھی طرح تین بار دھونے سے ہی پاکی آتی ہے۔ وہ چاہتی تھیں کہ ابا بھی اُن ہی کی طرح ہاتھ پاؤں کو تین تین بار پوری صفائی سے دھویا کریں۔ لیکن ابا کی یہ دلیل تھی کہ جب وہ ایک ہاتھ کا استعمال کرتے ہیں، تب دونوں ہاتھوں کو تین تین بار دھونا احمق پن ہے اور پاؤں کا دھونا تو سراسر حماقت۔ گندگی کو صاف کیا جاسکتا ہے، لیکن ذہن سے ناپاکی کے احساس کو نکالنا مشکل ہے۔

امّی اپنے استعمال کے لئے تین رنگوں کی چھوٹی چھوٹی صابن کی ٹکیہ رکھتی ہیں، جن سے وہ باری باری ہاتھ دھوتیں۔ اُنھوں نے حسینہ بوا کے لئے بھی صابن کی ٹکیہ الگ کر رکھی ہے، جس سے وہ ہر کام کے پہلے اور بعد میں تین بار ہاتھوں کو رگڑ رگڑ کر دُھلواتی ہیں۔ حسینہ بوا بھی کام کرنا چھوڑ نہ دے اِسی لئے ابا نظریں بچا کر اُنھیں ہر ماہ بخشش دیتے تھے۔ ابا کے لئے بھی امّی نے الگ صابن اور الگ الگ تولیہ لٹکا رکھا تھا۔ غسل کے لئے، ہاتھ منہ پوچھنے اور کھانا کھا کر روغن دار ہاتھ صاف کرنے کے لئے تولیے مختص تھے۔ پھر بھی ابا ہر کام اُلٹا سیدھا کرتے اور ٹوکنے پر بھڑک اُٹھتے تھے۔ اُن کی یہ دلیل تھی کہ ہر تولیہ صفائی کے لئے ہے، تب اِس میں تخصیص کیوں؟ ضرورت کے وقت جو مل جائے وہی کار آمد۔

ابا کا کوئی کپڑا پان کی پیک کے داغوں سے مبرّا نہیں رہتا۔ ایک بار امّی اُنھیں سمجھاتے ہوئے بولی تھیں، ”منہ میں پیک ہو تو اُسے پھینک کر ہی بات کیا کیجئے نہ۔“

اُنھوں نے اُلٹا سوال جڑ دیا تھا، ”کیا مجھے تھک تھکی کی بیماری ہے، جو تھوک تھوک

کرباتیں کیا کروں؟''

وہ قدرے توقف کے بعد بولے تھے، ''جواب طلب امور پر تو منہ کھولنا ہی پڑے گا بیگم! تمھاری طرح چُپّی سادھ کر میں ہر بلا ٹال نہیں سکتا۔''

''سچ پوچھیے تو بچے اور بوڑھے پر بے داغ کپڑے پھبتے نہیں۔'' وہ مسکرا کر بولے تھے۔

امّی کا تمتماتا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ جلدی سے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔

ابا کی ایک مستقل عادت سے امّی ہمیشہ نالاں اور بیزار رہا کرتی تھیں۔ وہ گوشت کھا کر ٹہلتے ہوئے خلال سے دانتوں میں پھنسے ریشوں کو نکالتے اور تھو، تھو کی آواز کے ساتھ اُنھیں کہیں بھی ٹھکانے لگانے لگتے تھے۔ خلال لیتے ہی امّی چوکنّی ہو کر اپنے کمرے کی نگرانی میں لگ جاتیں۔ ابا بے خیالی میں جب بھی کمرے کا رُخ کرتے، تب وہ بڑی پھرتی سے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہتیں، میں یہاں ہوں، مجھ سے کچھ کام ہے؟ اُنھیں اِس بات کا خدشہ پیدا ہو جاتا تھا کہ چینوٹیاں ریشوں کو گھسیٹتے ہوئے بستر پر بھی چڑھ سکتی ہیں۔ اگر وہ پھینکے گئے ریشوں کو تلاش نہیں کر پائیں گی، تب اُنھیں پورے کمرے کی صفائی کروانی ہوگی۔ اگر شُبہ نے ذہن میں جڑ جمالیا، تب اُنھیں چادر اور تکیہ کے غلاف کو بھی بدلنا پڑ جائے گا۔

جوتا پہننے اور اُتارنے کے بعد تو امی سر پر سوار ہو کر ابا سے دونوں ہاتھ دُھلوا کر ہی دَم لیتیں کہ کہیں بے خیالی میں وہ اُن کا جسم چھو نہ دیں۔

امّی لاکھ تاکید کرتیں۔ لیکن ابا مرتے دَم تک بنیان کو بکرے کی کھال کی طرح اُتار کر اُسے کبھی سیدھا نہیں کرتے اور اُترن کو متعینہ مقام پر نہیں رکھتے تھے۔ ایک دن امّی نے کہا تھا کہ اِس طرح تو پھوہڑ لڑکیاں کسی تقریب میں شرکت سے قبل لباس تبدیل کرتے وقت عجلت میں اُترن کا پہاڑ بنا دیتی ہیں۔

جوتے کے اُوپر گر پڑی بنیان کو اُٹھا کر پہن لینے اور استعمال شدہ رومال اور پیسوں کو جیب سے نکال کر بستر پر رکھ دینے سے امّی بھڑک اُٹھتیں۔ اُن کی ناراضگی پر ابا ہمیشہ یہی کہتے تھے، ''ٹھیک ہے! اب ایسا نہیں کروں گا۔ کہو تو مرغا بن جاؤں؟''

بے بس امّی غصیلا چہرہ جلدی سے پھیر لیا کرتیں۔

گزشتہ عید کے دن نیا جوڑا دیتے ہوئے امّی نے کہا تھا، ''اللہ کے واسطے کم سے کم

اِسے ہفتہ دس دن بھی داغ دھبّوں سے پاک رکھےگا۔"

وہ مُسکرا کر بولے تھے، "بیگم! کردار تو داغ دھبّوں سے پاک ہے نہ۔"

عید کا دن تھا۔ اِسی لئے وہ ہنس کر بولیں، "وہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔"

ابا کے داغ آلود کپڑوں کی صفائی کے لئے امّی طرح طرح کی حکمت لگاتیں اور کپڑا دھوتے وقت ضدّی داغوں پر خوب غصّے اُتارتیں۔ ایک دن ابا نے کہا تھا، "دھوبی کا حق کیوں مارتی ہو۔ داغ دھبّے کو تم کچھ زیادہ ہی اہمیت دیتی ہو۔"

"میں پیسے بچانے کے لئے کپڑے نہیں دھوتی۔ دھوبیوں کو گندے پانی سے کپڑے دھوتے اور اُنھیں گندی جگہوں پر سکھاتے ہوئے بھی میں نے دیکھا ہے۔" امّی نے فوراً جواز پیش کیا تھا۔

اچانک گڈّو دوڑتا ہوا آیا اور بولا، "پاپا! مّمی آپ کو کھوج رہی ہے...... کب سے۔"

نور محمد نے ماں کو ایک نظر دیکھا، جو سوگئی تھیں۔ پھر وہ بیٹے کا ہاتھ پکڑ کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

صوفیہ بیگم کا کمرہ عورتوں اور بچوں سے بھرا تھا۔ عزیز و اقارب چالیسواں کا کھانا کھا کر اُنھیں سلام کرنے آجا رہے تھے۔ دانت میں پھنسے ریشوں سے بے کل گڈّو روتا ہوا دادی کے کمرے میں گیا۔ صوفیہ بیگم جلدی سے اُٹھ کر دروازے کے باہر آویزاں مٹھے سے ایک پتلا سا نیم کا خلال نکال لائیں۔ پھر وہ پوتے کو بستر پر بٹھا کر اُس کے دانتوں میں پھنسے گوشت کے ریشوں کو زبان پر ڈھکیلتے ہوئے بولیں، "تھوکو!"

گڈو ریشوں کو زبان پر رکھے رہا، تب اُنھوں نے کہا، "جس طرح دادا تھوکا کرتے تھے، اُسی طرح تھوکو نہ، "تھو، تھو......" اُنھوں نے تھو، تھو کر کے اُسے دِکھایا۔

گڈّو، دادا کی طرح ہی ریشوں کو "تھو، تھو" کی آوازیں نکالتا ہوا بستر پر ہی تھوکنے لگا۔

صوفیہ بیگم خود پر حیران تھیں کہ آج اُنھیں غصّہ کیوں نہیں آرہا ہے؟

●

(سہ ماہی مژگاں، کولکاتا، 'بہار کا معاصر ادب نمبر'، جلد۔ دوم، شمارہ۔ ۵۵، ۵۶، ۵۷، جولائی، اگست اور ستمبر ۲۰۱۸ء میں شائع۔)

داغ

بلبیر سنگھ صبح ڈھابے کے لئے اُس وقت نکلتا، جب سورج اپنی منزل سے ایک پڑاؤ پیچھے ہوتا۔ بستر چھوڑتے ہی منجیت کور کو پنکھ لگ جاتے۔ وہ دوپٹے کا استعمال نہیں کرتی۔ اُسے پانی، صابن، منجن اور تولیہ دینے میں سہولت ہوتی ہے۔ بلبیر سنگھ جب اچھے موڈ میں ہوتا ہے، تب وہ چپکے چپکے اُسے نہارتا اور آنکھوں سے اُس کے لبھاؤنے انگوں کو ٹٹولنے، سہلانے لگتا ہے۔ پھر وہ بھی دانستہ لاپرواسی ہو جاتی ہے۔ یہ گُر اُس نے ماں سے سیکھا ہے۔

ایک صبح جب وہ شوہر کو رخصت کر کے کمر سیدھی کرنے لگی، تب اُس کے ذہن میں بچپن کی ایک شرارت رقص کر گئی۔ وہ جاڑے کا موسم تھا۔ اُس رات پڑھتے پڑھتے جب وہ ماں کے کمرے میں جا کھڑی ہوئی تھی، تب اُنھوں نے خشمگیں نظروں سے اُسے گھورتے ہوئے تُرش لہجے میں کہا تھا، ''منجو! تیرا من پڑھنے لکھنے میں نہیں لگتا۔ جب دیکھو سر پر سوار رہتی ہے۔ جلدی سے بتا، کس کام سے آئی ہے؟''

''اب میں سو جاؤں، یہی پوچھنے آئی تھی ماں۔'' اُس نے سفید جھوٹ بولا تھا۔

پلکوں کی چلمن کے اُس پار اُسے ماں کا غصہ بھرا چہرہ نظر آیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ وہ ماحول کا جائزہ لینے آئی ہے۔ وہ قدرے توقف کے بعد بولی تھیں، ''چل! پہلے دودھ پی لے...... پھر سو جانا۔''

چل، بول کر وہ اُس کے ٹسکنے کا انتظار کرنے لگیں اور بابو جی داڑھی کھجلانے لگے تھے۔ دونوں پیٹھ کے پیچھے تکیہ لگائے رضائی میں گھسے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ اُس

نے مسکان دبا کر سوچا تھا کہ بچپن کی سوچ عجیب ہوتی ہے۔ وہ اُس دن خوش گپیوں میں خلل ڈال کر خوش ہوئی تھی۔ دراصل وہ یہ چاہتی تھی کہ بابو جی ہنس ہنس کر اُس سے باتیں کریں۔ ماں گھریلو کاموں میں لگی رہے اور تھوڑی دیر پر ہمیں کچھ کچھ کھانے پینے کو دیتی رہے......

بابو جی سے ماں خوب گپ شپ کرتی اور طرح طرح کے پکوان بنا کر اُنھیں کھِلاتی رہتی ہے۔ بابو جی چاؤ سے کھاتے ہوئے تعریفیں کرتے اور ماں نہال ہو کر جبراً اُنھیں اور لینے پر مجبور کرتی رہتی۔

اچانک اُس کے ذہن میں رخصتی کے وقت دی گئی ماں کی نصیحتیں یاد آ گئیں۔ ماں نے اُس سے کہا تھا، ''منجو! اب تو سیانی ہو گئی ہے۔ بچپن کی اَبودھ باتیں اب تیری سمجھ میں خود بخود آ جائیں گی۔ لڑکی وہی اچھی، جو سسرال والوں کے ساتھ سگے سمبندھیوں کا بھی دل جیت کر اپنا گھر بسا لے۔ وہ نہیں، جو بات بات پر روٹھ کر میکے چلی آئے۔ گھر بسانا آسان نہیں۔ بہت سی باتوں کو من مار کے کرنا اور سہنا پڑتا ہے یعنی تنی رسی پر ننگے پاؤں توازن بنائے آگے بڑھتے رہنا ہے۔''

پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولی تھیں، ''جو عورت مرد کی کمزوری بن جاتی ہے، اُس کا خصم، اُس کے بغیر جل بن مچھلی کی طرح تڑپتا ہے۔ تڑپ اور کشش بنائے رکھنا، اُڑتی پتنگ کو قابو میں رکھ کر اُڑانے جیسا کٹھن ہے...... میٹھے بول، سَمر پن، وفاداری اور من پسند پکوان، مکڑی کے جالے جیسے کارگر ہتھیار ہیں۔ سدھایا خصم اَسیر جن سا حکم مانتا ہے اور جاب لگے بیل کی طرح اِدھر اُدھر منہ نہیں مارتا۔ منجو! تم نے دیکھا ہے، میں نے اِن کاموں کو بخوبی انجام دیا ہے۔ سنیوکت پریوار میں ہر دلعزیز ہونا آسان نہیں۔ رب کا شکر! تیرا پریوار چھوٹا ہے۔ ساس سُسر کی خدمت کر کے اپنے مرد کا دل جیت لینا۔''

عملی زندگی میں ماں کا نسخہ کارگر ثابت ہوا۔ اُس نے سوچا کہ شوہر محبّتی، اولاد لائق اور زندگی تو تو میں میں سے پاک ہو تو زندگی کشتی کی سیر جیسی پُر لطف ہوتی ہے۔

رات بلبیر سنگھ اچھے موڈ میں تھا۔ وہ ڈھابے سے تندوری چکن اور رابڑی لے کر آیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اُس نے دو اُنگلیوں کا چمچہ بنا کر منجو کو بڑے پیار سے رابڑی کھلائی۔ میٹھی چیز اور میٹھے بول کا عورت پر مثبت اثر پڑتا ہے۔ وہ محبت اور اپنائیت سے مسحور ہو گئی۔

صبح وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھ رہی تھی۔ اُسے معلوم ہے، بلبیر سنگھ تا دیر مسرور رہتا اور صبح فقرے بازی کرتا ہے۔ نئے نئے فقرے تراشنے میں اُسے مزہ ملتا ہے۔ صابن پانی رکھ کر وہ جانے لگی، تب اُس نے کہا، ''منجو! اب تو گدرا گئی ہے...... تیرے کولہوں کا کٹاؤ پہلے جیسا نہیں رہا......''

وہ قطع کلام کرتے ہوئے بولی، ''تیرا دَم خم بھی تو جواب دینے لگا ہے۔ دو سیڑھیاں چڑھتے دَم پھولنے لگتا ہے......''

بلبیر سنگھ قدرے جھینپتے ہوئے بولا، ''لیکن سیڑھیاں تو چڑھ ہی جاتا ہوں نہ......''

وہ تنک کر بولی، ''منہ نہ کھلواؤ، کئی بار لُڑھک پڑے ہو...... مردوں کی یہ خاصیت ہے کہ شیخی بگھارتے، شکست قبولتے نہیں اور ہار کر بھی جیت کا جشن مناتے ہیں۔''

وہ قہقہے لگا کر بولا، ''ارے، ارے تم تو سچ مچ خفا ہو گئی......''

''اتنی بھی نہیں کہ پٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دوں۔'' وہ بھی ہنستی ہوئی بولی۔

''منجو! تیرے دانت انار کے دانے ہیں اور یہ پَر تولتی کبوتریاں......''

''اب بس بھی کرو جی! بچے سن لیں گے۔'' وہ قطع کلام کرتے ہوئے بولی۔

''تیسرے پہر کی نیند گہری ہوتی ہے۔ عاشق اور چور اِسی کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔''

''کہیں آنکھیں بند اور کان جاگے ہوں، تب؟''

''عورت شنکاؤں میں ہی سمے گنوا دیتی ہے۔''

''اور مردوں کا بس چلے تو؟'' اُس نے دیدے مٹکا کر پوچھا۔

''منجو! ایک بات کہوں؟...... تیرا چہرہ، دیکھ چوم کر جاتا ہوں تو دن اچھے کٹتے اور منافع بھی بڑھ جاتا ہے۔''

''یہ تو سو بار کی سنی بات ہے جی!'' وہ مسرور ہو کر بولی۔

''لیکن ہے صدفی صد سچ۔''

بلبیر سنگھ نے منہ ہاتھ پونچھ کر باہنیں پھیلا دیں اور وہ اُن میں سما گئی۔

''سیّاں! تیری باہنیں سکون بخش اور باتیں اَمرت ورشا جیسی......''

بلبیر سنگھ نے چَٹ چَٹ دو بوسے جڑ کے کہا، ''تو بھی تو کبوتری جیسی وفادار ہے۔ داغدار چہرے کے باوجود مجھ پر جان چھڑکتی ہے۔''

وہ چہرے پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی، ''گہرے داغ تو داڑھی میں چھپ گئے، بس بھنوؤں کے اُوپر اور آنکھوں کے نیچے والے نظر آتے ہیں۔''

بلبیر سنگھ نے زیرِ لب کہا، ''اِنھیں نظر آنا بھی چاہیے......''

وہ پنجوں کے بل اُچک اُچک کر داغوں کا بوسہ لے کر بولی، ''لیکن تیری روح بے داغ اور جسم توانا ہے......''

وہ ہنستے ہوئے بانہہ میں چٹکی کاٹ کے بولا، ''لیکن ابھی ابھی تو......''

''وہ تو تیرے کہے کا بدلہ چکایا تھا۔''

پھر دونوں ہنستے ہوئے ہاتھ پکڑ کے گول گول چکّر کاٹنے لگے۔

بلبیر سنگھ حسبِ معمول تیار ہو کر سنگار دان کے پاس جا کھڑا ہوا اور پگڑی جما کر اُس نے داغوں کو چھو کر دیکھا۔ پھر وہ بوسے لے دے کر گھر سے خوشی خوشی نکل پڑا۔

بلبیر سنگھ صبحِ نسیم کا لطف لیتا ہوا ڈھابے جا رہا تھا کہ بیتے دن فلم کی طرح اُس کے ذہن میں رواں ہو گئے۔ پھر وہ ماضی کی وادی میں چہل قدمی کرنے لگا۔ اُسے ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ دسواں کلاس پاس کرتے بابو جی نے اپنے دوست کی اکلوتی بیٹی سے اُس کی شادی کرا دی تھی۔ اچانک اُس کی زندگی بدل گئی تھی۔ اُسے گل، گلستان نظر آنے لگا تھا۔ وہ رس گلّے کی طرح پریم رس میں ڈوبا رہنا چاہتا تھا۔ لیکن بابو جی اُسے جلیبی کی طرح شیرے سے فوراً نکالنے پر تُلے تھے۔

اُس دن کام دھندے شروع کرنے کو لے کر بابو جی سے کچھ زیادہ ہی بک جھک ہو گئی تھی۔ وہ بھی تاؤ میں آ کر گھر سے نکلا اور شہر کی جانب چل پڑا تھا۔ راہ چلتے ہوئے اُس نے سوچا تھا کہ ماں اور منجو کو لگے گا کہ وہ حسبِ معمول گھر لوٹ آئے گا اور بابو جی بے فکر ہوں گے کہ زن مُرید بیوی کو چھوڑ کر کہیں جا ہی نہیں سکتا۔

گرمی، بھوک، پیاس اور تھکان پر غصّہ غالب رہا۔ پیدل چلتے چلتے شام ڈھلے وہ ایک ڈھابے تک پہنچ پایا تھا۔ قطار بند کھڑے ٹرکوں کو دیکھ کر وہ نظریں بچا کر خصّی بکری لدے ٹرک میں جا بیٹھا تھا۔ بوَل و براز کی بدبو سے اُس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ ٹرک چلا، تب بدبو کمزور پڑی اور اُسے بھوک پیاس ستانے لگی تھی۔ پھر وہ بھوک مٹانے کی جگت میں لگ گیا تھا۔ ناف کے آس پاس لمس محسوس کرتے پاٹھی کمر جھکا دیتی اور خصّی اُچھل کر جگہ بدل

لیتا۔ لیکن بدبو کا بھبکا چھوڑتا بکرے نے اُسے سینگ مارنے کی کوشش کی تھی۔ ایک بکری اُچھلی نہیں۔ وہ ممیا کر رہ گئی تھی۔ اُس کے تھن میں دودھ بھرا تھا۔ اُس نے اُسے سونگھا تھا اور تھن میں منہ لگاتے وہ کُنمائی تھی۔ پھر وہ شفیق ماں سی بن گئی تھی۔

صبح آنکھ کھلی تو اُس نے جھانک کر دیکھا تھا۔ ڈھابے میں ڈرائیور، خلاصی کھا پی رہے تھے۔ وہ نظریں بچا کر اُترا تھا۔ کچھ ہی دوری پر ایک تالاب تھا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر جب وہ لوٹا، تب وہاں دوسرا ٹرک لگا تھا۔

ایک اُدھیڑ سکھ ڈھابے کی گدّی پر بیٹھا تھا۔ کھاتے پیتے لوگوں کو دیکھ کر بھوک پیاس بے قابو ہونے لگی تھی، تب اُسے خود پر غصہ آیا تھا کہ وہ گھر سے خالی ہاتھ کیوں نکلا تھا؟ شادی میں ملی انگوٹھی ہی پہن لیا ہوتا۔ مجبوراً وہ سائل کی طرح کھڑا موقعے کی تاک میں لگا تھا کہ سردار جی اُسے گھور کر دیکھنے لگا۔ اُس نے تھوک نگل کر اور ہمّت جٹا کے کہا تھا، ''سردار جی! بہت بھوک لگی ہے، پیسے نہیں ہیں۔ کھانے کے لئے کچھ بھی دے دو۔''

وہ گدّی سے کود کے تیزی سے کڑاہ تک گیا اور گرم تیل میں چھنوٹا ڈال کر نکالا۔ پھر اُس نے اُس کے چہرے پر چھینٹے اُڑا دیئے۔ وہ بلبلانے لگا تھا، تب وہ اُس کی گردن پکڑ کے چیخا، ''سردار! ہاتھ پاؤں سلامت ہے۔ پھر بھی بھیک مانگتا ہے؟''

وہ زمین پر تھوک کر اُسے حقارت سے دیکھتا رہا۔ پھر وہ بازو پکڑ کے اُسے گھسیٹتے ہوئے بولا تھا، ''اب چل میرے ساتھ۔''

وہ سائے کی طرح اُس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔ اُسے وہ ایک دوا کی دُکان پر لے گیا۔ دُکاندار نے فوری اقدام کے بعد مرہم اور دوائیں دیں۔ پھر وہ اُسے ساتھ لیتا ہوا ڈھابے پر آیا اور جوٹھے برتنوں کو دِکھاتے ہوئے بولا تھا، ''اب تو جوٹھے برتنوں کو اُٹھا کر مانجھ۔''

برتن مانجھ کر رکھ دیا، تب اُس نے کہا تھا، ''اب پانی چھڑک کر جھاڑو لگا۔ اُس کے بعد کھاٹوں کو ترتیب سے لگا دینا۔''

وہ جب کام نبٹا کر اگلے حکم کے لئے آ کھڑا ہوا، تب وہ اُسے اشارے سے اور قریب بُلا کر بولا تھا، ''مجھے دیکھ کر شرم آئی، لیکن سردار! تجھے ہاتھ پسارتے نہیں آئی...... اب جب کبھی تو بھیک مانگنے کے لئے سوچے گا، تب اِن زخموں کے داغوں میں ٹیس پیدا ہو گی اور آئینہ دیکھتے ہی تجھے پورا واقعہ یاد آ جائے گا۔ ایک بات گانٹھ میں باندھ لے، مرد، گھوڑے

اور بیل مرتے دَم تک ہمت نہیں ہارتے۔"

پھر اُس نے گلّے سے سات روپے نکال کر اُس کی ہتھیلی پر رکھ کر کہا تھا، "یہ آپ کی مزدوری ہے، شرِیمان! اب آپ جہاں سے جو جی میں آئے خرید کر کھایئے پیجئے۔"

بھوک پر سوزش غالب تھی۔ پھر بھی اُس کے منہ سے نکل گیا تھا، "پوری، سبزی۔"

اُس نے فوراً ہتھیلی سے پانچ روپے لے کر آواز دی، "سکھبیرے! صاحب کو ایک پلیٹ ناشتہ لگانا۔"

وہ کھڑا کھڑا ہی کھانے لگا تھا، تب اُس نے کھاٹ کی جانب اشارہ کر کے نرم لہجے میں کہا تھا، "کھاٹ پر بیٹھ کر آرام سے کھایئے صاحب! اب آپ میرے گراہک ہیں۔"

اُس نے پھر ہانک لگائی، "سکھبیرے! صاحب کو پانی لگانا۔"

جب وہ ناشتہ کر چکا، تب وہ اُس کے پاس آکر پوچھا تھا، "درد زیادہ تو نہیں ہو رہا؟"

"کوئی خاص نہیں......" اُس نے سفید جھوٹ بولا تھا۔

"اب دوا کھا لو۔ ہاں! کھالی پیٹ دوا مت کھانا...... ہفتہ دس دنوں میں زخم تو بھر جائیں گے، لیکن داغ رہ جائیں گے......"

واپسی سے قبل اُس نے سفاکی سے کہا تھا، "اِنھیں رہنا بھی چاہیے۔"

وہ کھاٹ پر پڑا سوزش برداشت کرتا رہا۔ اُس کی کل جمع پونجی دو روپے اور منزل نامعلوم تھی۔ سردار جی اپنے کاروبار میں لگا رہا۔ اُس نے اُس پر نہ توجہ دی اور نہ اپنی جانب سے اُسے ایک پیالی چائے پلائی۔ آکروش، اُسے گاؤں سے دور، بہت دور لے جانا چاہتا تھا۔ وہ رات کی تاریکی کا منتظر تھا کہ اُسے مفت سفر کرنا تھا۔

دوا نے اثر دِکھایا۔ نہ جانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی۔ نیند اُس وقت ٹوٹی جب سورج غروب ہو چکا تھا اور مچھروں نے مزاج پُرسی شروع کر دی تھی۔

وہ پھر ایک ٹرک میں جا بیٹھا تھا۔ رات پردہ پوش اور بُرے کام میں معاون ہوتی ہے۔

اِس واقعے نے اُس کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ اُس کے ہاتھ 'ماسٹر کی' لگ گئی تھی۔

پھر خود کو ثابت کرنے اور زندگی کو استحکام بخشنے کا جنون اُس کے سر پر سوار ہو گیا تھا۔ یہ جملہ "مرد، گھوڑے اور بیل مرتے دَم تک ہمت نہیں ہارتے۔" صدائے بازگشت کی طرح سنائی دیتا۔

اُس نے بابو جی کو خط لکھ کر آگاہ کر دیا تھا کہ وہ زندہ ہے اور خودکشی نہیں کرے

گا۔ لیکن وہ گھر اُسی وقت لوٹے گا، جب وہ کچھ بن جائے گا۔ خط کی پشت پر اُس نے ماں کو لکھا تھا کہ اُسے معلوم ہے، تمھیں دکھ پہنچا ہوگا۔ مرد، گھوڑے اور بیل مرتے دَم تک ہمت نہیں ہارتے۔ ماں! یہ بات گھر چھوڑنے کے بعد سمجھ میں آئی۔ منجو کا خیال رکھنا کہ وہ اُمید سے ہے۔ عورت کی ضروریات، عورت ہی بہتر جانتی ہے اور تم تو ایک شفیق ماں ہو۔ منجو کے لئے یہ گھڑی اَگنی پریکچھا اور میرے لئے اَگیات واس ہے۔

پھر وہ اپنی شیریں کو حاصل کرنے کے لئے فرہاد کی طرح کوہ کنی میں لگ گیا تھا۔ دو سال میں اتنے پیسے ہوگئے کہ اُس نے ایک ڈھابہ کھول لیا۔ بابا فرید گنج قصبے میں سڑک کنارے 'ڈھابہ نہیں، اپنا گھر' کا سائین بورڈ مرکزِ توجہ بن گیا۔ وہ گھر جیسا کھانا اور بہترین سہولیات فراہم کرنے لگا۔ ڈھابہ صاف صفائی، لذیز کھانے پینے کی تازہ چیزوں، ضروری سہولیات اور حسنِ اخلاق کے سبب چل نکلا۔ ہر وقت گاڑیاں لگی رہتیں۔ بیشتر ڈرائیور خلاصی ضروریات سے فارغ ہوتے، نہاتے، کپڑے دھوتے سکھاتے اور کھا کر جھپکی بھی لے لیتے۔

وہ بچپن کے اِس واقعے کو بھی فراموش نہیں کر پایا تھا۔ بابو جی بیساکھی میں سائیکل دِلانے کا وعدہ تیسری بار ٹالنے لگے، تب ماں نے کانوں سے بالی اُتار کر بابو جی کو دیتے ہوئے کہا تھا، ''آج ہی سائیکل خرید کر لے آؤ جی! بچے کی چھوٹی چھوٹی خواہشیں بچپن میں ہی پوری ہونی چاہئے۔ بڑا ہو کر تو کوئی بھی اپنی کمائی سے بڑی اور مہنگی خواہش پوری کر لے گا۔''

بابو جی کچھ دیر تک مٹھی میں بالیاں لئے کھڑے رہے۔ پھر وہ نکل گئے تھے۔ شام سے قبل وہ چمچماتی سائیکل پر سوار ہو کر گھر لوٹے اور اُسے آنگن میں اسٹینڈ پر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ دوڑ کر ماں کے گلے سے جا لپٹا تھا۔ ڈبڈبائی آنکھوں کو آنچل سے پوچھ کر ماں بمشکل یہ کہہ پائی تھی، ''اب اِسے لے کر باہر جا!......''

وہ جلدی سے سائیکل لے کر دوستوں کو دِکھانے نکل پڑا تھا۔ سائیکل چلاتے ہوئے اُس نے یہ طے کر لیا تھا کہ اپنی کمائی سے ماں کے لئے بڑی سی وزنی بالیاں خریدے گا۔ اُس کے دل میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ ماں اور باپ کی سوچ و عمل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

چار برسوں کے بعد وہ لدا پھدا گاؤں لوٹا تھا۔ گھریلو سامانوں کے علاوہ ماں کے لئے سونے کی وزنی بالیاں اور گرم چادر، منجو کے لئے کنڈل اور کپڑے، نادیدہ بچے کے لئے کپڑے کھلونے اور بابو جی کے لئے گرم چادر، ٹارچ اور ایک موبائل سیٹ وہ لے گیا تھا۔

بابوجی سے راستے میں ہی ملاقات ہوگئی تھی۔ وہ دیر تک اُسے سینے سے چپکائے اُس کی پیٹھ سہلاتے رہے، لیکن بولے کچھ بھی نہیں۔ ماں اُسے دیکھتے دوڑ پڑی تھی۔ پھر وہ اُس سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔ ماں کے رونے کی آواز سن کر منجو گود میں بچہ اُٹھائے ننگے پاؤں کمرے سے نکلی اور ٹھٹھک کر ایک ٹک اُسے دیکھنے لگی تھی۔ جب وہ ماں کو چُپ کرا کے اُنھیں پہلو میں لئے کھاٹ پر بیٹھ گیا، تب منجو بچے کو اُس کی گود میں رکھتے ہوئے ایک خاص ادا سے بولی تھی، ''اب آپ اپنی لاڈلی کو خود ہی سنبھالو جی!''

نہال ہو کر اُس نے منجو کے سراپے کا جائزہ لیا تھا۔ اُس کا جسم ڈمٹک اُمرود کی طرح لُبھانے لگا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دوستوں سے ملنے دلجیت کور کو لے کر باہر نکل گیا تھا۔ اُسے لگا تھا، پہلے عشق اور پہلے بوسے کی طرح پہلی اولاد کے لمس کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

وہ گاؤں میں ہفتہ دس دنوں تک رہا تھا۔ منجو اُگنی پریکچھا میں سپھل ہوئی ہے، یہ کہتے ہوئے ماں نے اُسے واپسی کے سفر میں ساتھ کر دیا تھا۔ بچے کی چاہت کو ماں دل کی آنکھوں سے دیکھ اور پڑھ لیتی ہے۔

وہ ہر ماہ متعینہ رقم بابوجی کو بھیج دیتا اور اکثر پریوار کے ساتھ دو چار دنوں کے لئے گھر جاتا۔ گاؤں میں بچوں کا من خوب لگتا۔ وہ ہم عمر بچوں کے ساتھ خوب اُدھم مچاتے۔ اُنھیں کھیلتے ہوئے دیکھ کر اُسے اپنا بچپن یاد آنے لگتا تھا۔ بچے طرح طرح کے کھیل سیکھ کر لوٹتے۔ منجو، ماں بابوجی کی خوب خدمت کرتی۔ گھر کو صاف ستھرا کر کے چمکا دیتی۔ منجو سے ماں گپیں لڑاتی اور بابوجی ملاقاتیوں سے بغیر پوچھے ہی کہتے، ''بلّو پریوار سنگ آیا ہوا ہے جی!''

بلبیر سنگھ کو دور سے ہی ڈھابے پر ایک مجمع نظر آیا۔ وہ ماضی سے حال میں لوٹ کر لپکتے ہوئے وہاں جا پہنچا۔ چارپائی پر بیٹھے بابا کے سامنے ناشتہ رکھا تھا اور وہ ایک ڈرائیور کا ہاتھ دیکھتے ہوئے بھوش وانی کر رہے تھے۔ لوگ اُن کی باتوں کو سن رہے تھے۔ بلبیر سنگھ بھی بھیڑ کا حصہ بن کر گفتگو سننے لگا۔ اُسے بابا کا چہرہ مُہرہ جانا پہچانا اور اندازِ گفتگو بھی سنا سنا سا لگا۔ وہ جاسوس کی طرح کڑیاں ملانے اور ذہن پر زور دینے لگا۔ جب اُس نے تصوّر میں صفاچٹ چہرے پر داڑھی اور سر پر جٹا لگا کر اُسے غور سے دیکھنے لگا، تب اُسے دائیں اَبرو کے اوپر مسّا بھی

نظر آ گیا۔ اُسے پہچانتے ہی اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا اُس کے روبرو بیٹھ کر بولا، ''شریمان! اب بھوش وانی کرنے لگے؟''

بابا گھبرا کر اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ بلبیر سنگھ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اُس کے وجود میں سمانے لگا۔ حملے سے قبل مرغے اِسی طرح مدِّ مقابل کا جائزہ لیتے ہیں۔ اچانک بلبیر سنگھ اُس کی گردن پکڑ کے اُسے ڈھکیلتے ہوئے کڑاہ تک لے گیا۔ پھر وہ پاس پڑے چھنوٹے کو گرم تیل میں ڈال کے چیخا، ''بنا دوں چہرے پر بدنما داغ؟''

بلبیر سنگھ کا اپنا درد اُبھر آیا، تب اُس نے چھنوٹے کو واپس رکھ دیا۔

معاملہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بابا کو راہِ فرار سوجھ نہیں رہا تھا۔ اچانک بلبیر سنگھ گرجا، ''شمشیرے! رسّی لیتا آ۔''

پھر اُس نے حکم صادر کیا، ''اب اِسے جکڑ کر باندھ دو۔ اوئے مہتاب! تو جلدی سے تھانیدار صاحب کو ساتھ لیتا آ۔''

شمشیر نے پہلے اُلگنی کے ایک کھمبے سے کھاٹ کو باندھا۔ پھر اُس نے بابا کو کھاٹ سے جکڑ دیا۔ مصلوب بابا اچانک عقیدت کی بجائے نمائشی شئے بن گیا۔ بھیڑ دیکھ کر اُس نے بھی احتجاج نہیں کیا۔ پوری جلیبی کوّے لے اُڑے اور پانی بھرا گلاس ٹھوکر کھا کر دور جا پڑا۔ بلبیر سنگھ پیٹھ پر ہاتھ باندھے ٹہلنے لگا۔ لوگ حیران تھے۔ اُس کے تمتماتے چہرے کو دیکھ کر کوئی ہمّت جٹا نہیں پا رہا تھا کہ پوچھے، ''آخر بات کیا ہے؟ یہ ہے کون؟ اِس کا قصور کیا ہے؟......''

ڈرائیور گاڑی کی رفتار کم کر کے جانکاری حاصل کرنا چاہتے۔ لیکن تشفی بخش جواب نہ ملنے پر وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ جاتے۔ نو وارد کسی سے پوچھتا، ''بات کیا ہے بھائی؟''

''پتا نہیں جی......'' سب کو ایک ہی جواب ملتا۔

مہتاب سنگھ جیپ سے کود کر اُترا اور بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھتے ہوئے بولا، ''چلو، ہٹو! راستہ چھوڑو۔ تھانیدار صاحب جی آ گئے۔''

تھانیدار اور بلبیر سنگھ کے لئے کُرسیاں اور سپاہیوں کے لئے بینچ لگا کر رکھے گئے تھے۔ دائرہ تنگ ہونے لگا، تب ایک سپاہی زمین پر لاٹھی سے نشان بنا کر حصار کو وسیع کر کے بولا، ''کھبر دار! کوئی اِس ریکھا کو پار نہیں کرے گا۔''

تھانیدار اُس پر ایک نظر ڈال کر بولے، ’’اچھا، چوری کا معاملہ ہے۔ چوری، بابا کے بھیس میں۔ سردار جی! اپنا بیان درج کرایئے۔ ابھی سسرال بھیجتا ہوں چور بابا کو۔‘‘

بلبیر سنگھ نے عاجزی سے کہا، ’’ذرا اِس کے چہرے کو غور سے دیکھا جائے حضور! کہیں داغ نظر آتا ہے؟‘‘

’’بے داگ ہے سرکار!‘‘ اُسی سپاہی نے جائزہ لے کر کہا۔

’’اب ذرا میرا چہرہ دیکھئے سپاہی جی۔‘‘ اُس نے پگڑی سرکا کر دِکھایا۔

’’ہم کو تو جلے کا داگ لگتا ہے سردار جی۔‘‘ وہ سوچ وچار کے بولا۔

’’بالکل صحیح، یہ تیل سے جلنے کا داغ ہے، کچھ داڑھیوں میں چھپ گئے ہیں۔ اِنھیں دیکھئے۔‘‘ اُس نے چھپے داغوں کو دِکھاتے ہوئے کہا۔

تھانیدار نے کہا، ’’آپ نے اِسے مارا پیٹا نہیں، صرف باندھ کر رکھا ہے۔ یہی کہنا چاہتے ہیں نہ؟‘‘

’’نہیں جی! میں اِس کے کالے کرتوت دِکھانا چاہتا ہوں۔‘‘

’’سردار جی! اپنا بیان درج کرایئے۔‘‘ تھانیدار کا لہجہ سپاٹ تھا۔

اُسی سپاہی نے ڈنڈا ہوا میں لہراتے ہوئے کہا، ’’کھڑا مت ہوئیے۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھو۔ سنا نہیں؟ چلو! لکیر کے اُس پار جاؤ۔ کوئی بات نہیں کرے گا نہیں تو......‘‘ اُس کا اشارہ واضح اور شرمناک تھا۔

امن بحال ہوتے بلبیر سنگھ بولا، ’’حضور! پہلے ساری باتیں سن لیجئے۔ پھر اُنھیں بطور بیان لکھوا لیجئے گا۔ میں دستخط ثبت کر دوں گا۔ دفعہ لگانا تو آپ کے ہاتھ میں ہے۔‘‘

سکھبیر ٹیبل پر ناشتہ، پانی اور چائے سجا کر کھڑا تھا۔ تھانیدار نے رسگلّے کا رس نچوڑ کر منہ میں رکھا، تب سپاہیوں نے بھی ہاتھ بڑھا بڑھا کے ناشتے کی پلیٹ اور چائے کا کپ ایک ساتھ اُٹھا لیا۔

چائے کی چسکی لیتا ہوا تھانیدار بولا، ’’سردار جی! اب آپ اپنا بیان دیجئے۔‘‘

’’حضور! تھوڑا صبر سے سنئے گا۔ بات کچھ پُرانی اور واقعہ بڑا دلچسپ ہے۔ میرے گاؤں میں آم کے باغ میں ایک شام تین سادھوؤں نے ڈیرہ جمایا تھا۔ آس پاس

کے گاؤں میں بھی یہ خبر پھیلتے دیر نہیں لگی کہ کراماتی بابا بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ دونوں چیلے طرح طرح کے واقعات سنا کر بولتے، بابا سدّھ پُرش مہاتما ہیں۔ انھوں نے بھی جتا سے دودھ کی دھار منہ پر مار مار کر سبھوں کو حیران کر دیا اور گاؤں کی بہت سی ایسی باتیں بھی بتائیں، جنھیں بوڑھے بزرگ ہی جانتے تھے۔ چیلوں کا دعویٰ تھا کہ بابا اب تک بہت سے لوگوں کا سونا چاندی دوگنا کر چکے ہیں۔ وہ جہاں جاتے، شیو مندر استھاپت کراتے۔ بیشتر لوگوں نے اِسے سچ نہیں مانا۔ اُن لوگوں کے جانے کے چالیس دنوں کے بعد یہ راز کھلا تھا کہ جن عورتوں نے پوشیدہ طور پر گہنے سونپ کر شرطوں کا پالن کیا تھا، اُن کے سونے دُگنے ہو گئے۔ کراماتی بابا کو فریبی سمجھنے والے خوب پچھتائے۔ لوگوں نے بہت تلاش کیا، لیکن نہ اُن کا اور نہ اُن کے چیلوں کا ہی کہیں سُراغ نہیں ملا......"

"یہ وہی سِدھ پُرش مہاتما ہیں؟" اُسی سپاہی نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا۔

"اگر یہ مہاتما ہوتے، تب میں انھیں اِس طرح باندھ کر رکھتا؟" بلبیر سنگھ نے جواب کے بدلے سوال جڑ دیا۔

"کتنی بار منع کر چکا ہوں، بیچ میں پوچھ تاچھ مت کیا کرو۔ چُپ چاپ سنو!"

تھانیدار نے سپاہی کو ڈانٹ پلا کر پوچھا، "سردار جی! یہ کون ہے؟ آپ نے اِسے کیوں باندھ رکھا ہے؟ یہ بتایئے نہ......"

"حضور! تھوڑا دھیرج رکھیے۔ باندھا ہے تو وجہ بھی بتاؤں گا۔ لیکن پہلے میں اپنے چہرے کے داغ کے بارے میں بتاؤں گا تا کہ دونوں داغوں میں فرق صاف نظر آ جائے۔"

پھر بلبیر سنگھ اپنے چہرے کے داغوں کا راز افشاں کرنے لگا۔ دَم سادھے سبھی سننے لگے۔ ہاؤ بھاؤ کے ساتھ اُس کی سحر بیانی نے سب کو مسحور کر رکھا تھا۔

تھانیدار نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا، "سردار جی! بات سمجھ میں آ گئی۔ اب تو بتا دیجیے، اِس نے کون سا جرم کیا ہے؟"

"سنیے! اِسی سال میں پریوار سنگ گاؤں گیا تھا۔ ایک دن اچانک شور مچا کہ دس سال بعد سِدھ پُرش مہاتما جی گاؤں میں اُسی جگہ پدھارے ہیں۔ پھر کیا تھا، لوگوں کا تانتا لگ گیا۔ اِس بار خوب سواگت ستکار ہونے لگا۔ گاؤں والوں نے مہاتما جی کی اِچھا کے

انوروپ مندر نرمان سے پہلے مہا یگ کرانے کی یوجنا بنائی۔ چیلوں کی دیکھ ریکھ میں پیپل کے پیڑ سے سٹا کر ایک بھویہ یگ منڈپ کا نرمان کرایا گیا۔ ایک چیلے نے کہا کہ ہَون کنڈ کے نزدیک تانبے کے دو کلش گاڑے جائیں گے۔ ایک میں مندر نرمان کے لئے دان اور دوسرے میں جانچ پرکھ اور ناپ تول کے بعد آبھوشن سوامی کے نام پتے کی پرچی کے ساتھ آبھوشن ڈالے جائیں۔ یگ سماپتی کے بعد بُرہم مُہرت میں کلش کے منہ بند کر دیئے جائیں گے۔ پھر مہاتما جی اَن جل تیاگ کر سات دِنوں تک سدّھی سادھنا میں لین ہو جائیں گے۔ دوسرے نے کہا، دُشٹ آتمائیں بادھائیں اُتپن نہ کریں اِس کے لئے سدّھی سادھنا تک یگ منڈپ کے چاروں طرف منتر سے پُرکٹ ناگ راج یگ منڈپ کے اندر اَدِرش وِچرن کریں گے۔ کوئی مُنش نردھارت ریکھا کو پار نہیں کرے گا ورنہ ناگ راج ڈنس لیں گے۔''

میری ماں نے بہو کو بھی مہاتما جی کے درشن کے لئے اُکسایا۔ بابوجی نہیں گئے، لیکن اُنھوں نے وِرودھ بھی نہیں کیا تھا۔ ماں اور بیوی کو ساتھ لے کر میں ہی گیا تھا۔ ہم نے بھی پانچ پانچ ہزار روپئے دان کلش میں ڈالے اور ساس بہو نے پانچ پانچ تولے کے زیور کلش میں رکھوائے تھے۔

سِدّھی سادھنا شروع ہوئے ابھی تین راتیں بھی پوری نہیں ہوئی تھیں کہ سِدھ پُرش مہاتما جی اور چیلے فرار ہو گئے۔''

بلبیر سنگھ نے بابا کی جھکی گردن کو ذرا اُوپر اُٹھا کر تمسخرانہ لہجے میں پوچھا، ''کیوں سِدھ پُرش مہاتما جی! میں جھوٹ تو نہیں بول رہا ہوں؟''

پھر وہ تھانیدار سے بولا، ''حضور! کہا تھا نہ، اِس کے بے داغ چہرے پر داغ دِکھاؤں گا۔ نظر آیا جی؟''

اچانک بھیڑ بے قابو ہو گئی۔ تھانیدار صاحب اَدھ مرے ڈھونگی بابا کو کسی طرح بچا کر لے بھاگا۔

●

(ماہنامہ 'ایوان اُردو'، دہلی جلد۔۳۰، شمارہ۔۷، نومبر ۲۰۱۶ء، اور ماہنامہ 'ترقیم و ترسیل'، دہلی جلد۔۱، شمارہ۔۱۔۲، اپریل ۲۰۱۸ء میں شائع۔)

محبت کا صلہ

دیبا کی شادی بڑے تزک و احتشام سے ہوئی۔ راجدھانی سے کئی سیاسی و غیر سیاسی شخصیات اور پولیس محکمے کے افسران وملازمین شریک ہوئے تھے۔ حویلی کو دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ برسوں بعد وشنو پا کر گاؤں سے متصل سات گاؤں کے لوگوں نے بھی جم کر بھوج کھایا تھا۔

نین شنکر بہن بہنوئی کو ایر پورٹ تک چھوڑنے گیا تھا۔ بیٹی کی رخصتی کے بعد رِکر پا شنکر نے گھر کے اندر قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر گھوم پھر کے بکھرے پڑے سامانوں کو رکھوا رہے تھے۔ دراصل وہ ماں اور بیوی کا سامنا کرنے سے کترا رہے تھے۔

ایک درخت کے نیچے، چوکی کے آس پاس آموں کے چھلکے اور گٹھلیاں پڑی تھیں، جن پر مکھیوں اور بر نیوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ کسی نے سفید مالدہ توڑنے کی کوشش میں ایک شاخ توڑ دی تھی۔ اُنھوں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ نچلی شاخوں کے تقریباً سارے آم توڑ لئے گئے تھے۔ ٹوٹ کر گری شاخ لُند منڈ پڑی تھی۔ خصّی اور بکری نے آم کے گھناؤنے چھلکوں پر پتّوں کو ترجیح دی تھی۔

رِکر پا شنکر چوکی پر جمی دھول کو گمچھی سے اُڑا کر دَھم سے بیٹھ گئے، جیسے کوئی شخص کھڑی پہاڑی پر چڑھتے چڑھتے نڈھال ہو کر کسی چٹان پر جا بیٹھتا ہے۔ اُنھیں اجداد یاد آنے لگے۔ اُنھوں نے اُس مقام کو دیکھا جہاں سیمَل کا چھتنار درخت سب سے نمایاں تھا۔ جس کی بلند و محفوظ شاخوں پر اکثر مدھومکھیاں چھتے لگاتی تھیں۔ درخت کٹ جانے

سے وہ مقام کھُلا کھُلا اور آس پاس کے درختوں کا قد نکل آیا تھا۔ آم کا باغ لگواتے وقت پَر دادا نے یہ سوچا نہیں ہوگا کہ کبھی اِس باغ کی بولی ایک لاکھ تک لگ سکتی ہے اور سیمَل کا ایک پیڑ سوا لاکھ میں بکے گا۔ اُن کے ہاتھ سوا دو لاکھ کی رقم فکس ڈپازٹ کی طرح لگی تھی۔ رقم لیتے وقت اُن کے دل سے پَر دادا کے لئے دعائیں نکلی تھیں۔

کِرپا شنکر کو یہ سوچ کر دکھ پہنچا کہ مفادِ عامّہ میں دروازے پر کنواں کھُدوانے، بڑا سا دلان بنوانے اور آنے والی نسلوں کے لئے پھل دار پودے لگانے کا رُجحان دَم توڑنے لگا ہے۔ اب بیشتر لوگ ہائی بیریڈ ساگوان، سیمَل اور شیشم کے پودے لگاتے۔ کسان بجرا، جو، مروا، کونی، کودو، ساما، چینا، تِل اور تیسی کی کاشت کو ترک کرنے اور سبزی، تمباکو اور پھولوں کی کھیتی کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ پھولوں سے گدرائے، مند ہواؤں سے لہراتے سونف کے پودے نظر نہیں آتے۔ تیسی، مہوا اور اَنڈی کا تیل ڈھونڈنے پر شاید ہی کسی گھر میں ملے۔ شکر کند، مسری کند، سوتھنی اور مروے کے آٹے کی جھلک تہواروں میں مل جاتی ہے۔ گاؤں میں چھپّروں پر قبضہ جمائے کدیے اور بھتھوے کی لتیں اور سجا کر رکھے گئے اُپلے کہیں کہیں، اَنڈی کے پیڑ کم اور پپیتے، بجن کے پیڑ زیادہ نظر آتے ہیں۔ موروثی جائداد بیچ بیچ کر کھانے اور گاؤں چھوڑ کر شہر میں جا بسنے کا چلن تیزی سے بڑھا ہے۔ اب لوگ اپنی کمائی صرف بال بچوں پر خرچ کرتے ہیں۔ مفادِ عامّہ کی سوچ رکھنے والا سب سے پہلے گھر والوں کی نکتہ چینی کا شکار بنتا ہے۔

کِرپا شنکر کے پَر دادا جٹا شنکر نے حویلی کے سامنے ایک بڑا سا دالان اور پختہ کنواں بنوایا اور عقبی اراضی میں آم کا باغ لگوایا تھا۔ حویلی کے احاطے میں ایک مندر بھی تعمیر کروائی تھی۔ وہ شنکر بھگوان کے اُپاسک تھے۔ اُن کا زیادہ تر وقت بھجن کرتن، باغ کی دیکھ ریکھ اور پھلواری کو شاداب رکھنے میں گزر جاتا تھا۔ اُن کی موت کے بعد کسی نے ایک پودا بھی نہیں لگایا۔ آم کے باغ میں سیمَل کا پیڑ خودرو تھا۔ عمدہ نسل کے آموں کے سبب یہ باغ قرب وجوار میں مشہور ہے۔

سفید حویلی دور سے نظر آتی ہے۔ دن میں لگتا کہ حسین دوشیزہ پائینچا پکڑے باغ میں کھڑی ہے۔ چاندنی رات میں گمان گزرتا کہ وہ شانے پر زلفیں بکھرائے دلکش مناظر سے

لطف اندوز ہو رہی ہے۔ موسلا دھار بارش میں وہ باغ میں نہاتی نوخیز دوشیزہ لگتی اور ہلکے کُہرے میں وہ پرستان کا نظارہ پیش کرتی۔

حویلی کے مرکزی محراب کی پیشانی پر نصب سنگ مرمر کے شنکر بھگوان کے نیچے 'شنکر بھون' کُھدا ہے۔ لیکن یہ باغ والی حویلی کے نام سے مشہور ہے۔

کرپا شنکر کے دادا شنکر چرن اور بابا دَیا شنکر جب تک زندہ رہے، دور دراز مقیم رشتے داروں کو بھی کسی نہ کسی کی معرفت آم کا تحفہ بھجواتے رہے۔ اُن کی موت کے بعد دور دراز مقیم رشتے داروں کے حصّے کا آم سماجک سروکار اور اثر ورسوخ دار لوگوں میں بٹنے لگا۔ پھر بھی جو لوگ گاؤں آتے، وہ بورے اور جھولے میں آم لے کر لوٹتے تھے۔

آم کے موسم میں حویلی کا کشادہ آنگن طرح طرح کے اَچار کے مرتبانوں اور سوپ وڈگروں میں سوکھتے اَماوٹوں سے بھرا رہتا۔ بچوں کو برنیاں خوب کاٹتیں۔ بابا زمین پر اُنگلی سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچتے ہوئے زیرِ لب کچھ پڑھتے، پھونکتے اور کھینچی گئی لکیروں کو اپنے کھڑاون سے تھپتھپاتے جاتے۔ یہ عمل چند منٹوں تک چلتا۔ پھر وہ لکیروں کو مٹا کر کہتے، ''اب سب بیکھ نکل گیا۔''

پھر وہ ماں کو پُکار کر کہتے، ''متّی کا تیل لگا کر اِسے کھانے کے لئے کوئی چیز دے دیجئے۔''

وہ آنچل سے بچے کا آنسو پوچھتی اور اُسے تیل لگا کر کھانے کے لئے کچھ پکڑا دیتیں۔ بچہ اُسے کھانے میں مگن ہو کر اپنا دکھ درد بھول جاتا۔

حویلی میں گن کر آم کھانے کا رواج نہیں تھا۔ جب جی چاہتا گھر کے افراد صحن میں کُرسی لگوا کر بیٹھ جاتے۔ خدمت گار بالٹی میں آم لا کر رکھتا جاتا اور لوگ پانی میں ڈُبکے آموں کو چن چن کر کھاتے اور راہگیروں کو بھی دو چار آم پکڑاتے جاتے۔ پھینکے گئے چھلکے کھا کر بکری خصّی کا پیٹ نکل جاتا۔ گائے بھینس تو گٹھلیاں بھی چبا جاتیں۔ ٹپکے، بھپکے اور حویلی سے ملے آم کھا کر گاؤں کے غریب بھی اُگھا جاتے تھے۔ آندھی میں آم لیچی، سوکھی گیلی شاخیں اور تاڑ سے گرے پھنچوں کو لوٹنے کی چھوٹ تھی۔ ناپ تول کر آم، لیچی، تربوز، کٹہل، کدّو، پپیتے اور بھٹے وغیرہ نہیں بکتے تھے۔ دَیا شنکر جب تک زندہ رہے باغ نہ بیچنے کی

روایت قائم رہی۔

گزرتے زمانے کے ساتھ تہذیب، روایت اور رواج ہی نہیں بدلے بلکہ رہن سہن اور بات وچار بھی بدلتے گئے۔ آم لیچی کے باغ ہی نہیں کٹہل، جامن، بیل اور سہجن کے پیڑ بھی بکنے لگے۔ بٹائی پر دیئے جانے والے کھیتوں کی سالانہ نقد رقم کی بولی لگتی۔ مٹی اور کھپڑ پوس مکان تیزی سے پکے مکانوں میں تبدیل ہونے لگے۔ ویران سا قبرستان چوک دیکھتے ہی دیکھتے آباد ہو گیا۔ سڑک کنارے زمین پر بڑھتے قبضے کو روکنے کے لئے جب قبرستان کمیٹی نے اُس کی گھیرابندی کروا کے مین گیٹ میں تالا جڑ دیا، تب کسی نے رات میں نکر پر ہنومان چوک کا سائین بورڈ لگا دیا تھا۔ پھر سواری والے بھی ہنومان چوک کی ہانک لگانے لگے۔

پتلی سی کچی سڑک کئی قسطوں میں کھرنجے سے پکی اور چوڑی ہوتی گئی۔ رکشا اور ٹم ٹم کی جگہ آٹو رکشا نے لے لی۔ بیشتر رکشا والے ٹھیلہ چلانے لگے۔ اب کوچوان کی ٹٹکاری اور گھنگرووں کی جھنکار سنائی نہیں دیتی اور نہ رکشا کے پیچھے لٹکے بچوں کو پھٹکارتا، کھدیڑتا رکشا والا نظر آتا ہے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب عورتوں کو حقے بینے لیتے وقت پتا چل جاتا تھا کہ گاوں میں کب کس کی بہو، بیٹی آئی گئی، کس کے گھر بچہ پیدا ہوا اور کون بیمار ہے۔ شہر میں جا بسے لوگ پرب تہواروں میں بھی گاوں آنے اور گاوں والے ایک دوسرے کے گھر جا کر ملنے جلنے سے کترانے لگے۔ اب لگن میں باراتی لے کر کچی سڑک پر دھول اُڑاتی بیل گاڑیوں کا کارواں نظر نہیں آتا اور نہ چُندری سے ڈھنکی بجی آئینہ چشپاں کامدار ٹپر والی بیل گاڑی پر دُلہن بیاہ کر آتی ہے۔ پیلی دھوتی، چمکدار کرتا بنڈی میں ملبوس سر پر مُکٹ جمائے پالکی پر مسرور بیٹھا دُلہا اور اُسے ایک نظر دیکھ لینے کی للک میں دوڑتے بچے بھی نظر نہیں آتے۔

فور لین سڑک بننے کا منصوبہ پاس ہوتے اِس علاقے کی بھی قسمت جاگ گئی۔ اچانک زمین کی قیمتوں میں اُچھال آیا اور روشنو پا کر گاوں تیزی سے قصبے میں تبدیل ہونے لگا۔ علاقے میں رائس مِل لگا اور سمنٹ کے کئی گودام بن گئے۔ انگریزی اسکول، کوچنگ سنٹر اور بینکوں کے برانچ کھلنے لگے۔ اے ٹی ایم کی سہولت میسّر ہوئی۔ مذہبی، سماجی اور فلاحی رضا کار تنظیموں نے بھی اپنا اپنا دبدبہ قائم کرنا شروع کر دیا۔ اَن پڑھ بھی اپنے ووٹ کی

قیمت سمجھنے اور اُمیدواروں سے سودا کرنے لگے۔

شہر کا حال تو اور بُرا ہے۔ تجارتی ذہنیت اور تہذیبی وثقافتی انحطاط کا بول بالا ہے۔ بے حیائی، فیشن کہلاتی ہے۔ جدید طرز کے مکان بنوانے اور نئے نئے ماڈل کی گاڑیاں خریدنے کی ہوڑ سی لگی ہے۔ بعض مکان مالک بیشتر حصے کرائے پر لگا کے خود کرایہ دار کی طرح دَب کر رہتے اور بعض گرلس ہوسٹل اور لاج چلانے کو ترجیح دینے لگے ہیں۔ خونی رشتے دار بھی دَھن دولت اور سماجی رتبے سے مرتبہ پاتے۔ شادیاں ذات برادری اور مذہبی بندش سے آزاد ہو کر اسٹیٹس اور دور اندیشی کی بنیاد پر ہونے لگی ہیں۔

اب کوئی شادی میں تین گاؤں کو بھی بھوج نہیں کِھلاتا۔ شادی میں شرکت کے لئے کسی کو مجبور نہیں کیا جاتا۔ سگے سمبندھی نہ آئیں تو بھی شادی ہو جاتی ہے۔ اب روٹھے رشتے دار کو منانے اور سامان چھپا کر مہمانوں کو روکنے کا چلن نہیں رہا۔ کھانا پروس کر کِھلانا گنوار وتصوّر کیا جانے لگا ہے۔ شہروں میں تو شادیاں فلمی انداز میں ہونے لگی ہیں۔ گویا کسی فلم کی شوٹنگ چل رہی ہے۔ جئے مال اور رِسنڈ وردان تک ساری رسمیں سمٹ کر رہ گئیں۔ لڑکی کا ہفتہ دس دن پہلے مانجھے پر بیٹھنا، اُبٹن لگوانا، عورتوں بچوں کا جم گھٹ، کھانا کِھلانے کا دور، گیت کے بول، ڈھولک کی تھاپ، عورتوں کا تِھرکنا، بچوں کی شرارتیں، رَت جگے کی دَھما چوکڑی میں مِلن کی جگت لگاتے پَریمی جوڑے، طرح طرح کی رسمیں اور نیگ جوگ کی وصولی۔ یہ سب گزرے زمانے کی باتیں ہو گئیں۔ اب تو لوگ لڑکے والے سے سودا کرتے اور کسی ہوٹل یا میرج ہال میں براتیوں کو کِھلا پلا کر لڑکی سونپ دیتے ہیں۔ دعوت سے محروم غریب رشتے دار دھوم دھام سے کسی ہوٹل میں ہوئی شادی کا چرچا سن کے دل مسوس کر رہ جاتے۔ اب کوئی دوستوں سے کپڑے، جوتے اور سفری بیگ مانگ کر بارات نہیں جاتا۔

یادیں، خزاں رسیدہ پتّوں کی طرح بولتی اور اپنے وجود کا احساس دِلاتی ہیں۔ اچانک ِکرپا شنکر کے چہرے پر مسکان پھیل گئی۔ اُنھوں نے سوچا کہ زمانہ بدلا اور لوگ بھی بدلتے گئے۔ لیکن ماں کے آچار وِچار نہیں بدلے۔

ِکرپا شنکر کے ذہن میں نوکری کی حصولیابی کا واقعہ مجسّم ومتحرک ہو گیا۔ ایک دن بابو جی سے ماں کہہ رہی تھیں کہ ''جب دوا کشر پڑھا لکھا آدمی بھی پولیس کی وردی پا لیتا ہے،

تب کتنا رُعب جھاڑتا پھرتا ہے۔لوگ کُرسی جھاڑ پونچھ کر اُسے بیٹھاتے اور جی جان سے آؤ بھگت کرتے ہیں۔میرا بیٹا تو شہر کا پڑھا لکھا ہے۔داروغہ بن سکتا ہے۔''

بابو جی نے چُپّی سادھ لی تھی۔دراصل وہ نہیں چاہتے تھے کہ دھن دولت اور جگہ زمین رہتے اُن کا اکلوتا بیٹا گھر چھوڑ کر اِدھر اُدھر مارا مارا پھرے۔

اتفاق سے کچھ ہی دنوں بعد پولیس کپتان راجدھانی لوٹ رہے تھے کہ اُن کی کار گاؤں کے قریب خراب ہو گئی۔عملہ اُنھیں باغ والی حویلی لے آئے تھے۔بابو جی بھی گھر پر موجود تھے۔پولیس کپتان کا خوب سواگت ستکار کیا گیا۔راما اوتار شرما بھی شنکر بھکت تھے۔محراب میں نصب آشیرواد دیتے شنکر بھگوان کو دیکھ کر وہ خوش تھے۔آم کھاتے ہوئے بابو جی سے وہ بولے تھے،''آپ کا بیٹا بڑا ہی آگیہ کاری اور سوشیل ہے۔کیا کرتا ہے؟''

''ابھی ابھی بی۔اے پاس کیا ہے۔آگے کیا کرنا ہے؟سوچا نہیں۔''

''پولیس محکمے میں نوکری کرنا پسند کرے گا؟''اُنھوں نے پوچھا تھا۔

''حضور!اب تک تو ہمارے خاندان میں کسی نے سرکاری نوکری نہیں کی ہے۔یہ میری اکلوتی اولاد ہے۔اِس نے اپنی ماں کی اِچھا سے شہر میں رہ کر ڈگری حاصل کی ہے۔پُرکھے اتنا کچھ چھوڑ گئے ہیں کہ کل کی چنتا نہیں......''

وہ قطع کلام کرتے ہوئے بولے،''وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔''

پھر وہ تھوڑی دیر بعد بولے،''میری گاڑی ٹھیک ہونے میں ایک دو گھنٹے لگ ہی جائیں گے۔اِس بیچ مل بیٹھ کر سوچ وِچار کر لیجئے۔آپ لوگوں کی اِچھا ہوگی،تب میں اِس یووک کو نوکری دے سکتا ہوں۔''

اُس نے پولیس کپتان کی یہ بات ماں کو بتا دی تھی۔وہ کِھل اُٹھی تھیں۔اُنھوں نے لہک کر بابو جی سے کہا تھا،''میرا بیٹا پولیس کی نوکری سے لگ جائے گا تو پورے جوار میں پَریوار کا رُعب داب اور بڑھ جائے گا۔زمین جائداد پر کسی کی کالی نظر نہیں پڑے گی۔''

بابو جی تھوڑی دیر تک چُپّی سادھے رہے۔پھر اُنھوں نے پوچھا تھا،''پُرکھوں کی جائداد کون سنبھالے گا؟''

''آپ سنبھالیں گے۔''ماں نے فوراً جواب دیا تھا۔

وہ تصوّر میں وردی پہنے پولیس جیپ میں فرّاٹے بھرنے لگا تھا۔ اُسے مسرور دیکھ کر ماں نے پوچھا تھا، ''کِرپا! تیرا کیا وِچار ہے؟''

''ماں! مجھے لگتا ہے، یہ شنکر بھگوان کا آشیرواد ہے کہ ڈگری ملتے نوکری مجھے تلاش کرتی حویلی تک چلی آئی۔ میرا وِچار ہے، کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ پسند نہیں آئی تو چھوڑ دیں گے۔'' اُس نے دانستہ شنکر بھگوان کے آشیرواد کا ذکر کیا تھا۔

بابو جی کو اُس کی یہ بات معقول لگی۔ اُنھوں نے ماں بیٹے کی خواہش پر اپنی رضامندی کی مُہر لگا دی تھی۔ پھر وہ کاغذات اور آم کی سوغات لے کر پولیس کپتان کے ساتھ راجدھانی گیا اور نوکری کا حکم نامہ لے کر تین دنوں کے لئے گھر لوٹا تھا۔

نوکری ملنے کی خبر جنگل میں لگی آگ کی طرح قرب و جوار میں پھیل گئی تھی۔ بابو جی نے ماں کے کہنے پر سگے سمبندھیوں کے علاوہ گاؤں والوں کو بھی بھوج کِھلایا تھا۔ لوگوں سے اُس کی تعریفیں سن سن کر ماں بابو جی نہال ہو رہے تھے اور اُسے لگا تھا کہ نوکری سے لگتے وہ وِششٹ ہی نہیں بلکہ جوان بھی ہو گیا ہے کہ لڑکی والے رشتے کے لئے دوڑنے لگے تھے۔

کِرپا شنکر ترقی پا کر اے ایس پی کے عہدے تک جا پہنچے۔ لیکن اُنھیں اِس بات کا ملال ہے کہ اگر وہ آرکچھن کا لابھ پانے والوں میں ہوتے، تب وہ بھی ایس پی بن کر ڈی ایم کی طرح ضلع کا مزہ لوٹ رہے ہوتے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر وہ سمجھ گئے تھے کہ پولیس محکمہ میں اصلی مزہ اور ملائی تو اُونچی کُرسی میں ہے۔ اِسی لئے اُنھوں نے بیٹے کو آئی پی ایس کی تیاری کے لئے دہلی بھیجا ہے۔

دبّیا شنکر پیدائشی روایت شکن ہے۔ اُس نے کئی پشتوں سے چلی آرہی اکلوتے بیٹے کی روایت توڑی تھی۔ لوگ بیٹی کی پیدائش پر مُرجھا جاتے ہیں۔ لیکن دادی ماں کو لگا تھا کہ دبّیا کے روپ میں لکشمی جی کا پدارپن ہوا ہے۔ خوش ہو کر اُنھوں نے پورے گاؤں کو چھٹّی کا بھوج کِھلایا اور یہ اعلان بھی کیا تھا کہ وہ زندہ رہیں تو دبّیا کی شادی میں سات گاؤں کو بھوج کِھلائیں گی۔

نَین شنکر کا جنم دبّیا کی پیدائش کے تین سال بعد ہوا تھا۔ دبّیا بچپن سے ہی ضدّی

اور خود سر ہے۔ وہ گاؤں کے اسکول سے میٹرک پاس کر کے دادی ماں کی حمایت سے آگے کی پڑھائی کے لئے دہلی چلی گئی تھی۔ دراصل وہ لوگوں کو یہ دِکھانا چاہتی ہے کہ شنکر پریوار کی بیٹی بھی بیٹے سے کم نہیں۔ اب وہ ایم ایس کی ڈگری لے کر دادی ماں کے دھن سے نوئیڈا میں اپنا نرسنگ ہوم کھولنے میں لگی ہے۔

نَین شنکر آئی پی ایس نہیں بلکہ وہ آئی اے ایس ٹاپر بننا چاہتا ہے تا کہ اُسے جلدی سے ضلع کی کمان ملے۔ وہ جانتا ہے کہ راجیہ میں سی ایم اور ڈی ایم کی چلتی ہے۔ باقی کارندے ہوتے ہیں۔ ڈی ایم کی مٹھی میں ضلع انتظامیہ، ایک بڑا فنڈ اور ہاتھ میں اُفسران کی تکیل ہوتی ہے۔

دِیّا صرف اپنی ضرورت سے گاؤں جاتی۔ لیکن نَین شنکر تہواروں کے علاوہ موقع نکال کر گھر والوں سے ملنے جلنے جاتا رہتا ہے۔

ایک رات نَین شنکر اچانک بہن سے ملنے چلا گیا۔ کمرے میں ایک نوجوان کو گھریلو لباس میں دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا، تب دیّا نے کہا، ”نَین! یہ ہیں میرے کلاس فیلو آلوک بھٹاچاریہ اور تمھارے جیجا جی۔ اُوجّول بھویش کے لئے ہم لوگوں نے کورٹ میرج کر لیا ہے۔ ہمارا سپنا 'شنکر نرسنگ ہوم' کو آکاش تک پہنچانا اور اپنی ایک الگ پہچان بنانا ہے۔ تم جانتے ہو! مجھے گاؤں دیہات کی زندگی شروع سے پسند نہیں۔ چلو! اچھا ہی ہوا کہ تم جان گئے۔ اب تم ماں بابو جی کو بتانا چاہو تو بتا سکتے ہو۔ آلوک نے بھی کسی کو نہیں بتایا ہے۔“

نَین شنکر نے آلوک بھٹاچاریہ کو گلے لگا کر مبارک باد پیش کرتے ہوئے اُس کے سینے سے تا دیر چپک کر اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد واپسی کے لئے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ دیّا نے اُسے روکا نہیں۔

راستے میں اُسے یہ فکر ستانے لگی کہ وہ اب کس منہ سے ماں سے یہ کہہ پائے گا کہ اُس نے بھی کسی کو ساتھ جینے مرنے کا وَچن دے رکھا ہے۔ اُس نے مسکرا کے سوچا کہ دیدی شروع سے ہی اُس سے زیادہ بولڈ ہیں۔ پھر اُسے ماں بابو جی سے زیادہ دادی ماں کی چنتا ستانے لگی کہ وہ ٹوٹے سپنے کی کرچیوں سے اپنے وجود کو لہولہان کر لیں گی۔

جہاں دیدہ ،کرپا شنکر نے طے شدہ حکمت عملی کے تحت سمدھی سمدھن کو اِریج میرج

کے لئے رضامند کرلیا۔ دادی ماں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور جی کھول کر اپنے ارمانوں کو پورا کروایا۔ کسی کو کورٹ میریج کی بھنک تک نہیں لگی۔

کرپاشنکر باہر بیٹھے حساب بے باق کر رہے تھے۔ رُکمنی رشتے داروں کو سوغات دے کر رخصت کرنے، نائی، دھوبن، دائی، نوکروں کا نیگ جوگ ادا کرنے، بچے کھچے کھانے پینے کے سامانوں اور رسد پانی کو ٹھکانے لگانے میں مصروف تھیں۔

اکثر گھروں کے بوڑھے بزرگ کی تلاش تالے اور چھاتے کی طرح ضرورت کے وقت ہی کی جاتی ہے۔ دادی ماں شنکر پریوار کی پران جیوتی ہیں۔ پھر بھی رخصتی کے بعد کسی نے اُن کی سُدھ نہیں لی تھی۔

کرپاشنکر کو جب کچھ اور روپئے کی ضرورت پڑی، تب اُنھوں نے گھر کے اندر میں قدم رکھا تھا۔ ماں کا کمرہ اندر سے بند تھا۔ اُنھوں نے دستک دی۔ پھر ''ماں! ماں!'' پکارنے لگے۔ جب کوئی جواب نہیں ملا، تب اُنھوں نے متفکر لہجے میں بیوی سے پوچھا، ''کمرہ کب سے بند ہے؟ دوپہر میں کچھ کھلایا پلایا ہے یا نہیں؟''

''وِدائی کے بعد سے ہی کمرہ بند ہے۔ سوچا آرام کر رہی ہیں۔ اِسی لئے جگایا نہیں۔'' مختصر سا جواب دے کر وہ دروازے سے کان لگا کر ٹوہ لینے لگیں۔

کرپاشنکر اُنھیں ہٹا کر اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن ساگوان کے نفیس کامدار دروازے ماں بیٹے کے درمیان حائل تھے۔ وہ نامُراد باہر لوٹ گئے۔ پھر وہ تھوڑی دیر بعد واپس آکر بیوی سے بولے، ''تمھارے پاس دس بیس ہزار روپئے ہوں تو لاؤ۔''

روپئے لے کر جاتے ہوئے وہ بولے، ''کسی طرح دروازہ کھلوا کر کھانا کھلاؤ۔ پتا نہیں کب سے نہیں کھایا ہے۔ گیس چڑھ جائے گا۔''

رُکمنی تھوڑی تھوڑی دیر پر اُن سے دروازہ کھولنے کا اصرار کرتی رہی۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔ جب کرپاشنکر کی منّتیں بھی اکارت جانے لگیں، تب دونوں کے ذہن و دل میں بُرے خیالات پیدا ہونے لگے۔

بچوں نے یہ خبر اپنی ماں تک پہنچائی۔ پھر پورے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی۔ حویلی کے اندر عورت بچے اور باہر جوان بوڑھے جمع ہونے لگے۔

رُکر پاشنکر جانتے ہیں کہ ماں بے حد جذباتی ہیں۔ اُنھیں لگا کہ وہ دیّا کی جدائی برداشت نہیں کر پا رہی ہیں۔ اُنھیں یاد ہے کہ وہ ہمیشہ اُس کی ناز برداری میں لگی رہتیں۔ اچھی چیزوں میں وہ اپنا حصّہ طلب کر کے اُسے پکڑا دیتیں۔ اُنھیں جو چیز پسند آجاتی، اُسے لے کر وہ دیّا کے جہیز کے لئے رکھ لیتیں۔ اُس نے جب یہ بتایا کہ وہ نوئیڈا میں 'شنکر نرسنگ ہوم' کھولنا چاہتی ہے، تب اُنھوں نے میکے کی تمام جائداد کو باضابطہ دیّا کے نام کروا کے دستاویز اُسے سونپ دیا تھا۔ پھر اُنھوں نے اپنی کل جمع پونجی شادی کی تقریب میں جھونک دی۔

گھبرائی رُکمنی کو اچانک لگا کہ کہیں وہ کسی بات سے ناراض تو نہیں؟ پھر وہ ذہن پر زور ڈال کر رخصتی سے قبل کی باتوں کو یاد کرنے لگیں۔ کار میں سوار ہونے سے قبل اُنھوں نے دیّا سے کہا تھا، ''آج تمھاری دادی ماں کی ساری اِچھائیں پوری ہو گئیں۔ اُنھوں نے تمھاری شادی سے جڑی نہ جانے کتنی اِچھاؤں کو پلکوں میں سجا رکھا تھا۔ پتی کے ساتھ اُن سے مل کر آشیرواد لے لو۔''

دیّا کے چہرے پر ناگواری کی لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔ وہ بیزار لہجے میں بولی تھی، ''ممّا! اب تو میں ہرگز نہیں مل سکتی۔ وہ مجھ سے لپٹ کے پوپلے منہ سے جگہ جگہ چوم کر چہرے کو تھوک سے بھر دیں گی۔ کپڑے بھی خراب ہو جائیں گے۔ پورے جسم میں اُن کے پسینے کی بدبو سما جائے گی۔ پھر آلوک کو مجھے چھیڑنے کا اَوسر مل جائے گا......''

اُس نے جلدی سے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا، ''بیٹا! ایسا نہیں کہتے۔ دادی ماں سن لیں گی تو اُنھیں دکھ پہنچے گا۔ پُرانے زمانے کے لوگ اِسی طرح اپنا پریم دَرشاتے ہیں۔ تمھارے نانا جی جب کسی بات پر مجھ سے بہت پرَسن ہوتے، تب وہ سر پر چپت لگا کر کچھ کہتے تھے اور میں چپت کھا کر پھولے نہیں سماتی تھی۔''

دادی ماں کو جہیز میں ملے ہاتھی دانت کے پائے والے منقش سنگار بکس، رنگین شیشہ جڑا کامدار صندوقچہ اور دیگر چھوٹی بڑی چیزوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ بولی تھی، ''ممّا! پلیز کباڑ کو یہیں پڑا رہنے دو۔ یہ میرے کسی کام کے نہیں۔ دادی ماں ضرورت سے زیادہ سِنٹی منٹل ہیں۔ اُن کے پرانے بھدّے موٹے موٹے گہنوں کو سُویکار کر لیا نہ۔ میں اِنھیں بیچ کر رقم اسپتال میں لگا سکتی ~~تھی~~ ہوں۔ لیکن اِن سے کیا ملے گا؟ بس! ایک تماشا بن جائے گا۔

آپ دادی ماں سے کہہ دیجئے گا کہ اُنھیں میوزیم کو دان کر دیں......''

اُس نے اُسے سمجھایا تھا، ''بیٹا! ایسا نہیں بولتے۔ کچھ باتوں کو دل میں ہی رکھ لیا جاتا ہے۔ دادی ماں تیرے پیار میں اندھی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ اُنھوں نے ایک ماں کی طرح تیرے لئے چھوٹی بڑی بہت سی چیزوں کو سہیج کر رکھا ہے۔ آج بھلے اِن چیزوں کی قدر و قیمت نہیں رہ گئی۔ زمانہ بدلا اور ریت رواج بدلتے گئے۔ لیکن وہ نہیں بدلیں۔ تم کچھ نہیں بولنا۔ میں اُن سے کہہ دے گی کہ اگلی بار دیّا آئے گی تو اِنھیں ساتھ لے کر جائے گی......''

اُسی وقت اُسے کمرے سے کسی کے لوٹتے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا تھا۔ لیکن اُسے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ اب اُسے وشواس ہونے لگا ہے کہ اُنھوں نے دیّا کی وہ باتیں سن لی ہے یا پھر اُنھیں اِس بات سے صدمہ پہنچا ہوگا کہ دُلہن دُلہا اُن سے بغیر آشیرواد لئے چلے گئے۔

کرپا شنکر ڈوبتے سورج، پھیلتی تاریکی اور جم گھٹ دیکھ کر بے قرار ہو گئے۔ دروازہ توڑنا آسان نہیں تھا۔ اُنھوں نے روشن دان توڑ کر دروازہ کھولنے کا حکم صادر کر دیا۔

ایک راج مستری نے سیڑھی لگا کر روشن دان توڑا۔ پھر ایک دُبلے پتلے لڑکے نے رسّی کے سہارے کمرے میں اُتر کر دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے کرپا شنکر اور رُکمنی کے ساتھ عورت، مرد اور بچے کمرے میں جا گھسے۔ دادی ماں شکن آلود بستر پر سینے سے تکیہ لگائے اوندھے منہ پڑی تھیں اور نوٹوں سے بھرا ایک سُرخ کامدار بٹوا سرہانے پڑا تھا۔

کرپا شنکر ماں کو اِس حالت میں دیکھ کر تڑپ اُٹھے۔ اُنھوں نے فوراً ماں کو بازوؤں میں بھر لیا۔ اُن کی گردن لُڑھک گئی اور ہاتھ جھولنے لگے، تب اُن کے منہ سے 'ماں' کی صدا ایک دلدوز چیخ بن کر نکلی۔ پھر وہ جلدی سے ماں کو بستر پر لیٹا کر دوڑتے ہوئے باہر بھاگے۔ کچھ لوگ اُن کے پیچھے پیچھے دوڑے۔

پلنگ سے لگ کر کھڑی ایک بوڑھی عورت دادی ماں کی کھلی آنکھوں کو بند کرتے ہوئے اَفسردہ لہجے میں بولی، ''بے چاری! پوتی کی جُدائی سَہن نہیں کر پائی۔''

دادی ماں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی رُکمنی کے منہ سے آہ کی طرح یہ جملہ

نکلا، ''دیپا! محبت کا اچھا صلہ دیا......''

اچانک دروازے پر شور بلند ہوا۔ کسی نے بلند آواز میں کہا، ''رکرپا شنکر کو ہارٹ اُٹیک ہوا ہے۔ جلدی سے ہردئے نارائن نرسنگ ہوم لے چلو۔''

بدحواس رُکمنی ننگے پاؤں کھلے سر دوڑ پڑیں۔ اُن کے پہنچنے سے قبل رکرپا شنکر کی روح پرواز کر چکی تھی۔

●

(ماہنامہ 'ایوان اُردو'، دہلی، جلد۔۲۹، شمارہ۔۱۱، مارچ ۲۰۱۶ء، ماہنامہ 'شاعر'، بمبئی، 'افسانہ نمبر'، جلد۔۸۹، شمارہ۔۵، اپریل ۲۰۱۸ء اور 'نگینہ انٹرنیشنل'، سری نگر، 'گولڈن جبلی نمبر'، جلد۔۵۰، شمارہ۔۱۔۲، اکتوبر ۲۰۱۸ میں شائع۔)

صحرا میں بھٹکتی چڑیا

''راجکماری!......راجکماری!......رجّو!......''

دیارِ غیر میں شناسا پکار پر اُس کے بڑھتے قدم از خود ٹھہر گئے۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ رانی دیدی لپکتی ہوئی اُس کی جانب آ رہی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی اُن کے سینے سے جا لگی۔ پھر دل کی دھڑکنوں میں پنہاں محبت، ترنگ کی طرح ایک دوسرے کے وجود کو اپنی گرفت میں لینے لگی اور لمس، جذبات کو ڈی کوڈ کرنے لگا۔

رانی کی بانھوں میں جکڑی راجکماری نے محسوس کیا کہ لمبی جدائی اور محبت و اپنائیت کی تشنہ لبی کو وہ سیراب کرنا چاہتی ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ راجکماری کے بازوؤں کو پکڑ کے اُسے محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

اچانک اُس کی نگاہوں میں نانی کا گھر آنگن اور پھدکتی گوریا کا جھنڈ مجسّم و متحرک ہو گیا۔

وہ اکثر جھلتی دوپہر میں کھڑکی پر پانی سے لبریز کٹوری رکھ کر بستر پر لیٹ جاتی، تب پیاسی گوریاؤں کا تانتا سا لگ جاتا تھا۔ کبھی کبھار بلبل بھی آ دھمکتی تھی۔ گوریا کھڑکی پر اُتر کر پہلے گردن گھما گھما کر ماحول کا جائزہ لیتی۔ پھر وہ کٹوری پر بیٹھ کے چونچ بھر بھر کے پانی پینے لگتی۔ سیرابی سے سرشار گوریا پانی میں دو تین بار چونچ مار کر چھینٹے اڑاتی، چوں چوں کرتی اور پھر سے اڑ جاتی تھی۔ جس کا جی چاہتا، کٹوری میں اُتر کے پنکھ پھڑ پھڑا کر نہاتی اور

ڈبکی لگاتی۔ پھر وہ نیم کی شاخ پر بیٹھ کر پنکھ سکھانے اور سنوارنے لگتی۔ بلبل پانی پی کر فوراً اُڑ جاتی۔ لیکن وہ جب کبھی اُس کا نغمہ کانوں میں رس گھولنے لگتا، تب وہ بستر چھوڑ دیتی تھی۔ متلاشی آنکھوں کو اُسی وقت قرار آتا، جب اَمرود کے پیڑ پر چھپی بیٹھی رہ رہ کر دم ہلاتی نغمہ سرا بلبل کو دیکھ لیتی تھی۔ اُسے لگا کہ بچپن، ساون کی بارش سے دُھلے آکاش جیسا من موہک اور یادیں، البم میں جڑی تصویروں جیسی ہوتی ہیں......

''دیدی! کہاں کھوگئی؟''

راجکماری نے آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلا کر پوچھا، تب وہ یادوں کی وادی سے لوٹ کر جھینپتے ہوئے بولی، ''تم دلّی کب آئی؟ کہاں ٹھہری ہو؟''

''اِسی سال فروری میں۔ اَمبیڈکر نگر کے سکٹر-۲ میں بال گوپال اَناتھ آشرم میں کام کرتی اور وہیں رہتی ہوں۔ چھٹّی کے دن میں اکثر شام کے سمے اِسی طرح گھومتے پھرتے جب تھک جاتی، تب بس پکڑ کر لوٹ جاتی ہوں۔ سنجوگ سے تمھاری نظر مجھ پر پڑ گئی۔ بھگوان نے ہمیں ایک یگ کے بعد مِلا دیا اور آج یہ بھرم بھی ٹوٹ گیا کہ تم اپنی رجّو سے خفا تھی...... دیدی! تم کہاں جا رہی تھی؟''

وہ اُس کا ہاتھ پکڑے کار کی جانب جاتے ہوئے بولی، ''میں بھی من بہلاوے میں نکلی ہوں......''

پھر وہ کار میں بیٹھ کر دروازہ کھولتے ہوئے بولی، ''آؤ بیٹھو! میں آج ہی تمھارا آشرم دیکھ لیتی ہوں۔ یہ میرے روٹ میں ہے۔''

کار کی رفتار اُن بطخوں جیسی تھی، جو شام کے وقت تالاب سے نکل کر دھیرے دھیرے گھر لوٹتی ہیں۔ راجکماری کے حُسن وشباب کو دیکھ کر رانی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ ایک شُبہ اُس کے دل میں سمندری ڈونگے کی طرح نمودار ہوتا، پھر غائب ہو جاتا۔

راجکماری کا خفتہ تجسس بیدار ہو گیا۔ رانی دیدی کا اچانک اپنے گھر چلے جانا اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آنے کا سبب وہ جاننا چاہتی تھی۔ اُس کا گمان، یقین کی سرحد کے قریب کھڑا تھا۔ اِسی لئے وہ ایسے حالات پیدا کرنا چاہتی تھی کہ دیدی اُسے خود ہی بتانے لگے۔

چوراہے کے کھمبے کی آنکھیں سُرخ ہوتے گاڑیاں ٹھہرنے لگیں۔ پھر طرح طرح

کے سامان بیچنے والے بچے اور بھکاری دوڑ پڑے۔ ایک چھوٹا بچہ اُچک اُچک کر مشینی رفتار سے ایک کار کا بارڈی اور شیشہ صاف کرنے لگا۔ پھر وہ پیسے کے لئے دستک دیتے ہوئے سیاہ شیشے کے اُس پار بیٹھے شخص کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کھمبے کی آنکھوں کا رنگ سبز ہوتے گاڑیاں چل پڑیں۔ وہ بچہ شیشے کو تھپ تھپاتا ہوا کچھ دور تک کار کے ساتھ دوڑتا رہا۔ پھر وہ جان جوکھم میں ڈال کر ڈیوائڈر پر جا کھڑا ہوا۔

''دیدی! تم کہاں رہتی ہو؟'' اُس نے خاموشی پر ضرب لگائی۔

''میرا بائی کالونی میں ایک چھوٹا سا فلیٹ لے رکھا ہے۔''

''دلّی میں؟''

''نہیں، گڑگاؤں میں۔''

گفتگو کا سلسلہ پھُس پھُسے دھاگے کی طرح ٹوٹ گیا، تب وہ پیشہ ورسائل کی طرح صبر و تحمل سے کام لینے لگی۔

رانی دانستہ خاموش تھی۔ وہ سوچ رہی تھی، آخر وہ کیا اور کس کے متعلق باتیں کرے۔ نانی زندہ نہیں۔ چالباز مامی اور مطلبی ماما اِس کے ماتا پتا اور وشواس گھاتی راجہ بھی اِس کا بھائی ہے......

راجکماری نے گفتگو کا منقطع سلسلہ جوڑنے کی کوشش کی، ''دیدی! تمھیں یاد ہے؟ میں نہاتے سمے......''

رانی فوراً بولی، ''ہاں! پانی کا جگ اُٹھاتے ہی تم اُچھلنا، کودنا اور رونا شروع کر دیتی تھی۔ ہاتھ میں صابن دیکھتے ہی آنکھیں کس کر میچ لیتی۔ سب سے مشکل کام، سر سے ہاتھ ہٹا ہٹا کر بال جھاڑنا اور آسان کام کپڑے پہنانا تھا۔ تم کو خود سے کپڑے پہننے اور بن سنور کر آئینہ دیکھنے میں بڑا مزہ آتا تھا......''

راجکماری چہک کر بیچ میں ہی بولی، ''دیدی! تمھیں تو سب یاد ہے۔''

''رجّو! یادیں، سہیلیاں سی ہوتیں اور موسم کی طرح آتی جاتی رہتی ہیں۔''

فرار زانی کی طرح ماضی رانی کے روبرو کھڑا ہو کر مسکرانے لگا۔

وہ رات اَماوس کی نہیں تھی۔ پونم کی شیتل کرنیں ماں کے آنچل کی طرح سکون بخش

رہی تھیں۔ کھڑکی سے چاند اُسے اور وہ چاند کو دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی۔ جب اُس کی آنکھیں کھلی تو کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ چور سیندھ لگا کر ڈاکو بنا لوٹ رہا تھا۔ اُس کی گرفت گھڑیال جیسی تھی۔ مدافعتی حربے ناکارہ ثابت ہو رہے تھے۔ جہدِ مسلسل سے تھک ہار کر وہ سکنے لگی تھی اور وہ فاتح حکمران کی طرح مقبوضہ جاگیر کے چپے چپے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُسی سمے گاؤں کے مندر میں سیتا ہرن کا پرسنگ سنایا جا رہا تھا۔

اُس نے کان میں پھُس پھُسا کر کہا تھا، ''رانی! دوش میرا نہیں۔ دوشی تمھارا سُندر روپ اور یہ کامنی کومل کایا ہے...... تمھارا اَنگ اَنگ مادک اور شریر، سکھ ساگر جیسا......''

وہ الوداعی بوسے کے لئے جھکا تھا، تب وہ اُس کے منہ پر تھوک کر بولی تھی، ''نیچ! پاپی! تمھیں معلوم نہیں عورت کا ایک روپ دُرگا کا بھی ہوتا ہے......''

تھوک کو آستین میں پوچھ کر راجہ نے بے شرمی سے کہا تھا، ''اور دوسرا دَروپدی کا، تیسرا داسی کا اور بھی بہت سارے روپ ہیں......''

وہ تڑپ کر بیچ میں بولی تھی، ''وشواس گھاتی! ایک بات یاد رکھنا۔ چھل سے پراپت وجئے کا کسی سے بکھان مت کرنا ورنہ بہنیں راکھی باندھنا چھوڑ کر اُس دن بھائیوں سے اپنی سلامتی کی دعائیں مانگیں گی اور......''

وہ کمرے سے نکل گیا، تب، وہ خاموش ہو گئی تھی۔

بے سدھ پڑی وہ چاند کو پھر دیکھنے لگی تھی۔ کریہہ منظر کی تاب نہ لا کر چاند بھی لڑھک پڑا تھا۔ اُسے وہ اُداس اور بے بس لگا تھا۔ اُس کے سپنے شفق رنگ ہو گئے تھے۔ اُس نے یہ سوچا تھا کہ وہ پلک جھپکتے کنگال ہو گئی۔ اب وہ جیون ساتھی کو انمول رتن کا تحفہ نہیں دے سکتی۔ اُس رات وہ سو نہیں پائی تھی۔

اچانک سوچ نے کروٹ بدلی، تب اُس کا ریزہ ریزہ وجود مکمل ہونے لگا تھا۔ اُس نے اُٹھ کر پانی پیا اور پُرعزم ایک فیصلہ لیا تھا کہ......

''دیدی! آشرم سے آگے نکل رہی ہو۔'' اُس نے خاموشی کے در پر دستک دی۔

راجکماری اُسے پھر ماضی سے حال میں کھینچ لائی، تب وہ ہنستے ہوئے بولی، ''اوہ! میں اپنا گھر دکھانے کی دُھن میں بھول گئی تھی کہ تمھارا کمرہ دیکھتے ہوئے چلنا ہے۔''

گاڑی پارک کر کے دونوں ایک ساتھ اُتری۔ سیکوریٹی گارڈ نے رانی کو بغور دیکھ کر راجکماری سے پوچھا، ''میڈم آپ کے ساتھ ہیں؟''

''یہ میری دیدی ہیں۔اپنا آشرم دیکھنے آئی ہیں۔''

''رجسٹر میں نام پتا درج کروا لیجیے......''

پھر اُس نے آواز لگائی، ''کرشنا! میم صاحب کو آشرم دِکھانا ہے۔ اِنھیں بڑے صاحب سے ملوادو۔''

ایک بچہ دوڑتا ہوا اُن کے پاس جا کھڑا ہوا۔ رانی اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی، ''آشرم کسی اور دن دیکھوں گی۔ ابھی تو راجکماری کا کمرہ دیکھنا ہے۔''

کرشنا دو قدم ساتھ چل کر ٹھہر گیا۔

مطلوبہ جانکاریاں درج کرتے کرتے رانی کو کوفت ہونے لگی۔ آنکھوں کے سامنے جھولتی لٹ کو کان کے اوپر رکھ کر وہ سوچنے لگی کہ آج کا انسان کتنا ڈرا، سہما اور چوکنا ہے۔ پوری دنیا میں سُرکچھا اُپایوں پر بے حساب پیسے خرچ کیے جا رہے ہیں۔ اب گھر میں آنگن، آنگن میں پیڑ اور گھونسلے نہیں ہوتے۔ لوگ گھر نما پنجرے میں رہنے لگے ہیں۔ چپّے چپّے میں گریل سے ناکہ بندی۔ برآمدے، بالکونی اور روشن دان میں لگے گریل پر بھی گھنی جالیاں لگوا لیتے۔ پھر بھی حادثوں پر لگام نہیں لگتی۔ پرندے بھی نظر نہیں آتے......

دھاگے سے بندھے قلم کو رجسٹر پر رکھتے وقت اُس کی نگاہوں میں زنجیر سے بندھے اَدھ کھلے بینک کے گریل، مندروں کی دان پیٹیاں، پیاؤ کے گلاس اور زنجیروں سے جکڑے مسافروں کے اسباب کی شبیہ رقص کر گئیں۔

''دیدی! اب چلو بھی۔ تم تو ہر سمے سوچتی رہتی ہو؟'' راجکماری اُکتا کر بولی۔

دونوں کیبن سے باہر نکل آئیں۔ سامنے ہی دیوار پر جلی حروف میں انگریزی اور ہندی میں لکھا تھا، 'آپ سی سی ٹی وی کیمرے کی نظر میں ہیں۔' رانی مسکان روک نہیں پائی۔

راجکماری کا کمرہ دراصل ایک کچن تھا، جس میں آرڈر دے کر بنوایا ہوا ایک چھوٹا سا فولڈنگ کاٹ لگا تھا اور ریک پر اشیائے صرف رکھی تھیں۔

شرمسار راجکماری بولی، ''دیدی! یہ اَستھائی ویوستھا ہے۔ بعد میں کمرہ الاٹ

ہوگا۔ پاؤں کے نیچے زمین اور سر کے اُوپر چھت سے زیادہ ہمیں چاہئے بھی نہیں۔''

اُسے مطلوبہ موقع مل گیا۔ وہ بولی، ''دیدی! گھر سے اچھا اور سُر کھشت، بن نہیں ہوتا۔ لیکن کبھی وہ اچھا اور سُر کھشت کیوں لگنے لگتا ہے؟''

رانی کی آنکھوں میں پھر پونم کی وہ رات اور آدم خور شیر کی شبیہ رقص کرنے لگی۔ وہ قدرے توقف کے بعد بولی، ''رجّو! جس گھر میں ناگ کا واس ہوتا ہے، وہیں ایسا لگتا ہے۔''

وہ آبدیدہ ہوگئی۔ اُس کا گمان، یقین میں بدل چکا تھا۔

وہ جلدی سے آنکھیں خشک کر کے بولی، ''دیدی! تمھارے جانے کے بعد میں نے بھی بہت دکھ جھیلے ہیں۔ دل کا سکون اور راتوں کی نیند لٹتی رہی۔ من میں بھئے اور شدکا سمایا رہتا۔ بڑی مشکل سے آنکھ جھپکتی، پھر مجھے لگتا کہ اَجگر اُسے جکڑ کے نگل رہا ہے۔''

پھر وہ چہرے پر مسکان بکھیرتی ہوئی بولی، ''لیکن اب بہتر جیون جی رہی ہوں۔ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوں۔ سوجھ بوجھ اور آتم وشواس بڑھا ہے۔ کسی کے ہاؤ بھاؤ سے ہی دل کا بھید جان لیتی ہوں...... دیدی! اَناتھ بچوں کی سیوا میں اَپار سکھ ملتا اور دن کیسے گزر جاتا ہے، پتا نہیں چلتا...... اب تو تم بھی مل گئی ہو دکھ سکھ بانٹنے والی، چھتا ساپت...... بیٹھو نا! چائے بناتی ہوں۔''

رانی کچن سے باہر نکلتے ہوئے بولی، ''چلو، آج ہی میں تمھیں اپنا آشیانہ دِکھاتی ہوں۔ رات میرے ساتھ رہنا۔ گزرے دنوں کو پھر سے جئیں گے۔ کل بینک جاتے سمے تمھیں ڈراپ کر دوں گی۔''

راجکماری چہک کر بولی، ''چلو! کاغذی خانہ پُری میں سمے لگتا ہے۔''

صبح صبح تالاب جاتی بطخوں کی طرح رانی کار تیز چلا رہی تھی۔ دونوں چپّی سادھے اوراقِ ماضی کو اُلٹ پلٹ کے نشان زد کر رہی تھی کہ اُنھیں آج کن باتوں کو شیئر کرنا ہے۔

ماضی، ساز کی طرح لمس سے بھی متحرک ہو جاتا ہے۔ راجکماری نے تو طبلے پر تھاپ جڑ دی تھی۔ رانی کے ذہن میں محفوظ راجکماری کی پیدائش کا فوٹیج رواں ہو گیا۔

بیٹی کی پیدائش کی خبر سنتے ہی ماما کو نہ جانے کون سا بہت ضروری کام نکل آیا تھا۔ اُس دن وہ رات دس بجے گھر لوٹے اور سیدھے اپنے بستر پر چلے گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد

اُنھوں نے پُکارا تھا، ''رانی! سر میں تیل ڈال کر دَبا دو۔ درد سے سر پھٹا جا رہا ہے......''

''آئی ماما جی!'' اُس نے قدرے تاخیر سے جواب دیا تھا۔

سر دباتے ہوئے وہ سوچنے لگی تھی، کیسے ہیں ماما؟ سب لوگوں نے ننھی سی گُڑیا کو مانگ مانگ کر گود میں لیا، چوما اور پیار کیا۔ نانی تو دن بھر سب کے پیچھے پیچھے بھاگتی اور دُہائی دیتی رہیں، ''اب ہو بھی گیا، نوزائیدہ ہے۔ ہوا لگ جائے گی۔ ہنسلی اکھڑ جائے گی۔ سب کو بچہ لینا نہیں آتا۔ دیکھو نہ! بھوک لگی ہے، کیسے منہ کھول رہی ہے......''

بچوں پر پابندی لگا کر اُمید دِلائی گئی تھی کہ جب یہ تھوڑی بڑی ہو جائے گی، تب سب کو جی بھر کر گود میں لینے دیا جائے گا۔ اُسے غصہ آیا تھا کہ اُسے بھی بچہ ہی سمجھا جا رہا ہے۔ وہ تو سائیکل چلا کر ہائی اسکول جاتی ہے۔ ایک لڑکی سائیکل سے گر پڑی تھی تو وہ سائیکل پر اُسے بٹھا کر اسپتال لے گئی اور مرہم پٹی کروا کر اُسے گھر پہنچایا تھا۔ کتنے لوگوں نے اُسے سراہا تھا۔ اُس نے آزمانے کے لئے بچی کا ہاتھ دھیرے سے پکڑ کے کہا تھا، ''نانی! اب میں بڑی ہو گئی ہوں۔ مجھے دیجئے......''

وہ کسمسا کر بولیں، ''اچھا ٹھیک ہے، دو منٹ کے لئے تو بھی راجکماری کو گود میں رکھ لے۔''

وہ جلدی سے چوکی پر پالتی مار کر بیٹھ گئی تھی۔ نانی نے بچی کو اُس کے ہاتھوں پر آہستہ سے رکھا تھا۔ لیکن اُس نے پَٹ سے آنکھیں کھول دی تھی۔ گویا وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اب وہ کس کی گود میں ہے۔ نانی کا رکھا نام اُسے پسند آیا تھا۔ راجہ کی بہن راجکماری۔ وہ خوش ہو کر مٹر مٹر دیکھتی بچی سے بولی تھی، ''راجکماری! میں تمھاری دیدی ہوں۔''

پھر اُس نے اُسے چومنا چاہا تھا۔ لیکن سر پر سوار نانی نے یہ کہہ کر روک دیا تھا کہ ''بس بس اِسی طرح لے کر بیٹھی رہو...... منہ چومنے سے بچے کو بیماری لگ جاتی ہے۔''

وہ بت بنی اُسے دیکھ رہی تھی۔ ایک مکّھی کو شرارت سوجھی تھی۔ وہ اُس کے رخسار پر بیٹھ کر اِدھر اُدھر چلنے لگی تھی۔ اُس نے دھیرے سے سر جھٹکا تو وہ کان پر جا بیٹھی۔ پھر گردن پر چہل قدمی کرنے لگی۔ گدگدی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ پھر بھی وہ ضبط سے کام لیتی

رہی۔ مکھی جب کبھی بچی کے منہ پر جا بیٹھتی، تب وہ پھونک مار کر اُسے اُڑا دیتی۔ وہ جسم نہیں ہلا رہی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ اگر وہ رو دی تو نانی کو موقع ہاتھ لگ جائے گا۔ وہ اِسے فوراً اُٹھا لے جائیں گی۔ اُسے بچی کی سگبگاہٹ اور گرماہٹ سے بہت لطف مل رہا تھا۔ اچانک وہ رونے لگی، تب اُس نے اُسے چھاتی سے لگا کر کہا تھا، ''اُو، اُو...... بابو کو بھوک لگی ہے۔'' وہ چُپ ہوگئی تھی۔ اُس نے ماں کو اِسی طرح چُپ کراتے ہوئے دیکھا تھا۔ ننھی سی بچی کا وجود مرغی کے چوزے کی طرح نرم اور گرم تھا۔ اچانک اُس کے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ مرغی کے چوزے بالکل ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کوئی بتا نہیں سکتا، کون مرغی اور کون مرغا ہے۔ لیکن آدمی کے بچے جنم لیتے پہچان لیے جاتے ہیں۔ کاش! بچپن میں ہم چوزے جیسے ہی ہوتے، تب جنم کی خبر سنتے باپ کے سر میں درد نہیں ہوتا اور بے بس ماں بھی اُداس نہیں ہوتی......''

وہ یہ جانتی تھی کہ روز روز کے جھگڑے سے تنگ آ کر ہی ماں نے اُسے نانی کے گھر بھیج دیا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ ماں خفیہ طور پر ماما کی مالی مدد کرتی تھی۔

وہ بچی کو ایک ٹک دیکھتی ہوئی دھیرے سے اُس کے کان میں بولی تھی،

''راجکماری! ہم دھرتی کے بوجھ نہیں ہیں......''

''دیکھو دیدی! ایک بوڑھا سڑک پار کر رہا ہے۔ تم کہاں کھو جاتی ہو؟''

تیزی سے کٹ مار کر رانی جھینپتے ہوئے بولی، ''میں اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبا تھا۔ رجو! سوچ بھی سایہ کی طرح وجود کا حصّہ ہے......''

راجکماری قطع کلام کرتے ہوئے بولی، ''لیکن ڈرائیونگ کرتے اور سڑک پر چلتے سمے سوچنا ٹھیک نہیں۔ آشرم گیٹ کے سامنے ہی میں نے ایک نوجوان کو بس کی چپیٹ میں آتے دیکھا ہے۔ بکھرے کاغذات کو یکجا کر کے ایک آدمی نے کہا تھا، بے چارہ! انٹرویو دے کر لوٹ رہا تھا۔''

''رجو! تم نے بھی نیوز میں دیکھا ہوگا، ایک بچہ کان میں اِیرفون لگائے ریل ٹریک پار کر رہا تھا۔ ڈرائیور ہارن بجاتا رہا، لیکن وہ سن نہیں پایا۔ ریل گاڑی رُکی، تب اُس کی چھپت وِچھپت لاش نظر آئی...... موبائل اور انٹرنیٹ نے ہماری مٹھی میں چاند ستاروں

کے ساتھ انگارے بھی رکھ چھوڑے ہیں۔"

"دیدی! میں نیوز نہیں دیکھ پاتی۔ ٹی وی آفس اور ویزیٹرس روم میں لگا ہے۔ وہاں جا کر دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔ ریڈیو پر ہی نیوز، گانے اور کھیل کمنٹری سن لیتی ہوں۔"

نو آباد کالونی کے فلیٹ نمبر ۔۷/۱ے کے سامنے کار کھڑی کر کے رانی گیٹ کا تالا کھولتی ہوئی بولی، "یہی ہے میرا آشیانہ۔ اندر جاؤ نہ۔ میں کار لگاتی ہوں۔"

رانی برآمدے اور احاطے کے بلبوں کو جلا کر نکلی تھی۔ راجکماری کو فلیٹ خوبصورت لگا۔ لت دار پھولوں سے ڈھکا محراب نما گیٹ جاذبِ نظر تھا۔ اُس کے دائیں شمی اور بائیں ہارسنگار کا پیڑ تھا۔ رجنی گندھا اور رات رانی کے پودوں کے پاس پانی بھرا لکڑی کا تسلا رکھا تھا۔ رات رانی کا گھنا پودا تھوڑی دیر پر اپنی خوشبو اِسپرے کر رہا تھا۔ چھوٹے سے صحن میں چھتری لگا ایک جھولا بھی تھا۔ سجا کر رکھے گئے گملوں میں طرح طرح کے پھول اور کئی قسم کے کیکٹس لگے تھے۔ برآمدے میں گوریّے کے گھونسلے تھے۔ اُسے لگا کہ فضا میں صحرا جیسی خاموشی، سونا پن اور ہوا میں اُداسی گھلی ملی ہے۔

راجکماری کو دیکھتے ہی ایک خوب صورت وصحت مند کتّے نے اجازت طلب لہجے میں دو بار دھیمی آواز میں "بھَف ...... بھَف" کی آواز نکالی۔

راجکماری سہم کر رانی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

رانی جھک کر کتّے کا سر سہلاتے ہوئے بولی، "شیرو! مائی ڈیر!......"

کتا، رانی سے لاڈ پیار کرتے کرتے اچانک راجکماری کی طرف لپکا اور اُس کے مخصوص عضو کو عجیب طرح سے سونگھتے ہوئے، "کوں، کوں...... آں۔" کی آواز نکالنے لگا۔

رانی بھڑک اُٹھی۔ وہ شیرو کا کان پکڑ کے اُسے بے رحمی سے کھینچتے ہوئے بولی، "یہ کیا؟ مردوں جیسی فطرت......"

وہ جلدی سے اُس کے پٹّے میں زنجیر کا ہُک لگا کر مشکوک نگاہوں سے گھورتی ہوئی راجکماری سے بولی، "چلو! پہلے فریش ہو لیتے ہیں......"

راجکماری نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا، "دیدی! تم اکیلی رہتی ہو؟"

"نہیں!......شیرو، میرے ساتھ رہتا ہے......"

یہ کہہ کر وہ تیز قدموں سے کمرے میں داخل ہوگئی۔

●

(ماہنامہ 'شاعر'، بمبئی، جلد۔۸۷، شمارہ۔۲، فروری ۲۰۱۶ء میں شائع۔)

اور ماہنامہ "تمثیل نو"، ممبئی، جلد-۸، شمارہ-۴، نومبر ۲۰۱۶ء

اَبابیل کی ہجرت

اَماوس کی وہ رات اُمس بھری تھی۔ مچھروں نے ناک میں دَم کر رکھا تھا۔ بجلی کی آنکھ مچولی سے تشنہ لب اِنورٹر چند منٹوں میں ہی کراہنے لگتا۔ اِسی سبب فین اور ٹی وی کا کنکشن کاٹ کر ہر جگہ سی ایف ایل بلب لگا دیئے گئے تھے۔

سات بجے سے گئی بجلی آٹھ بجے آئی تو ظفر ریڈیو بند کر کے میچ دیکھنے چھت سے نیچے اُتر آیا۔ ابا ہاتھ میں ریموٹ لئے الیکشن نیوز دیکھ رہے تھے۔ وہ ٹھٹھک کر برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔

ہندو پاک ٹی ٹونٹی میچ دلچسپ مرحلے میں تھا۔ پھر بھی ظفر ابا کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔ اُس نے طائرانہ نگاہ ڈالی۔ سبھی متحرّک و فعال تھے۔ سمینہ باجی چھوٹے چھوٹے برتنوں میں بھی نل سے پانی بھر رہی تھیں۔ اماں جلدی جلدی روٹیاں بنا رہی تھیں اور دادی کولر کی ہوا میں عافیت سے نماز پڑھ رہی تھیں۔ واپسی سے قبل اُس نے سوچا کہ روٹی، کپڑا اور مکان کے بعد بجلی نے چوتھا مقام حاصل کر لیا ہے۔

قریب دس بجے پھر لوڈ شیڈنگ ہوئی، تب حسبِ معمول دادی کے علاوہ سب لوگ چھت پر جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

چھت کو بیٹھنے لائق بنانے کی ذمّہ داری سمینہ کی ہے۔ دن بھر ظلم ڈھاتا سورج، اُمس بھری رات کا عذاب دے چل دیتا، تب وہ ٹھنڈے فرش پر چٹائی بچھا کے اُس پر پرانی توشک اور چادر بچھا دیتی۔ ظفر ابا اور اپنے لئے کُرسی لے کر جاتا۔ سمینہ اماں کے ساتھ فرش

پر بیٹھتی تاکہ وہ پڑوسیوں کی نظروں میں کم سے کم آئے۔

چھت پر بھی ہوا ساکت اور مچھر منتظر تھے۔ پورا محلہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُوپر آتے ہی اماں نے حسبِ معمول چاروں سمت کا جائزہ لیا۔ جگمگاتی نو آباد آئی اے ایس کالونی کو دیکھتے ہی وہ بھڑک کر بولیں، ''دیکھو تو! کیسا جگمگا رہا ہے۔ دنیا سے انصاف اُٹھ گیا ہے۔ ہم کلیجہ کاٹ کر بجلی کا بل چکاتے ہیں۔ پھر بھی نصیب میں سکھ نہیں ......'' اُن کے لہجے میں حسد اور حسرت گھلی ملی تھیں۔

غصّے میں وہ تیز ہاتھوں سے پنکھا جھلنے لگیں۔ ظفر ماں کے پہلو میں جا بیٹھا، تب وہ اُس کے منہ پر پنکھا جھلنے لگیں۔ سمینہ نے فوراً احتجاج کیا، ''اماں! مجھے بھی گرمی لگ رہی ہے۔''

''پنکھا لے کر کیوں نہیں آئی؟'' پھر وہ اُس کے منہ پر بھی پنکھا جھلنے لگیں۔

اچانک پورا شہر تاریکی میں ڈوب گیا۔

''دیکھو اماں! ہر جگہ بجلی چلی گئی......'' سمینہ چہک کر بولی۔

''اچھا ہوا......'' اُنھوں نے راحت کی سانس لی۔

''اَپارٹمنٹ تو پھر جگمگانے لگا اماں!'' ظفر شرارت پر اُتر آیا۔

''بیٹا! اللہ جسے، جس حال میں رکھے......'' اُن کی سرد آہ میں بے بسی کا دھواں تھا۔

ظفر کو سنہرا موقع ہاتھ لگ گیا۔ وہ قدرے بلند آواز میں بولا، ''ابا تیار ہو جائیں تو ہم لوگ بھی اپنے اَپارٹمنٹ کے فلیٹ میں رہ سکتے ہیں، جہاں چوبیس گھنٹے بجلی پانی ملے گا، چور اُچکّے کا خوف بھی نہیں رہے گا اور......''

اُنھوں نے قطع کلام کرتے ہوئے متجسّس لہجے میں پوچھا، ''بھلا وہ کیسے؟''

''بس! بلڈر سے معاملہ طے کرنا ہوگا۔ ایک دو بلڈر تو مجھ سے پوچھ بھی چکے ہیں۔'' اُس کی نگاہیں ابا کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''ہلدی لگے نہ پھٹکری، رنگ بھی چوکھا آئے۔ زمین مالک کو حصّے میں کئی فلیٹس مل جاتے ہیں۔ ایک میں رہو، باقی کرایہ پر دے دو۔'' سمینہ بولی۔

''ہماری حویلی تو سڑک کنارے ہے اور اِس کا احاطہ بھی بڑا ہے۔ اِس پر شاپنگ کمپلیکس کے ساتھ رہائشی فلیٹس زیادہ سود مند ہوں گے اور مستقل آمدنی کا ایک ذریعہ بھی

نکل آئے گا۔'' ظفر اِس طرح بولا کہ اِس معاملے کو اِسی وقت حتمی شکل دی جارہی ہو۔

چہرے پر پھیلے تبسم کو سمیٹتے ہوئے ابا سنجیدہ لب و لہجے میں بولے، ''بیٹا! دور کا ڈھول سُہانا ہوتا ہے۔ اَپارٹمنٹ کے فلیٹس بیا کے گھونسلے جیسے ہوتے ہیں۔ مکین اپنے آپ میں مگن رہتے، مطلب سے مطلب رکھتے اور قیدیوں کی طرح نمبر سے پہچانے جاتے ہیں۔ اُن کی پوری توانائی اِسٹیٹس مینٹین کرنے میں صرف ہوجاتی ہے۔ بات بات پر کھاسنی، میٹنگ، ضابطے اور فیصلے۔ پارکنگ میں ہروقت کی تکرار۔ بچے کھیلنے کو ترسیں۔ کپڑے سکھانا مشکل۔ پردوں کا پارٹیشن۔ دال، سبزی میں پھورن پڑے تو سب چھینکیں۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھا مہمان، کانوں سے کچن کمرہ دیکھ لے۔ شرم وحیا طاق پر رکھ کر جینا پڑتا ہے۔ بالکنی میں بیٹھو تو پڑوسی گمان کے گھوڑے دوڑانے لگیں۔ کچن گارڈن کے شوقین گملوں میں ادرک، لہسن اور مرچ اُگاتے اور ڈرائنگ روم میں مصنوعی پھولوں کے گملے سجاتے ہیں۔ بیٹا! فلیٹ میں رہو گے تو قیدی پرندوں کی طرح سلاخوں سے دنیا دیکھو گے۔ اپنے گھر میں رہ کر بھی ہوٹل جیسا احساس ہوگا۔ رکھ رکھاؤ کے نام پر ہر ماہ کرایہ دار کی طرح موٹی رقم دینی پڑے گی۔''

پھر اُنھوں نے جگمگاتے اَپارٹمنٹ کو دِکھاتے ہوئے کہا، ''یہ دور سے جتنے اچھے لگتے ہیں، اُتنے ہوتے نہیں۔ جس گھر میں آنگن اور چھت نہ ہو، کمرے سے آسمان نظر نہ آئے اور احاطے میں پیڑ پودے نہ ہوں، وہ گھر نہیں......''

مچھروں کی یلغار اور اُمس سے پریشان اماں اچانک اُبل پڑیں۔ وہ قطع کلام کرتے ہوئے بولیں، ''اِسی سوچ کے سبب کھنڈر پشتینی مکان میں زندگی کاٹ رہے ہیں۔ یہ گھر نہیں، کیڑے، مکوڑوں، چوہوں اور نیولوں کا بسیرا ہے۔ پورے گھر پر اِنھیں کی حکمرانی ہے۔ اِسٹور اور کچن میں ہروقت تلچٹے، چیونٹیاں اور چوہیا اپنے مہم میں لگی رہتی ہیں۔ سات بار مانجھو پھر بھی برتنوں سے تلچٹے کی بو نہیں جاتی۔ کتنے جتن سے مہمانوں کا کپ، طشتری اور گلاس بچا کر میں رکھتی ہوں۔ اُف! تھکی ماندی بستر پر جاؤ تو چھپکلی کی غلاظت پڑی ملے۔ سب سے بُرا حال تو برسات میں رہتا ہے۔ آنگن میں جونک، کیچوے رینگتے اور مینڈک کودتے پھرتے ہیں۔ دیوار و در پر بھی گھونگھا چپکا سونڈ گھماتا پھرتا ہے۔ چند منٹوں کی بارش میں گھنٹوں چھت ٹپکتی، دیوار پسیجتا اور فرش تو مستقل نم رہتا ہے۔ حویلی میں ہریالی چھائی رہتی۔

مجھے تو بلّیوں میں دیمک کی سُرنگیں بھی نظر آئی ہیں۔ کسی دن چھت سینے پر آ گرے گی......''

اماں کا دَم پھول گیا۔ وہ ہانپنے لگیں، تب سمینہ ہنس کے بولی، ''ابا نیچر فرینڈلی ہیں اماں! آج تک کسی موسم کی شکایت نہیں کی ہے۔''

ابا کو راہِ فرار مل گئی۔ وہ فوراً بولے، ''بیٹا! موسم سے شکایت کیسی؟ گرمی تربوز، خربوزہ، آم، لیچی لے کر آتی ہے۔ جاڑے میں لوگ دھوپ، آگ اور لحاف کا لطف لیتے ہیں اور برسات میں ہر طرف ہریالی چھا جاتی ہے۔''

سمینہ نے سوچا کہ ابا اکثر اِسی طرح اماں کے طعن و تشنیع کو ہوا میں اُڑا دیتے ہیں۔ اُنھیں اچھے موڈ میں دیکھ کر اُس نے پوچھ لیا، ''دالان سے اَبابیل کے مہکتے گھونسلوں کو آپ کیوں نہیں ہٹانے دیتے؟''

وہ بولے، ''بیٹا! اَبابیل کوئی عام سا پرندہ نہیں۔ یہ ہر جگہ گھونسلے نہیں لگاتی اور اچانک ہجرت بھی کر جاتی ہے۔ جب اَبرہہ لشکر لے کر خانہ کعبہ کو مسمار کرنے چڑھ آیا تھا، تب اللہ کے حکم سے اَبابیلوں نے ہی لشکر پر کنکری برسائی تھی۔ اَبرہہ مع لشکر مارا گیا تھا۔ بیٹا! یہ اَبابیلیں کئی پشتوں سے ہمارے ساتھ رہ رہی ہیں۔ اِن سے ہمارا جذباتی رشتہ ہے اور کسی کو بے گھر کرنا، اچھی بات بھی نہیں۔''

غصّہ ضبط کئے اماں منہ پر پنکھا جھلتی رہیں۔ ظفر کو سمینہ باجی پر غصّہ آنے لگا کہ اُنھوں نے گفتگو کا موضوع ہی بدل دیا تھا۔ ابا کی ذہن سازی کا یہ اچھا موقع تھا۔ دراصل وہ اُنھیں کسی طرح رضامند کر لینا چاہتا تھا۔

قدرے توقف کے بعد ابا فلسفیانہ لب و لہجے میں بولے، ''تمھاری ماں کو کئی بار سمجھا چکا ہوں، دکھ اور سکھ محسوس کرنے سے ہوتا ہے۔ تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے، یہ خیال شیطانی وسوسہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یکساں تدبیر کا نتیجہ بھی یکساں ہوتا۔ دولت، عورت اور اولاد اللہ کے آزمائشی آلے ہیں۔ عقلمند آدمی دکھ میں صبر اور سکھ میں شکر سے کام لیتا ہے۔ دنیا کا دکھ سکھ تو عارضی ہے۔ ہمیں آخرت کی فکر کرنی چاہئے، جو نہیں کرتے۔ بیٹا! کسی کو مقدر سے زیادہ اور وقت سے پہلے کچھ بھی نہیں ملتا......''

بات بات پر نصیحت سنتی اماں پھر قطع کلام کرتے ہوئے تُرش لہجے میں بولیں،

''عقلمند آدمی اپنا اچھا بُرا سوچتا ہے۔ سر کے بوجھ کو بھی محسوس کرتا اور اُس سے نجات پانے کی ترکیب ڈھونڈتا رہتا ہے۔ آپ کی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہتا۔''

سمینہ اُٹھتے ہوئے بولی، ''میں چلی!...... دادی نیچے اکیلی ہیں۔''

ابا کا موڈ اچانک خراب ہو گیا۔ اُنھوں نے کڑک کر پوچھا، ''تم کیا چاہتی ہو؟ سمینہ کی پڑھائی بند کرا دوں؟ اُسے کسی نا معقول کو سونپ دوں؟''

جواب طلبی سے اماں سہم گئیں۔ وہ نرم لہجے میں بولیں، ''میں پڑھائی لکھائی کے خلاف نہیں ہوں۔ بس یہی چاہتی ہوں کہ جیتے جی سمینہ اپنا گھر بسا لے۔ اماں بھی یہی چاہتی ہیں۔ آگے شوہر کی مرضی، وہ پڑھائی جاری رہنے دے یا نوکری کروائے......''

ابا قطع کلام کرتے ہوئے بولے، ''لاتعلق سا دِکھائی دیتا باپ بے فکر انہیں ہوتا۔ وہ بیٹی کی شادی کرنا چاہتا ہے، سر کے بوجھ سے نجات پانا نہیں۔''

بات بگڑتے دیکھ کر ظفر نے موضوع بدلنے کی کوشش کی، ''اماں! ابھی تک چاند نہیں نکلا؟''

''اماوس ہے۔'' غصہ ضبط کرتی ہوئی اماں نے مختصر سا جواب دیا۔

اچانک ماحول ناخوشگوار ہو گیا۔ غم و غصہ پَردار دیمک کی طرح فضا میں چھانے لگا، تب اماں پوری قوت سے پنکھا جھلنے لگیں اور ابا سینے کا بٹن کھول کر ٹہلنے لگے۔

ظفر منقطع گفتگو کا سلسلہ جوڑنے کی غرض سے ابا کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جب وہ منڈیر پکڑ کے کھڑے ہوئے، تب اُس نے پوچھا، ''ابا! اِس بار سنٹر میں کس کی سرکار بنے گی؟''

وہ خاموش رہے، تب ظفر کو لگا کہ اماں کی بے وقت کی راگنی سے ابا سخت ناراض ہو گئے ہیں۔ اُسے اماں پر بھی غصہ آنے لگا کہ اِن کے سبب اَپارٹمنٹ کی بات ادھوری رہ گئی۔ اُس نے چور نگاہوں سے ابا کو دیکھا۔ وہ اذیّت کے گرداب میں پھنسے لگے۔ پھر بھی اُس نے بات آگے بڑھائی، ''اِس بار ووٹر سبق سِکھانے کے موڈ میں نظر آ رہے ہیں۔ ابا! آپ کسی نتیجے پر پہنچے؟''

ظفر ابا کی خاموشی میں نقب لگا ہی رہا تھا کہ وہ اچانک سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اندھیرے کمرے میں جا گھسے۔ اُن کے پیچھے ظفر اور اماں گرتے پڑتے اُتریں۔ سمینہ جلدی

سے چائنیز لیمپ اُٹھاتی کمرے میں گئی ۔ دادی مچھر دانی میں الجھ کر گر پڑیں ۔ ابا تلملا کر گرے اور فرش پر تڑپنے لگے۔ وہ کچھ بول نہیں پا رہے تھے ۔ اُن کے منہ سے الفاظ کی جگہ ہوا نکل رہی تھی۔ بدحواسی میں کسی کو کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ ظفر ابا ! ابا! پکارتا ہوا اُنھیں فرش سے اُٹھا کر بستر پر لیٹانے اور روتی سمینہ پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بے بس اماں اور دادی چیختی ہوئی اللہ سے فریاد کرنے لگیں۔

شور وغل سن کر پاس پڑوس کے لوگ بھی دوڑ پڑے۔ پھر اُنھیں مقامی سنکٹ موچن نرسنگ ہوم میں داخل کرایا گیا۔ اُنھیں دل کا پہلا شدید دورہ پڑا تھا۔ اذانِ فجر کے فوراً بعد ابا کی روح پرواز کر گئی۔

صف بندی کے وقت عباس چچا نے ظفر کو بُلا کر امام صاحب کے پیچھے کھڑا کیا تھا۔ جب اُنھوں نے نمازِ جنازہ پڑھانے کی اجازت مانگی، تب وہ مخمصے میں پڑ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اب تک تو وہ ہر کام ماں، باپ کے حکم اور اُن کی اجازت سے کرتا آیا ہے۔ باپ زندہ نہیں رہا، لیکن اماں تو ہیں۔ اُن سے پوچھے بغیر وہ اتنے اہم کام کی اجازت کیسے دے سکتا ہے؟

عباس چچا خاموش کھڑے ظفر کو ٹھوکے لگا کر بولے، ''بیٹا! اجازت دے دو کہ اب تم ہی اپنے گھر کے ولی ہو۔''

''پڑھایئے۔'' اُس کے منہ سے روبوٹک آواز نکلی۔

بیشتر لوگ قبرستان سے ہی لوٹ گئے تھے۔ گھر تک آئے لوگوں میں بھی واپسی کی بے قراری تھی۔ دو تین گھروں سے بھیجی گئیں روٹی سبزی، پوری جلیبی، سنگھاڑہ لٹی اور چاول، دال، سبزی پر مکھیاں بھنبھنانے لگی تھیں۔ باپ کی مہمان نوازی کو ظفر برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اِسی سبب وہ فرداً فرداً شرکت کی التجا کرتا پھر رہا تھا۔ دستر خوان پر جا بیٹھے لوگ دستِ خود دہانِ خود پر عمل پیرا تھے۔ لوگوں کی عجلت پسندی، حیلے حوالے اور رسم ادائیگی سے دل برداشتہ ظفر، جانے والوں کو فی الفور اجازت دینے لگا تھا۔ کھا پی کر بیٹھے چند لوگ خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے۔

اچانک ظفر کو عباس چچا کی کہی بات یاد آ گئی، تب وہ اماں، دادی اور سمینہ باجی کی

خبر گیری کے لئے گھر کے اندر چلا گیا۔

گھر اب تک عورتوں اور بچوں سے بھرا تھا۔ ساتھ آئے بچے اُکتانے لگے تھے۔ بار بار کے بُلاوے کو نظر انداز کر کے بیٹھی عورتیں نہ چاہتے ہوئے بھی الوداعی رسمی کلمات ادا کرنے لگی تھیں۔ بیواؤں اور یتیموں کے چہرے پر اُن کا اپنا درد بھی سمٹ آیا تھا۔

چہارم کے بعد پُرسہ دینے والوں کا سلسلہ منقطع سا ہو گیا۔ کبھی کبھار کوئی موبائل فون پر موت کیسے ہوئی پوچھ کر خود کو شریکِ غم بتاتا اور کوئی موت و حیات کے فلسفے پر گفتگو کرنے لگتا۔ مخصوص رسمی کلمات اور ہدایت و نصیحت سے ظفر اُوبنے لگا تھا۔

ظفر کے خواب و خیال میں بھی یہ نہیں تھا کہ ابا کے مرتے خوشحال گھریلو زندگی خزاں رسیدہ، گھر بے رونق اور حیثیت و ذمّہ داری از خود منتقل ہو جائے گی۔ وہ پلک جھپکتے بچے سے بڑا ہو جائے گا۔

ظفر زندگی کو پٹری پر لانا چاہ رہا تھا، لیکن اُسے کوئی ترکیب سوجھ نہیں رہی تھی۔ وہ جب کبھی گھر کے اندر قدم رکھتا تو دیکھتا کہ اماں نوسزایافتہ قیدی کی طرح اُداس و خاموش بیٹھی ہیں۔ اُنھوں نے اعلانیہ خود کو شوہر کا قاتل تسلیم کر لیا تھا۔ سمینہ باجی کی بولتی مسکراتی آنکھوں میں صحرائی ویرانی دکھائی دیتی۔ وہ بھی ابا کی موت کا سبب خود کو ٹھہرا چکی تھی۔ نیز اُس کے دل میں 'بیٹی' ہونے کا ملال اور بڑی ہو کر بھی کچھ نہ کر پانے کی شدید کسک تھی۔ دو تین دنوں تک آنسو بہا کر دادی نے رونا بلبلانا چھوڑ دیا تھا کہ بیٹے کے غم کو بہو کی بیوگی اور پوتا پوتی کی یتیمی نے ڈھانپ لیا۔ اُنھوں نے موت کی روداد سنانے کی ذمّہ داری لے رکھی تھی۔ کم سخن دادی اب بولنے لگی تھیں۔ وہ اکثر سوچ سوچ کر بیٹے اور اپنی ازدواجی زندگی کے واقعات پوتا پوتی کو سنانے لگتیں۔

سمینہ کا حُسن و شباب اکثر گیہوں کے پکے جھومتے خوشوں کی طرح جب سر سرانے اور بولنے لگتا اور رات کے سناٹے میں اُس کی چوڑیاں کھنکنے لگتیں، تب دادی اور اماں کی نیند اُڑ جاتی۔ پھر شادی کی فکر دانت میں پھنسے ریشے کی طرح اُنھیں بے کل کر دیتی۔

کماؤ کنوارے بیٹے کی ماں، دادی کی توجّہ کا فوراً مرکز بن جاتی۔ وہ اپنی باتوں کا آغاز پوتے پر اچانک آپڑی گھریلو ذمّہ داریوں سے کرتیں۔ پھر وہ بڑی صفائی سے سمینہ

کی غیر معمولی صفات کا بکھان کرنے لگتیں۔ دادی کی خوشامدانہ گفتگو اور اُن کا طرزِ عمل سمینہ کو اچھا نہیں لگتا۔ وہ چائے ناشتہ لگا کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔

ظفر کو کالج کے دوست بار بار بُلا رہے تھے۔ فائنل امتحان سر پر تھا۔ لیکن وہ گھر والوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر دلی نہیں جا رہا تھا۔

اُس رات بھی اُمس بھری گرمی تھی۔ ظفر حسبِ معمول دیر رات تک چھت پر کروٹیں بدل بدل کر سونے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس کا ذہن طرح طرح کے خیالات اور وسوسوں سے منتشر تھا۔ آخری پہر اُسے ایسی گہری نیند آئی کہ چہار جانب سے گونجتی فجر کی اذان بھی اُسے بیدار نہیں کر سکی۔ دھوپ شدّت اختیار کرنے لگی، تب اماں اُسے دیکھنے چھت پر گئیں۔ بیٹے کو دھوپ میں بے سدھ پڑا دیکھ کر اُنھوں نے پاس پڑی چادر کو الگنی پر ڈال کر اُس کے جسم پر سایہ کر دیا۔ پھر وہ چاروں سمت کا جائزہ لینے لگیں۔ اُنھیں صبح کا منظر حسبِ سابق لگا۔ دنیا اپنی رفتار سے چل رہی تھی۔ لیکن فضا اُداس لگی۔ اُنھیں لگا کہ دل کی اُداسی نظروں میں اُتر آئی ہے۔ وہ سُست قدموں سے کمرے میں لوٹ آئیں۔

ایک رات اماں چھت پر تنہا بیٹھی تھیں۔ اچانک اُن کی نظر چاند سے دوچار ہو گئی۔ پھر اُن کے ذہن میں پونم کی وہ رات مجسّم ہو گئی۔ وہ پہلی بار اُسے بہانے بنا کر چھت پر لائے تھے۔ پھر چاند کو دِکھا کر اُنھوں نے پوچھا تھا، ''بتاؤ! وہ چاند خوبصورت ہے یا پہلو کا یہ چاند؟''

بازوؤں کو پکڑ کے اُنھوں نے مسرور نگاہوں سے اُسے دیکھا تھا۔

اُس نے بھی شوخ نگاہوں سے اُنھیں دیکھتے ہوئے کہا تھا، ''وہ۔''

بے تاب ہو کر وہ بولے تھے، ''نہیں! نہیں!...... پُرکشش چاند تو وہ ہے، جسے روح میں اُتارا جا سکے، پہلو سے لگایا جا سکے، جس کے ساتھ دکھ سکھ ساجھا کیا جا سکے...... اور ...... اور جس کی سانسوں کی تپش سے وجود پگھلنے لگے، جو روح کو سکون اور جسم کو آسودگی بخشے۔ وہ خوبصورت چاند تم ہو۔ لو! میں ابھی سے ہی تمھیں چاند کہہ کر پُکارتا ہوں...... چاند!''

اُن کی بے قراری میں محبت کی تڑپ و تپش تھی اور پُکار میں ریشمی دھاگے کی لچک اور مکھّن سی نرمی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اُسے چاند کہہ کر ہی پُکارا کریں اور بات بات پر چاند کہیں۔ صبح و شام کانوں میں رس گھلتا رہے۔ لیکن اُس نے دل پر جبر کر کے کہا تھا،

''نہیں! نہیں!...... ایسا غضب نہ کیجئے گا۔ اماں سن لیں گی۔''

اُن کے اُداس چہرے پر نظر پڑتے ہی اُسے رحم آ گیا تھا، تب وہ اُن کی ناک پکڑ کے بولی تھی، ''اُداس کیوں ہو گئے؟ کبھی کبھار جی مچل جائے تو چپکے سے کان میں کہہ دیجئے گا۔''

پھر وہ جلدی سے اُچک اُچک کر انعامی بوسے ثبت کر کے تیزی سے کمرے میں لوٹ آئی تھی۔ بستر پر اوندھے منہ لیٹی وہ سوچنے لگی تھی کہ شوہر محبتی ہو تو زندگی قوسِ قزح کی طرح خوش رنگ لگتی ہے۔ پھر اُسے لگا تھا کہ وہ محبت کے شیرے میں رس گلے کی طرح تیرنے لگی ہے۔ میٹھی یادیں سہیلیوں کی طرح تا دیر گدگداتی اور چہل کرتی رہی تھیں۔

ایک صبح اچانک آ دھمکے معین چچا اور شرما جی کو دالان میں بٹھا کر سمینہ چھت پر گئی۔ ظفر پسینے سے شرابور بے سدھ پڑا تھا۔ وہ دوپٹے سے اُس کی پیشانی خشک کرنے لگی، تب وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ سمینہ بستر سمیٹتے ہوئے بولی، ''معین چچا اور شرما جی تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔''

ابّا کی موت کے دن سے ہی دوا کی دُکان بند پڑی تھی۔ معین چچا اور شرما جی ماہرِ فن سیلز مین تھے۔ اُوپر کا کام دو یتیم نوجوان کرتے اور ابّا کے ذمّے کیش تھا۔

معین چچا بلا تمہید مشفقانہ لہجے میں بولے، ''بیٹا! یہ دُکان ہی تو ہم لوگوں کی روزی روٹی کا ذریعہ ہے۔ ہر کاروبار کے چند اصول اور شرائط ہوتی ہیں۔ چلتی دُکان بھی اگر بہت دنوں تک بند رہے تو وہ بیٹھ جاتی ہے۔ دوا کی دُکان کا معاملہ زیادہ نازک ہے۔ ڈاکٹروں سے رابطہ بنائے رکھنا اور اِکسپائر ہونے سے قبل دوائیں نکالنی پڑتی ہے۔ وقت اور گاہک دونوں صبر اور انتظار نہیں کرتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اب آپ اپنے ابّا کی ذمہ داریوں کو سنبھالیں۔ کاروبار کے داؤ پیچ بھی آپ جلد ہی سیکھ جاؤ گے......''

ظفر نے محسوس کیا کہ دادی اور اماں دروازے سے لگی باتیں سن رہی ہیں۔ وہ اچانک اُٹھ کر اندر چلا گیا۔ دادی اُسے اپنے کمرے میں لے گئیں۔ اماں اور سمینہ بھی ساتھ ساتھ آئیں۔ دادی سنجیدگی سے بولیں، ''بیٹا! آج نہیں تو کل گھر پریوار کی ذمہ داریاں تنہا تمھیں ہی سنبھالنی ہیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ آج سے ہی بسم اللہ کرو۔ لوگوں کی ہمدردی پیٹ کی آگ، تن کے تقاضوں اور سماجی ضروریات کو پورا نہیں کرتی۔ آگے تمھاری مرضی......''

وہ خاموش ہو کر بہو کو دیکھنے لگیں، تب اماں بولیں، ''تمھاری دادی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم امتحان دے لو......'' اُن کی جواب طلب نگاہیں بیٹے کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

خاموش ظفر اُٹھا اور دُکان کی چابی لیتا ہوا باہر نکل گیا۔

معین چچا کو چابی سونپ کر ظفر بولا، ''چچا! ابا کی جگہ اب آپ لوگ ہی ہمارے گارجین ٹھہرے۔ اماں کی خواہش ہے کہ میں اپنا امتحان دے لوں۔ آپ لوگ اتنی مہربانی کیجیے گا کہ ہر روز صبح چابی لے جائیے اور گھر خرچ کے ساتھ اِسے رات میں لوٹا دیجئے گا۔ اِن شاءاللہ میں امتحان دے کر آپ لوگوں کے مشورے پر عمل کروں گا۔''

ظفر کا اضطراب ختم ہو گیا۔ پھر وہ امتحان دینے دہلی چلا گیا۔

معین چچا صبح چابی لے جاتے اور دُکان بند کر کے گھر خرچ کے روپے کے ساتھ اُسے سمینہ کو لوٹا دیتے۔ کالج جاتے وقت کبھی کبھار سمینہ راستہ بدل کر دور سے دُکان پر ایک نظر ڈال لیا کرتی۔ ابا کی کُرسی پر معین چچا کو بیٹھا دیکھ کر اُسے صدمہ پہنچتا۔

چند دنوں تک ہی معین چچا وعدہ وفا کر پائے۔ پھر ایک دن کبھی دو دن کے بعد صبح کے وقت آتے اور کچھ پیسے تھما کر چلے جاتے۔ سمینہ چاہتی تھی کہ وہ ظفر کو آگاہ کر دے۔ لیکن اماں کا تاکیدی حکم تھا کہ اُسے امتحان دے لینے دو۔

ایک دن صبح صبح معین چچا آئے اور سمینہ کو چابی دے کر بولے، ''شرما جی نے کوئی اور دُکان پکڑ لیا ہے۔ دونوں لڑکے بھی نہیں آتے۔ میں تنہا دُکان نہیں چلا سکوں گا۔ ظفر آئے گا، تب مل بیٹھ کر آگے کی سوچیں گے۔''

سمینہ چائے ناشتہ لے کر آئی تو دیکھا، معین چچا تیز قدموں سے سر جھکائے چلے جا رہے ہیں۔ اُسے لگا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

سمینہ دن گنتی رہی۔ ظفر امتحان دے کر آیا تو اُس نے رات میں ہی اُسے تمام باتیں بتا دیں۔

صبح ناشتے کے بعد اماں بولیں، ''بیٹا! میرا دل تو بیٹھا جا رہا ہے۔ طرح طرح کے وسوسے......''

دادی قطع کلام کرتے ہوئے بولیں، ''دنیا کا یہی چلن ہے۔ گھر میں آگ لگتی ہے تو اسباب لٹتے بھی ہیں۔ ہوا کا رُخ اور انسان کا مزاج بدلتے دیر نہیں لگتی۔ روح پرواز کرتے سر سے جوئیں بھی نکل بھاگتی ہیں۔''

اماں، ظفر کا حوصلہ بڑھانے لگیں، ''بیٹا! عزم و حوصلے سے کام لو۔ چاہو تو آج سے ہی ایک نئی زندگی کا آغاز کرو۔''

دُکان کی چابی لے کر ظفر چلنے لگا، تب سمینہ دادی کے اشارے پر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ظفر خاموش رہا کہ اُسے بھی بہن کی شراکت و معاونت درکار تھی۔

شٹر اُٹھاتے ہی گرد و غبار نے اُن کا استقبال کیا۔ بجلی کا کنکشن کٹا ہوا تھا۔ مکڑیوں نے فٹ پاتھی دُکانداروں کی طرح جگہ جگہ قبضہ جما رکھا تھا۔ چہار سو دھول کی موٹی تہیں جمی تھیں۔ کئی جگہوں پر جگر سوختہ کینڈل آنسو بہائے استادہ تھے۔ سمینہ نے فرج کھول کر دیکھا۔ پانی کی دو بوتلیں پڑی تھیں۔ آئس بکس کا ڈھکن غائب تھا۔ وہ پاس پڑے جھاڑن اور جھاڑو کو اُٹھا کر صفائی میں لگ گئی۔

ظفر نے کیش دراز میں جھولتی چابی کو گھمایا۔ دراز کھلا تھا، تب اُس نے اُسے کھول کر دیکھا۔ چھپکلی کے انڈوں کے شکستہ خول اور ایک کٹوری میں چند سکّے دھول سے اَٹے پڑے تھے۔ اُس کے ذہن میں ابا مجسّم ہو گئے۔ وہ ہر جمعرات کو خیرات بانٹتے تھے۔ اُس نے اکڑے دراز کو زور لگا کر بند کیا، تب متوحش چھپکلیاں کود کر تیزی سے ریک کے پیچھے جا چھپیں۔ ظفر اسٹول پر چڑھ کے دواؤں کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک اُس پر ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ ریک پر سلیقے سے سجا کے رکھے گئے خالی ڈبّوں کو چیختے چلاتے ہوئے فرش پر گرانے اور بار بار یہی جملے دُہرانے لگا، ''اتنا بڑا فریب؟! ایسی دغا؟......''

سمینہ کو معاملے کی تہہ تک پہنچتے دیر نہیں لگی۔ وہ فوراً بھائی کا حوصلہ بڑھانے لگی، ''دیکھو ظفر! چابی ہماری مٹھی میں اور اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اگر معین چچا دُکان پر قبضہ جما لیتے، تب مشکل اور بڑھ جاتی۔ آزمائشی وقت میں صبر اور ہمّت سے کام لینا ہے۔ اللہ بڑا رحیم و کریم اور رزّاق ہے۔ میں ہوں نہ تمھارے ساتھ۔ امّی نے کہا ہے نہ کہ آج سے ہی ایک نئی زندگی کا آغاز کرو۔ سمجھ لو کہ آغاز ہو چکا۔''

ظفر پُرسکون ہو گیا۔ دُکان کی صفائی کر کے دونوں گھر لوٹ آئے۔ روداد سن کر

اماں بولیں، ''دیکھا اماں! میرا شُبہ صحیح نکلا نہ؟''

پوتا پوتی کو پہلو میں بٹھا کر دادی بولیں، ''یہ واقعہ ایسا نہیں، جو پہلی بار اور صرف تمھارے ساتھ ہوا ہے۔ یتیموں کے منہ کا نوالہ چھین کر کھانے والے ہر زمانے میں رہے ہیں۔ اچھا ہی ہوا کہ پہلے قدم پر ٹھوکر لگ گئی۔ ٹھوکر کھایا انسان چوکنا رہتا ہے۔''

ظفر اچانک اُٹھا اور تیز قدموں سے باہر جانے لگا، تب سمینہ نے لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن وہ ہاتھ جھٹکتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

ظفر خاموش اور سمینہ مضطرب رہنے لگی۔ اماں اندیشوں کے گرداب میں ڈوبتی اُبھرتیں اور دادی کو بار بار سجدہ سہو کرنا پڑتا۔ گھر اب جائے سکون و عافیت نہ رہا۔ زیورات اور قدیم نمائشی چیزیں بکنے اور اماں پیسوں کو ہاتھ روک کر خرچ کرنے لگیں۔

ظفر زیادہ تر وقت باہر گزارنے لگا تھا۔ اکثر وہ صبح کا نکلا رات میں گھر لوٹتا۔ ایک صبح وہ ناشتہ کرتے ہوئے بولا، ''دُکان، کرائے پر دے دیا ہے۔ بوڑھی گائے کتنا دودھ دیتی؟...... کولھو کا بیل چلتا دن بھر ہے، لیکن پہنچتا کہیں نہیں۔ میں ابا کی طرح اپنی زندگی دوا دُکان میں نہیں کھپا سکتا۔ مجھے کچھ کرنا ہے۔ بڑا اور نیا۔ نوشتہ تقدیر کو تدبیر اور عمل سے بدلا بھی جا سکتا ہے۔ میں اِسے سچ کر کے دِکھاؤں گا......''

بیٹے کے افکار و گفتار پر اماں حیران رہ گئیں۔ اُنھیں لگا کہ پوچھ پوچھ کر ہر کام کرنے والا ظفر اچانک بڑا اور خود مختار ہو گیا۔ دادی اُس کی باتوں کو نظر انداز کر کے اُسے پچکارتے ہوئے بولیں، ''بیٹا! جوش اور عزم تمھارے پاس ہے، لیکن تجربہ نہیں۔ مشورے سے کام کرو گے تو پشیمانی نہیں ہوگی۔ دلدل میں پھنسا آدمی قوت سے نہیں، حکمت سے نکلتا ہے......''

ظفر اچانک ناشتہ چھوڑ کر اُٹھا اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

''دیکھا اماں!......'' اُنھوں نے فریادی لہجے میں کہا۔

''دُلہن! ابھی وہ بڑے نازک دور سے گزر رہا ہے۔ خدا خیر کرے۔ تم صبر کرو۔''

ظفر فوراً سے پیشتر بے رنگ زندگی میں قوسِ قزح کے تمام رنگوں کو بھر دینا چاہتا تھا۔ سمینہ اُس کی ہمدم و معاون بن گئی تھی۔ دونوں مل جل کر منصوبے بناتے۔

ایک صبح حویلی کے سامنے ایک کار آ کر لگی۔ آہٹ پا کر دادی اور اماں پردے کی اوٹ سے دیکھنے لگیں۔ ظفر کے ساتھ چند افراد اُترے اور دندناتے ہوئے احاطے میں پھیل

گئے۔ زمین کی پیمائش تا دیر ہوتی رہی۔ پھر سبھی لوٹ گئے۔

ظفر دیر رات گھر لوٹا۔ مضطرب دادی نے نرم لہجے میں پوچھا، ''بیٹا! یہ کون لوگ تھے؟''

ظفر خاموشی سے جوتے کے تسمے کھولتا رہا، تب اُنھوں نے دوسرا سوال داغا، ''زمین کی پیمائش کیوں کر رہے تھے؟''

دادی کی پشت پر کھڑی اماں بھی جب اُسے جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگیں، تب وہ ماں کے بازوؤں کو پکڑ کے اپنائیت سے بولا، ''اماں! آپ کے ہی خوابوں کو حقیقت کا روپ دے رہا ہوں۔ اِس غلیظ و مخدوش حویلی سے سب کو جلد ہی نجات مل جائے گی۔''

دادی معاملے کی تہہ تک پہنچ کر بھی تصدیق و تسلّی کر لینا چاہتی تھیں۔ اُنھوں نے سمینہ سے پوچھا، ''بیٹی! تم مجھے سمجھاؤ کہ ظفر کیا کہہ رہا ہے؟''

''دادی! ظفر نے ابّا کے نام پر ایک جوائنٹ کنسٹرکشن کمپنی قائم کیا ہے یعنی ساجھے میں بلڈر کا کام شروع کیا ہے۔ پہلا تعمیراتی کام اِسی حویلی سے شروع ہوگا۔ اکیس تاریخ تک ہم لوگ کرائے کے مکان میں شفٹ کر جائیں گے۔ پھر ایک تاریخ سے یہاں کام شروع ہو جائے گا۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولی، ''ابّا کبھی کبھی چپکے سے اماں کو 'چاند' کہہ کر پُکارا کرتے تھے، اِسی لئے ہم نے کمرشیل کمپلیکس کا نام 'مون پیلیس' رکھا ہے۔''

پھر وہ چہک کر بولی، ''دادی! ہمارے حصّے میں پانچ فلیٹس اور سات دُکانیں آئیں گی......''

اچانک اماں چیخ پڑیں، ''نہیں چاہئے مجھے فلیٹس اور دُکانیں۔ یہ حویلی ہی میرے لئے جنّت نظیر ہے۔ یہاں تمھارے باپ کی یادیں اور اُن کی چہیتی اَبابیلیں ہیں۔ مجھ سے جینے کا سہارا مت چھینو تم لوگ......''

وہ دَھم سے چوکی پر بیٹھ گئیں۔ پھر اُن کی آنکھوں سے درد و بے بسی کی نہریں رواں ہو گئیں۔

ظفر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دادی بولیں، ''بیٹا! اِس حویلی کے چپّے چپّے میں اجداد کی یادیں پیوست ہیں، اِس کے اِنہدام سے اُن کی روح تڑپ اُٹھے گی، پھل دار درخت

کٹ جائیں گے، اَبابیلیں بے گھر ہو جائیں گی، یہ حویلی محلے کی پہچان......''

ظفر اُبل پڑا۔ وہ قطع کلام کرتے ہوئے پُر آواز ہاتھ جوڑ کر بولا، ''دادی! پلیز! آپ لوگ جذباتی بلیک میل نہ کیجئے۔ تیر کمان سے نکل چکا ہے......''

پھر وہ ماں کے کندھوں کو پکڑ کے بولا، ''ایک بات کہوں اماں! میں نے اپنے باپ سے کوئی سوال نہیں کیا ہے۔ لیکن میرے بچے مجھ سے جواب طلب کریں گے کہ آپ نے ہمارے لئے کیا کیا؟ اور میں شرمسار ہونا نہیں چاہتا۔ میں وراثت میں خرد برد نہیں کر رہا ہوں بلکہ ایک مخدوش کھنڈر کو عالی شان کمرشیل کمپلیکس میں تبدیل کر رہا ہوں، جہاں مفلسی، محتاجی، نا اُمیدی اور خدشات کا داخلہ ممنوع ہوگا۔''

پھر وہ قدرے توقف کے بعد بولا، ''ایک بات اور......اب آپ لوگوں کو سمینہ باجی کی شادی کی فکر نہیں کرنی ہے۔ حالات بدلتے ہی لڑکے والوں کے آفرس کی جھڑی لگ جائے گی اور ردّ و قبول کا حق و اختیار ہمیں حاصل ہوگا۔ ڈرائنگ ہال میں ابا کا قدِ آدم اور حویلی کی بڑی سی تصویر آویزاں ہوگی۔ اب میں مصوّر کو تصویر میں حویلی کے اوپر اَبابیلوں کو بھی اُڑتے ہوئے دِکھانے کے لئے کہہ دوں گا، لیکن یہ سب تبھی ممکن ہے، جب ہم منصوبے میں کامیاب ہوں گے۔''

پھر وہ دادی کا ہاتھ پکڑ کے بولا، ''دادی! پرندوں کے لئے یہ دنیا وسیع تر ہے۔ اَبابیلیں کہیں اور ٹھکانہ تلاش کر لیں گی۔ میں اجداد کی یادوں اور پرندوں کے لئے اپنا فیصلہ بدل نہیں سکتا۔''

قدرے توقف کے بعد وہ بولا، ''میرے منصوبے میں وہ تمام جدید سہولیات مہیّا کرانا ہے، جن کا تصوّر بھی آپ لوگ نہیں کر سکتیں۔''

ظفر کے عزم و ارادے کو دیکھ کر دادی کی بے بس نگاہیں اماں پر مرکوز ہو گئیں۔

فضا بوجھل و سوگوار ہو گئی۔ اماں کو لگا کہ اُن کی قوتِ گویائی سلب ہو گئی ہے، تب وہ مُہاجر کی طرح نظریں دوڑانے لگیں۔ اُنھیں لگا کہ صدمے سے دو چار دادی کی جھرّیاں اچانک نمایاں ہو گئیں، در و دیوار خاموش تماشائی، اَبابیلیں دَم بخود، درخت کے پتّے کانپنے لگے ہیں اور بھائی کے شانے سے لگ کر کھڑی سمینہ بھی صفِ حریف میں ہے۔

اِسی عالمِ سکوت میں دادی نے اچانک اعلان کر دیا، ''تم بھی سن لو ظفر! میری ڈولی

اِسی حویلی میں اُتری تھی، یہیں سے میرا جنازہ نکلے لگا، تب ہی......''

پھر وہ تیز قدموں سے اپنے کمرے میں گئیں اور اندر سے دروازہ بند کرلیا۔

''ٹھیک ہے، جمی رہئے۔ جیتے جی سینے سے چمٹائے رکھئے کھنڈر حویلی کو...... میں ہی گھر چھوڑ دیتا ہوں۔ سمینہ با جی! اماں اور دادی کا خیال رکھئے گا۔ اللہ حافظ......''

پُر طیش ظفر دروازے کو لات مارتا ہوا اماں کے کمرے سے نکل گیا۔

ابا کی موت کے بعد ایک بار پھر حویلی میں ماتمی سناٹا چھا گیا۔

اماں اور سمینہ کی تمام تر کوششیں رائیگاں گئیں۔ دادی نے دروازہ نہیں کھولا۔ دیر رات تک ظفر گھر نہیں لوٹا، تب اماں کی تشویش سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

تیسرے پہر کے مہیب سناٹے میں اچانک دروازے کے کراہنے کی آواز اُبھری، تب اماں اور سمینہ کی نگاہیں وا ہوتے دروازے پر مرکوز ہو گئیں۔

چند گھنٹوں میں ہی دادی کا رنگ روپ بدل چکا تھا۔ کمر، کمان سی ہوگئی تھی۔ اُنھوں نے دروازے کا پلّہ پکڑ کے مخدوش لہجے میں پوچھا، ''دُلہن! ظفر آیا؟''

اُن کی بھرّائی آواز میں اعلانِ شکست بھی تھا۔

اماں جواب دیتیں، اِس سے قبل قہقہے لگاتا ہوا ظفر کمرے سے نکلا اور دادی کو آغوش میں لے کر بولا، ''دادی! مجھے تو اِسی لمحے کا انتظار تھا...... میں جانتا تھا کہ آپ کی محبت گھٹنے ٹیک دے گی......''

ظفر کی شاطرانہ چال پر اماں حیران رہ گئیں اور سمینہ چہرے پر پھیلتی مسکان کو روک نہیں پائی۔

ظفر کے سینے سے لگی دادی نے آنکھیں موند رکھی تھی۔ اُنھیں لگا کہ اَبابیلیں ہجرت کے لئے پَر تول رہی ہیں۔

●

(ماہنامہ 'شاعر'، بمبئی، 'افسانہ نمبر'، جلد ۸۶۔ شمارہ ۶۔۷۔۸ جون۔ جولائی۔ اگست ۲۰۱۵ء اور دو ماہی 'گلبن'، لکھنؤ، جلد۔۳۰، شمارہ۔۴، جولائی و اگست ۲۰۱۷ء میں شائع۔)

☆☆☆

اختراعی جملوں کا انتخاب : ڈاکٹر زاہد انور، اسسٹنٹ ڈائرکٹر، جھارکھنڈ سرکار، رانچی

- ''دوشیزہ کا کورادل طبق سا ہوتا ہے، جس سے چپک جائے اُسی کے وجود کا حصّہ بن جاتا ہے۔''
- ''مظلوموں کے آنسو رواں نہیں رہتے تو ڈل جھیل کب کا سوکھ چکا ہوتا۔''
- ''دھرتی اور ماں سینے میں جوالا رکھ کر بھی شانت رہتی ہے۔''
- ''عورت ساز کی طرح سازندے کے بس میں ہوتی ہے۔''
- ''جوانی سچ مچ سونامی سی ہوتی ہے، جس پر قابو پانا آسان نہیں۔''
- ''پریم کا بندھن کتنا عجیب ہوتا ہے۔ جتنا کسے اتنا ہی سکھ دیتا ہے۔''
- ''بچپن کا زمانہ ناکام عشق سا ہوتا ہے، جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔''
- ''عورت اور چڑیاں دونوں ایک سمان ہوتی ہیں۔ چھوؤ، چھیڑو تو بدحواس ہوجاتی۔''
- ''بھرم توڑ کر، کرچیوں پر ننگے پاؤں چلنے سے اپنا ہی تلوا لہولہان ہوگا۔''
- ''عورت، سمندر سی اتھاہ ہوتی اور سینے میں بہت کچھ چھپائے رکھتی ہے۔''
- ''جہاز ڈوبنے سے پہلے کوئی لائف بورڈ کا استعمال نہیں کرتا۔''
- ''مرد، گھوڑے اور بیل مرتے دَم تک ہمت نہیں ہارتے۔''
- ''دلدل میں پھنسا آدمی قوت سے نہیں، حکمت سے نکلتا ہے۔''
- ''سوچ بھی سایہ کی طرح وجود کا حصّہ ہے۔''
- ''یادیں، خزاں رسیدہ پتوں کی طرح بولتی اور اپنے وجود کا احساس دِلاتی ہیں۔''
- ''موٹی رقم چکا کر بھی کرائے کا گھر میزبان کے گھر جیسا ہوتا ہے، جس میں سکون و عافیت نہیں ملتی۔''
- ''پشتینی مکان غیر مزروعہ عام زمین سا ہوتا ہے، جس کے استعمال میں جتنا ہو، وہ اُسی کا۔''
- ''پہلے عشق اور پہلے بوسے کی طرح پہلی اولاد کے لمس کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔''
- ''لاتعلق سا دِکھائی دیتا باپ بے فکر انہیں ہوتا۔ وہ بیٹی کی شادی کرنا چاہتا ہے، سر کے بوجھ سے نجات پانا نہیں۔''
- ''دل بُرا ہو تو شفق سیاہی مائل لگتی، دھبے میں چاند نظر آتا اور کہیں پناہ نہیں ملتی ہے۔''
- ''ٹی وی اور انٹرنٹ نے بچوں سے بچپن اور اُن کی معصومیت چھین کر انھیں بالغ الذّہن بنا دیا ہے۔''
- ''ذہن، ٹچ اِسکرین موبائل سا ہوتا ہے، جو چاہے، اَن چاہے لمس سے متحرک ہوجاتا ہے۔''
- ''مُفلِسا ڈیرہ بے غلاف تکیے سا بے رونق ہوتا ہے، جہاں مہیب سنّاٹا کُہرے کی طرح چھایا رہتا ہے۔''
- ''موبائل اور انٹرنٹ نے ہماری مٹھی میں چاند ستاروں کے ساتھ انگارے بھی رکھ چھوڑے ہیں۔''

• ''دن بھر آگ اُگلنے والا سورج میدان چھوڑ چکا تھا۔ پرندے بسیرے کے لئے لوٹ رہے تھے۔ لوٹتے مویشیوں کے گلے میں بندھے گھنگھروؤں کی مدھم آواز میں گھنٹی کی آواز تیز تھی۔ ایک بچہ بھینس کی پیٹھ پر بیٹھا بانسری بجانے میں مگن تھا۔ ایک ہاتھی جھومتا ہوا جا رہا تھا۔ اُس کی پیٹھ پر ٹہنیاں لدی تھیں۔ مہاوت بار بار اُس کے کانوں پر لات مار رہا تھا۔ اشوک کے پیڑ پر گوریا ئیں شور مچا رہی تھیں۔ پہاڑوں کی ہریالی سیاہی مائل ہونے لگی تھی۔''

ایک جنگ اور

• ''مٹھو گردن گھما گھما کر سب کو دیکھتا اور باتوں کو سنتا رہتا۔ اُس کا جب جی چاہتا، تب وہ ''ببلو، ببلو''، ''نکی، نکی'' کی صدائیں بلند کرنے لگتا۔ بچے اپنا نام سن کر مسرور ہو جاتے۔ لیکن جب کبھی وہ ''دادی، دادی'' پکارنے لگتا، تب غزالہ ''چپ'' کہہ کے پنجرے کو نل کے نیچے رکھ کر ٹیپ کھول دیتی۔ پھر وہ تیز دھار کی مار سے بچنے کے لئے پھڑ پھڑاتا ہوا جائے پناہ ڈھونڈھنے لگتا، تب اُنھیں لگتا کہ مٹھو کے ساتھ وہ بھی سزا بھگت رہی ہیں۔''

گردشِ ایام

• ''وہ رات اماوس کی نہیں تھی۔ پونم کی شیتل کرنیں ماں کے آنچل کی طرح سکون بخش رہی تھیں۔ کھڑکی سے چاند اُسے اور وہ چاند کو دیکھ رہی تھی۔۔ نہ جانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی۔ جب اُس کی آنکھیں کھلی تو کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ چور سیندھ لگا کر ڈاکو بنا لوٹ رہا تھا۔ اُس کی گرفت گھڑیال جیسی تھی۔ مدافعتی حربے ناکارہ ثابت ہو رہے تھے۔ جہدِ مسلسل سے تھک ہار کر وہ سسکنے لگی تھی اور وہ فاتح حکمران کی طرح مقبوضہ جاگیر کے چپے چپے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُسی سمے گاؤں کے مندر میں سیتا ہرن کا پرسنگ سنایا جا رہا تھا۔''

صحرا میں بھٹکتی چڑیا

ABABEEL KI HIJRAT

(Collection Of Short Stories)

by

Dr. SHAHID JAMIL

● ''ابا سنجیدہ لب و لہجے میں بولے، ''بیٹا! دور کا ڈھول سُہانا ہوتا ہے۔ اپارٹمنٹ کے فلیٹس بیا کے گھونسلے جیسے ہوتے ہیں۔ مکین اپنے آپ میں مگن رہتے، مطلب سے مطلب رکھتے اور قیدیوں کی طرح نمبر سے پہچانے جاتے ہیں۔ اُن کی پوری توانائی اِسٹیٹس مینٹین کرنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ بات بات پر کہاسنی، میٹنگ، ضابطے اور فیصلے۔ پارکنگ میں ہر وقت کی تکرار۔ بچے کھیلنے کو ترسیں۔ کپڑے سکھانا مشکل۔ پردوں کا پارٹیشن۔ دال، سبزی میں چھورن پڑے تو سب چھینکیں۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھا مہمان، کانوں سے کچن کمرہ دیکھ لے۔ شرم و حیا طاق پر رکھ کر جینا پڑتا ہے۔ بالکنی میں بیٹھو تو پڑوسی گمان کے گھوڑے دوڑانے لگیں۔ کچن گارڈن کے شوقین گملوں میں ادرک، لہسن اور مرچ اُگاتے اور ڈرائنگ روم میں مصنوعی پھولوں کے گملے سجاتے ہیں۔ بیٹا! فلیٹ میں رہو گے تو قیدی پرندوں کی طرح سلاخوں سے دنیا دیکھو گے۔ اپنے گھر میں رہ کر بھی ہوٹل جیسا احساس ہوگا۔ رکھ رکھاؤ کے نام پر ہر ماہ کرایہ دار کی طرح موٹی رقم دینی پڑے گی...... یہ دور سے جتنے اچھے لگتے ہیں، اُتنے ہوتے نہیں۔ جس گھر میں آنگن اور چھت نہ ہو، کمرے سے آسمان نظر نہ آئے اور احاطے میں پیڑ پودے نہ ہوں، وہ گھر نہیں......''

ابابیل کی ہجرت

● ''اُس کے ذہن میں ولیمہ کا پورا منظر رقص کر گیا۔ اُسے یاد ہے، خالہ زاد بہن عالیہ نے اُس کے روبرو اُنھیں انگوٹھی پہنا کر ایک خوب صورت شہانہ جوڑا اُس کی گود میں رکھتے ہوئے کہا تھا، ''بھابھی! اِسے پہنا کر میں آپ کو سجاؤں گی۔ آپ قسمت والی ہیں۔ ڈھول باجے کے ساتھ شادی اور سہاگ کا جوڑا، ہر لڑکی کے نصیب میں نہیں......''

پھر وہ گفٹ پیکٹ کھول کر 'ڈانسنگ ڈال' کو شوکیس میں رکھتے ہوئے بولی تھی، ''بھابھی! میرا یہ گفٹ ہمیشہ آپ لوگوں کی نظروں کے سامنے رہے گا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں یاد آتی رہوں گی......''

پھر اُس نے 'ڈانسنگ ڈال' کو بجلی سے کَنکٹ کر دیا تھا۔ موسیقی کے ساتھ رنگ برنگی شعاعیں پھوٹنے لگیں اور خوش لباس خوبرو حسینہ روبرو کھڑے نوجوان کی بانھوں میں بانھیں ڈال کر آنکھیں مٹکاتی ہوئی ڈانس کرنے لگی تھی۔ عالیہ نے اُس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا، ''بھابھی! یہ میں نہیں، آپ ہیں۔''

اُس نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا تھا۔ عالیہ کے چہرے پر بھید بھری مسکان رقصاں تھی۔

عالیہ کا تحفہ اُس کے لیے سوہانِ روح بن گیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی نظر بار بار شوپیس پر جا ٹھہرتی۔ اُسے لگتا، عالیہ نے دانستہ ترتیب اُلٹ کر اشارے میں جتلا دیا تھا کہ ''یہ آپ نہیں، میں ہوں۔''

نجات

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA

www.ephbooks.com